اسماعیل میرٹھی

حیات اور خدمات

اس مقالے پر دلّی یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری عطا کی گئی

(ڈاکٹر) سیفی پریمی (خلیل الرحمن)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر:-

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

پہلی بار اکتوبر ۱۹۷۶ء قیمت: ۱۸/=

نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی

پیش لفظ

پروفیسر گوپی چند نارنگ

گھنگور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر، بوند ابھی نہیں پڑی تھی

آج سے تقریباً سو سوا سو سال پہلے اردو نظم کے آسمان کی حالت کچھ ایسی ہی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے پیاسی زمین پر بوندیں پڑنے لگیں، آزاد ۱۸۳۰ء میں، حالی ۱۸۳۷ء میں، اور اسماعیل ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے نئے ادبی اور سماجی شعور کے قائد سر سیّد احمد خاں کو اُن پر نہ صرف ذہنی بلکہ زمانی تقدّم بھی حاصل تھا، وہ ۱۸۱۷ء میں عالم وجود میں آئے تھے۔ شبلی جو عمر میں ان سب سے چھوٹے تھے، ۱۸۵۷ء میں اُس حشر خیز زمانے میں پیدا ہوئے جب سامراجیت اور آزادی میں معرکے کی ٹکّر ہوئی۔ اس سے اگرچہ آئندہ ایک صدی کے لیے محکومیت کی بنیاد مضبوط ہوگئی لیکن اس شکست کے بطن سے وہ آفتابِ تازہ بھی پیدا ہوا جس نے آگے چل کر ہر سماجی، ذہنی اور ادبی تحریک کو روشنی بھی دی، اور حرارت بھی۔ سن ستاون کے بعد گویا جدید اثرات اور نئی روشنی کی شاہراہ کھُل گئی تھی اردو میں جدید نظم کی ابتدا انھیں اثرات کا نتیجہ تھی۔ نئی نظم کے آغاز کے سلسلے میں شعر الہند اور گلِ رعنا میں "تاریخی دیانت داری اور واقعہ نگاری" کا جو "خون کیا گیا تھا"، وتاتریہ کیفی نے اس کی طرف توجہ دلائی اور محمد حسین آزاد کی سینہ فگاری "کی داد دیتے ہوئے پہلی بار انجمن پنجاب کے تاریخ ساز مشاعرہ (منعقدہ ۹ راپریل ۱۸۷۴ء) کی گمشدہ کڑیاں ملادیں۔ اس مشاعرے

کی روداد اُنھیں اخبار کوہ نور، لاہور کے ضمیمہ مورخہ ۱۶ر مئی ۱۸۷۴ء میں دستیاب ہوگئی تھی لیکن شاید اُنھیں اس کا احساس نہیں تھا کہ اس وقت پورا آسمان گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا اور کئی بوندیں آگے پیچھے پڑ رہی تھیں۔ آزاد کی اوّلیت زیادہ سے زیادہ اس سے بھی سات سال پہلے تک لے جائی جا سکتی ہے، جب اگست ۱۸۶۷ء کے ایک جلسے میں اُنھوں نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کے موضوع پر مفصّل تقریر کی تھی۔ جو بعد میں مجموعۂ نظم آزاد میں شائع ہوئی لیکن ۱۸۶۷ء میں جب آزاد ابھی اس سلسلے میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے غلام مولیٰ قلق میرٹھی کا پندرہ انگریزی نظموں کا ترجمہ "جواہر منظوم" کے نام سے دوسری بار شائع ہو چکا تھا۔ جو حسبِ ارشاد فیض بنیاد لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی" تیار ہوا تھا اور جس پر غالب نے بھی اصلاح دی تھی۔ اُس وقت

ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹی پتھر تمام ہیں گرم
ایک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمّت کے محیط کا شناور
بولا للکار کر کہ آؤ
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

قلق میرٹھ میں انسپکٹر کے دفتر میں ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ یہیں اسماعیل بھی ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء تک ان کے ساتھی رہے۔ دونوں غالب کے شاگرد تھے اور اس رشتہ سے استاد بھائی بھی تھے۔ اسماعیل کی اوّلین نظموں کا مجموعہ "ریزۂ جواہر" کے نام سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا، اس میں محمد حسین آزاد کے انجمن پنجاب والے مشاعرہ سے چھ برس پہلے کی ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء کی لکھی ہوئی

چھ نظمیں شامل ہیں۔ غرض جدید نظم کی بوندیں مشاعرۂ پنجاب سے کئی برس پہلے پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ جس کام کو تلق میرٹھی نے شروع کیا تھا، اسماعیل، آزاد، حالی اور اُن کے ساتھیوں نے اُسے آگے بڑھایا۔

پھر ایک کے بعد ایک ٹپکا
قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش ہونے لگی موسلا دھار
پائی پانی ہوا بیاباں
سیراب ہوئے چمن، خیاباں

("بارش کا پہلا قطرہ"، اسمٰعیل میرٹھی)

ادبی تحقیق کا کام پرانی رایوں کی صحت کرنا، نئے حقائق کو سامنے لانا، اور افراد و کارناموں کے مقام و مرتبہ کی تعیین میں مدد دینا ہے۔ خلیل الرحمٰن سیفی صاحب نے اس ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اسماعیل میرٹھی پر قلم اُٹھایا ہے مجھے مسرّت ہے کہ یہ مقالہ میری نگرانی میں دہلی یونیورسٹی میں لکھا گیا اور سچّی علمی لگن اور محنت سے لکھا گیا۔ خلیل الرحمٰن سیفی صاحب نے ماخذ کو کھنگالنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور کئی نئی معلومات پیش کی ہیں۔

سرسیّد تحریک نے عقلیت پسندی اور ذہنی بیداری کی جو فضا پیدا کی تھی۔ اُس میں بڑوں کی باتیں بڑوں کے لہجے میں کرنے والے تو بہت تھے۔ بچّوں کے لہجہ میں سامنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اردو میں درسی کتابوں کی تیاری کا کام ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۲۴ء کے بعد دلّی کالج نے اُسے مزید آگے بڑھایا۔ لیکن یہ کتابیں سماجی یا سائنسی علوم کے لیے تھیں یا پھر ادب کے مطالعہ کے لیے۔ اردو زبان پڑھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئی تھیں، وہ

ہندستانی طلبہ کے لیے نہیں، غیر ملکی عملا اور حکام کے لیے تھیں اردو بولنے والے بچوں کو اردو پڑھانے کی کتابوں پر توجہ نہیں تھی۔ شاید اس وقت مادری زبان کو زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کا تصور ہی نہیں تھا۔ زبان کے ضمن میں تقریباً ساری توجہ فارسی پر صرف ہوتی تھی۔ سن ستاون کے واقعات کے بعد جب فارسی کا رہا سہا زور بھی ٹوٹ گیا تو اردو کے قاعدوں اور ابتدائی کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اُدھر پنجاب میں کرنل ہالرائڈ کی حوصلہ افزائی سے محمد حسین آزاد نے کتابیں تیار کیں، تو اِدھر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں اسماعیل میرٹھی نے اردو کا پہلا قاعدہ اور پہلے سے پانچویں درجہ تک کی کتابیں تصنیف کیں۔ تب سے اب تک ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوخیز ذہنوں کی آبیاری میں ان کتابوں سے مدد ملی ہوگی۔ ہم نے ماضی کے ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور مستقبل کے افق پر نظریں گاڑنے والوں کو تو بجا طور پر یاد رکھا، لیکن اُس شخص کو بھول گئے جس نے زمین پر سیدھے سبھاؤ چلنا سکھایا اور حال اور صرف حال سے واسطہ رکھا ضرورت ہے کہ ایسے اہم شاعر اور مصنف کی خدمات کا دل کھول کر اعتراف کیا جائے اور اس کے خلاقانہ کارناموں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔

بچوں کا ادب اسماعیل میرٹھی کی ادبی شخصیت کا محض ایک رُخ ہے۔ ان کا شمار جدید نظم کے ہیئتی تجربوں کے بنیاد گزاروں میں بھی ہونا چاہیے وہ صرف "عجیب چڑیا"، "گھوڑا"، "اونٹ"، "ملمع کی انگوٹھی"، "محنت سے راحت" اور "ہر کام میں کمال اچھا ہے"، کے شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے "مناقشہ ہوا و آفتاب" "مکالمہ سیف و قلم"، "باد مراد"، "شفق"، "تاروں بھری رات"، اور "آثار سلف" جیسی نظمیں بھی لکھیں۔ آزاد اور حالی نے جدید نظم کے لیے زیادہ تر مثنوی اور مسدس کے فارم کو برتا تھا۔ اسماعیل نے ان کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس اور مثمن سے بھی کام لیا ——۔ اُنھوں نے بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں (چڑیا کے بچے) اور ایسی نظمیں بھی جن میں مروجہ بحروں کے اوزان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مصرع

ترتیب دیے گئے ہیں (تاروں بھری رات) بعد میں حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں اور ترقی پسند شاعروں نے آزاد نظم اور نظم معرّیٰ کے جو تجربے کیے، ان سے بہت پہلے عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی اور نادر کاکوروی، اور اُن سے بھی پہلے اسمٰعیل میرٹھی ان راہوں سے کانٹے نکال چکے تھے۔

خلیل الرحمٰن سیفی صاحب کا خیال ہے کہ اقبال کے "شاہین" کا سلسلہ اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے اسماعیل کی نظم "آثارِ سلف" کا حوالہ دیا ہے جس کے ایک بند میں اسلاف کی شجاعت اور اولوالعزمی کی بنا پر انھیں "شاہین" اور "شہباز" سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ سیفی صاحب نے اسمٰعیل کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری اور نثر نویسی کے بارے میں بھی متعدد نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ "تذکرۂ غوثیہ"، سید گل حسن شاہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب (۱۹۵۸ء) میں لکھا ہے کہ تذکرۂ غوثیہ کا اصل مسودہ اسمٰعیل میرٹھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا اُن کے خاندان میں محفوظ ہے جسے اُنھوں نے اسمٰعیل کے صاحبزادہ محمد اسلم سیفی صاحب کی وساطت سے دیکھا تھا۔ خلیل الرحمٰن سیفی صاحب نے بھی تذکرہ غوثیہ کے اسمٰعیل کی تصنیف ہونے کی تصدیق کی ہے۔ اس طرح اسمٰعیل کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایسے شخص کی نہیں جو محض بچّوں کے لیے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

لکھنے پر قانع رہا ہو، بلکہ جس کی خدمات اردو نظم کو جدید شاہراہ پر لگانے میں خاصی وقیع ہیں اور جس نے نثر کی بھی بیش بہا خدمت کی، اسماعیل کو صرف بچّوں کا شاعر سمجھنا ایسی ادبی اور تاریخی غلطی ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی تمام تحریروں کا خطاب بڑوں سے نہ سہی لیکن ان کے مقاصد کم اہم یا کم اعلیٰ نہیں تھے۔ ان کے حالات اور کمالات کا جامع مرقع تیار کرنے میں خلیل الرحمٰن سیفی صاحب نے جس دلسوزی اور محنت سے کام کیا ہے مجھے یقین ہے کہ اہلِ نظر اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

حرفِ خلوص

یہ تحقیقی مقالہ "اسماعیل میرٹھی - حیات اور خدمات" ۱۹۶۸ء میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے دہلی یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا اور ۱۹۶۹ء میں ڈگری عطا ہوئی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے کہ انھوں نے ابتداً مقالے کی نگرانی کا کرم فرمایا۔ موصوف اسی اثنا میں انگلینڈ تشریف لے گئے اور نگرانی کا فرض پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے پورا کیا۔ انھوں نے نہایت باقاعدگی، محنت، ژرف نگاہی اور دقّتِ نظر سے مقالے کے تمام ابواب کو دیکھا اور اب پُرمغز پیش لفظ رقم کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میں اُن کے خلوص، ہمدردی اور رشحاتِ قلم کے لیے سپاس گزار ہوں۔

سیفی پریمی
جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

فہرست

باب ششم

ضمیمہ

باب اوّل

حیات

(الف) حالاتِ زندگی

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کے حالاتِ زندگی "حیات وکلیات اسمٰعیل" سے لیے گئے ہیں۔ دوسرے اہل قلم نے بھی اپنے مضامین میں اسی کتاب سے مواد جمع کیا ہے اور مولانا کے حالاتِ زندگی کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی کتاب بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض واقعات کی صحت میرٹھ میں مقیم مولانا کے صاحبزادے خان بہادر محمد اسلم سیفی صاحب سے کی گئی ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نسبی علاقہ محمد بن ابوبکر صدیق خلیفۂ اوّل سے ملتا ہے مولانا قاضی حمید الدین خجندی ۱۵۲۵ء میں محمد ظہیر الدین بابر مغلِ اوّل کے ہمراہ ہندستان میں وارد ہوئے تھے۔ محمد ظہیر الدین بابر نے "بابر نامہ" میں خجند کا ذکر کیا ہے اور اس شہر کے دو بزرگوں کے نام لکھے ہیں (۱) خواجہ مصلحت (۲) خواجہ کمال الدین جو صاحبِ دیوان تھے۔ "بابر نامہ" میں صرف اتنا مذکور ہے

"شیخِ مصلحت اور خواجہ کمال خجند ہی کے رہنے والے تھے۔" (۱)

---

(۱) مترجم مرزا نصیر الدین گورگانی فانی۔ ص ۱، ترجمہ تزک باری اُردو معروفہ بابر نامہ ۱۹۲۴ء، مطبع محمڈن پرنٹنگ ورکس، دہلی

بابر نے اپنے والد عمر شیخ مرزا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

"حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے مُرید تھے"۔ (۱)

بابر نے اپنے پیر کے بارے میں درج کیا ہے

"میرے استاد و پیر مولانا قاضی"۔ (۲)

اور دوسرے مقام پر ذرا وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے

"خواجہ مولانا قاضی کا نام عبداللہ تھا اور عرف خواجہ مولانا تھا خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبیداللہ کے مُرید تھے۔ انھیں سے تربیت پائی تھی۔ مجھکو خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے"۔ (۳)

"بابرنامہ" میں مولانا قاضی کا ذکر تو ہے لیکن قاضی حمیدالدین خجندی کا ذکر کہیں نہیں! اور بابر کے ہمراہ جو جمعیت ہندستان میں وارد ہوئی اس میں بھی قاضی حمیدالدین کا نام نہیں ملتا لیکن مؤلفِ حیات وکلیات نے لکھا ہے کہ قاضی حمیدالدین منصب یک ہزاری سے معزّز وممتاز ہوئے اور ہندستان کی فتح کے بعد قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر کی چودہرات بطور انعام قاضی حمیدالدین کو عطا کی گئی۔ مولانا قاضی حمیدالدین کے صاحبزادے مولانا احمد نے قصبہ لاوڑ ضلع میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

اور درج ذیل خاندانی شجرہ پیش کیا ہے۔

مولانا قاضی حمیدالدین خجندی الصدّیقی متوطّن قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر

مولانا احمد

مولانا داؤد

---

(۱) مترجم مرزا نصیر الدین گورگانی فانی ص ۲، ترجمہ تزک بابری اردو معروفہ بابر نامہ سنہ ۱۹۲۴ء مطبع محمڈن پرنٹنگ ورکس، دہلی

(۲) ایضاً ص ۵۵

(۳) ایضاً ص ۵۶

مولانا یوسف

مولانا عبداللطیف

مولانا محمد شاکر

مولانا محمد افضل	مولانا محمد عاقل
مولانا غلام جمال الدین	مولانا محمد باقر
شیخ محمد اعظم	شیخ غلام احمد
شیخ محبوب بخش	شیخ پیر بخش
بی بی نعیم النسار	مولانا محمد اسمٰعیل

مولانا قاضی حمید الدین کے وارث ' مولانا احمد ' دولتِ بابری کے منصب دار تھے ۔ شیر شاہ کے زمانے میں عاملِ منظفر نگر اور مولانا احمد کے مابین مخالفت پیدا ہو گئی ۔ مولانا احمد اور ان کے فرزند مولانا داؤد (یہ بھی منصب دار تھے) مناصب سے مستعفی ہو کر قصبہ سیکری، ضلع مظفر نگر کی سکونت پر مجبور ہوئے بعد میں وہ قصبہ لاوڑ، ضلع میرٹھ میں مستقل طور پر رہنے لگے ۔

فرامینِ شاہی

اس خاندان کے لیے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے دو فرمان جاری کیے تھے ۔ ایک کی تاریخ ۷ شہر ذی الحجہ ۸۹۳ھ ہے ۔ اس میں مولانا داؤد کا نام شامل ہے مولانا داؤد' مولانا قاضی حمید الدین کے پوتے تھے ۔ مولانا یوسف اور مولانا بایزید' مولانا داؤد کے بیٹے تھے ۔ اس فرمان کے ذریعے پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) بیگھے زمین قصبہ لاوڑ' پرگنہ میرٹھ میں عطا ہوئی تھی ۔ دوسرے فرمان کے ذریعے چارسو (۴۰۰) بیگھے زمین موضع شمس پور، پٹہ لاوڑ میں دی گئی تھی ۔

میرٹھ میں قیام

مولانا محمد اسمٰعیل کے والد شیخ پیر بخش ۱۴ر جولائی ۱۸۳۸ء کو مستقل طور پر میرٹھ میں قیام پذیر ہوئے۔ مولانا اسمٰعیل کے دو بڑے بھائی شیخ غلام نبی اور مولانا عبدالحکیم جوش تھے۔ اوّل الذکر مولانا اسمٰعیل سے ۲۲ برس اور موخرالذکر چودہ برس بڑے تھے۔ مولانا اسمٰعیل کی ایک بہن بھی تھیں جو عمر میں سولہ برس بڑی تھیں۔ دونوں بڑے بھائی اور بڑی بہن قصبہ لاوڑ میں پیدا ہوئے تھے۔

مولانا اسمٰعیل کے والد کے خالو حافظ شیخ بینڈھو میرٹھ میں مقیم تھے صاحبِ جاداد تھے لیکن اولاد نہیں تھی۔ انھیں اپنے بھانجے سے بہت اُنسیت تھی چنانچہ انہی کے شدید اصرار پر مولانا اسمٰعیل کا خاندان لاوڑ سے میرٹھ منتقل ہوگیا۔ مولانا کے والد کا انتقال اٹھہتر برس کی عمر میں ۷ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو ہوا شیخ فخرالدین اصفہانی چشتی کے مزار کے جنوب میں دفن کیے گئے۔ مولانا کے والد سنجیدہ و متین، عزلت پسند، بردبار اور منکسرالمزاج تھے۔ امرار کی صحبت سے عمر بھر گریزاں رہے اور غیرمحسوس طور پر غریبوں کی مدد کرنا ان کا دستور تھا۔

والدہ کا خاندان

مولانا اسمٰعیل کی والدہ مخدوم شیخ فخرالدین اصفہانی چشتی کی اولاد میں تھیں یہ بزرگ ہندستان میں مغلِ اعظم اکبر کے زمانے میں آئے۔ ان کے فرزند شیخ شہاب الدین علی اصغر چشتی اصفہانی کو شہنشاہ جہانگیر نے فرمان کے ذریعے جاگیر عطا کی تھی۔

شیخ کی خانقاہ اور مولانا اسمٰعیل کی نشست گاہ کے مابین صرف ایک راستہ کا فصل ہے۔ درگاہ کے برابر جنوب کی جانب ایک مسجد ہے جو مخدوم صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا کی والدہ نے سو (۱۰۰) برس کی عمر پا کر ۱۹۰۱ء میں رحلت فرمائی ان پڑھ تھیں مگر نہایت ذہین، راسخ العقیدہ اور باشعور خاتون تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد تمام جاداد کا انتظام خود کرتی تھیں اور کُل آمدنی کو حسبِ مرضی و ضرورت اپنی اولاد پر صَرف کرتی تھیں۔ مولوی اسمٰعیل سے بہت اُنسیت تھی۔ مولانا بھی ان کے ارشادات کی تعمیل کو ثواب کا درجہ دیتے تھے۔ مولانا کے تنبیخ سے محترمہ نے ۱۸۷۹ء میں بیعت بھی کی تھی۔

ولادت

میرٹھ میں ایک محلّے کا نام "محلہ مشائخان" ہے۔ اس کو 'اندرکوٹ' اور بالائے قلعہ' بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن عوام 'پرانی تحصیل' کے نام سے پکارتے ہیں اس محلّے کا جدید نام "اسمٰعیل نگر" ہے جو بچوں کے پہلے مقبول و معروف شاعر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس محلّے میں مولوی صاحب کا مکان (نمبر ۲۶۷/۲) ہے۔ اب یہاں ایک بڑی شاندار حویلی بن گئی ہے لیکن پرانے زمانے میں یہ ایک کچّا مکان تھا۔ اس میں ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو ایک بچّے نے جنم لیا جس کا نام محمد اسمٰعیل رکھا گیا۔ مکان میں پرانی وضع کے دو کوٹھے تھے۔ ایک گھر کے افراد کے لیے اور دوسرا ساتھ لگا ہوا کوٹھا گانے بھینس وغیرہ کے لیے تھا۔

تعلیم و تربیت

دستور کے مطابق محمد اسمٰعیل کا پہلا مکتب گھر تھا۔ اپنے والد سے فارسی کا درس لیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن پاک شروع کیا اور پانچ مہینے میں ناظرہ پڑھ لیا فارسی کی اعلا تعلیم مرزا رحیم بیگ کی نگرانی میں ہوئی۔ مرزا جی نے پولیس کی ملازمت ترک کر کے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا تھا شعر بھی کہتے تھے کثرتِ مطالعہ کے باعث بینائی کھو بیٹھے تھے۔ یہ وہی مرزا رحیم بیگ ہیں جنھوں نے رسالہ "ساطع برہان" مرزا غالب کی "قاطع برہان" کے جواب میں تصنیف کیا تھا۔ محمد اسمٰعیل اس وقت

متعلّم تھے اور مختلف لغات سے اُستاد کو معانی سُنانے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کرتے تھے۔

مولوی محمد اسمٰعیل نے اپنے بیٹے محمد اسلم سیفی کو بتایا تھا کہ ایک زمانے میں قلق میرٹھی نے مرزا رحیم بیگ کے کلام پر ایک نظم میں نکتہ چینی کی تھی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے نظم میں ہی قلق کے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ قلق سے مولانا کی دوستی تھی مگر انھوں نے اُستاد کا ساتھ دینا پسند کیا اور اس موقع پر مرزا رحیم بیگ نے خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی محمد اسمٰعیل نے گلستاں و بوستاں، شاہنامہ اور دیگر ضروری کتبِ فارسی ختم کرلی تھیں۔

نارمل اسکول میرٹھ میں داخلہ

فارسی کی تعلیم کے بعد معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ میرٹھ میں نارمل اسکول قائم ہوچکا تھا۔ ایم کینسن ہیڈ ماسٹر تھے۔ محمد اسمٰعیل اپنے والد کے ارشاد پر نارمل اسکول میں داخل ہوئے اور امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ نارمل اسکول میں منشی ایسری پرشاد علمِ ہندسہ کے استاد تھے۔ مولانا کو اس مضمون سے قدرتی لگاؤ تھا۔ اپنے شفیق استاد سے فزیکل سائنس اور علمِ ہیئت، دلچسپی کی بنا پر نصابِ تعلیم کے علاوہ سیکھ لیے اور علمِ ہندسہ میں بھی تکمیل بہم پہنچائی۔

رُڑکی کالج میں داخلہ

نارمل اسکول کی تعلیم مکمّل کرنے کے بعد اوور سیری کی تعلیم پانے کی غرض سے رُڑکی کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا۔ داخلے کے امتحان میں شرکت کی اور علمِ ہندسہ میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ داخلہ مکمل ہوگیا اور تدریس کا آغاز ہوا۔ لیکن مولانا کو گھر کی یاد بُری طرح ستاتی تھی نیز رُڑکی میں اجنبی طلبہ کے ساتھ نباہ بھی نہ کرسکے اس لیے کچھ عرصے کے بعد کالج کو خیرباد کہا اور وطن واپس آگئے۔

ملازمت

اس زمانے میں معلم کا پیشہ موجبِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ حکومت اور سماج دونوں میں استاد کی حیثیت مسلّم تھی اور اس کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ محمد اسمٰعیل نے اس کو اپنی منزل قرار دیا۔ سولہ برس کی عمر میں ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کو انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ کے محکمہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا اور ۱۸۶۷ء تک وہ مستقل طور پر میرٹھ میں رہے۔ اس کے بعد ان کے کام کی نوعیت بدل گئی اور ڈسٹرکٹ اسکول سہارنپور میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ۱۸۷۰ء تک خدمات انجام دیں یہاں انھیں عربی پر توجہ کرنے کا موقع ملا۔ کچھ مدت بعد انھیں انسپکٹر مدارس میرٹھ کے دفتر میں واپس بھیجا گیا اور ۱۸۸۸ء تک وہ اس جگہ کام کرتے رہے اُسی سال میرٹھ اور جھانسی کے نارمل اسکول توڑ دیے گئے تھے اور ایک سنٹرل نارمل اسکول آگرے میں قائم کیا گیا تھا۔ جولائی ۱۸۸۸ء میں مولانا کا تقرر بحیثیت استادِ فارسی سینٹرل نارمل اسکول آگرہ میں ہو گیا اور ۱۸۹۹ء تک وہاں یہ خدمت انجام دیتے رہے یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو پنشن پا کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور باقی زندگی اپنے وطن میرٹھ میں بسر کی۔

"مولانا کبھی اپنی جانب سے ترقیِ مدارج کے لیے کوشاں نہیں ہوتے تھے۔ البتہ ایک روز اسکول سے واپسی پر ارشاد فرمایا کہ آج معلوم نہیں کس طرح یہ حکم موصول ہوا ہے کہ ضلع بجنور کی ڈپٹی انسپکٹری مل سکتی ہے اگر ہم وہاں جانا منظور کریں ہم نے تو انکار لکھ دیا۔ اس عہدے پر اکثر سفر میں رہنا پڑتا ہے اور یہ ہم کو پسند نہیں۔" (۱)

شادی

۱۸۶۲ء میں مولانا کا عقد بی بی نعیم النسا بنتِ شیخ محبوب بخش سے ہوا یہ نیک سیرت

---

(۱) محمد اسلم سیفی۔ حیات و کلیات اسمٰعیل۔ مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس ۱۹۳۹ء ص ۸۸

خاتون بھی مولانا قاضی حمیدالدین خجندی کی اولاد میں تھیں۔ نعیم النساء کے دادا شیخ محمد اعظم کا شمار اہل اللہ میں ہوتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھیں مگر سیرت کے اوصاف ان میں جلوہ گر تھے اس لیے ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی صبح کو چار بجے اٹھنے کے عادی تھے۔ ان کی بیگم مولانا کے اٹھنے سے پہلے اپنے ہاتھ سے حقہ بھر کر تیار رکھتی تھیں۔ مکان میں جھاڑو لگاتی تھیں مولانا کے کاغذات جھاڑو لگانے کے وقت منتشر ہو جاتے تھے مگر انھوں نے کبھی اپنی اہلیہ سے اس کی شکایت کی نہ جز بز ہوئے۔ ان کے صاحبزادے محمد اسلم سیفی کہتے ہیں کہ وہ صفحات کو ترتیب دیکر مسودات کو قاعدے کے مطابق رکھ دیا کرتے تھے۔ مولانا کی اہلیہ کا انتقال یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو آگرے میں ہوا۔

اولاد

مولانا کی شادی اٹھارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔ شادی کے دو سال بعد یعنی ۱۸۶۴ء میں پہلی لڑکی کی ولادت ہوئی۔ قیوم النساء نام رکھا گیا۔ ان کی شادی عزیز داری میں ہوئی ۵ رجب المرجب ۱۳۵۴ ہجری مطابق ۱۹۳۵ء بمقام ترسان ضلع علی گڑھ میں انتقال کیا۔

۱۸۶۶ء میں بڑے بیٹے محمد محمود احمد کا لاوڑ میں جنم ہوا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ عنایت اللہ بی۔ اے ان کے کلاس فیلو تھے۔ محمد محمود احمد سیفی کا انتقال ستر (۷۰) برس کی عمر میں جنوری ۱۹۳۷ء کو میرٹھ میں ہوا۔ مولوی محمد اسمٰعیل کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔

مولانا کے دوسرے فرزند محمد حامد ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ میرٹھ سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے سینٹ جانس کالج آگرے میں ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ کالج چھوڑ کر ملازمت شروع کی۔ دق اور سل کا مرض لاحق ہوگیا تھا چھبیس ۲۶ سال کی عمر میں ۲۱ ر اکتوبر ۱۸۹۵ء کو میرٹھ میں وفات پائی۔ لاولد تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کو اپنے لخت جگر کی وفات کا سخت قلق رہا۔

"حیات وکلیات اسمٰعیل" میں صفحہ ۱۸ پر جو مرثیہ درج ہے وہ انھیں کی یاد میں ہے۔

'حامد کہاں کہ دوڑ کے جاؤں خبر کو میں'

دوسری بیٹی اُمتہ الاعلیٰ کی ولادت ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ سیّد اقبال سے ان کی شادی ہوئی جو مولانا کے بہنوئی سیّد ظفریاب علی کے بھتیجے تھے۔ وہ نہایت ہونہار، ذہین، شایستہ، تعلیم یافتہ، خوشرو اور خوش وضع تھے۔ اچانک ۱۸۹۳ء میں بعارضۂ اسہال ۲۱ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس صدمے سے مولانا کا دل ٹوٹ گیا۔ 'حیات و کلیات اسمٰعیل' میں صفحہ ۱۵ پر جو مرثیہ درج ہے وہ انھیں کی یاد میں ہے۔

'شب کہ تھی تپ کے سبب سے مجھے آشفتہ سری'

مولانا کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد اسلم سیفی ۷/ اگست ۱۸۸۰ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ ان کی شادی سیّد مظفر علی کی دختر سے ہوئی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں انگلستان اور یورپ کا سفر کیا۔ انھوں نے دہلی میں "اسلم اینڈ کمپنی" کے نام سے درآمد اور برآمد کا کام شروع کیا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں مولانا اسمٰعیل خود نگرانی کے لیے دہلی میں قیام فرماتے تھے۔

سفر (۱) رُڑکی کا سفر۔ طالب علمی کے زمانے میں غالباً پہلا سفر پندرہ برس کی عمر میں اس وقت کیا۔ جب رُڑکی تشریف لے گئے۔

(۲) ملازمت کے سلسلے میں ۱۸۶۷ء میں سہارنپور تشریف لے گئے ڈسٹرکٹ اسکول میں مدرسِ فارسی کی حیثیت سے تقررِ عمل میں آیا۔ ۱۸۷۰ء تک سہارنپور میں رہے

(۳) دہلی میں آمد۔ 'مشاعرۂ پنجاب' کی دھوم دھام کے زمانے میں مولانا ایک بار دہلی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں منشی ذکاءاللہ دہلوی سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ دتی لائبریری دیکھنے بھی گئے۔ واپسی میں دونوں حضرات جامع مسجد پہنچے۔ اس موقع پر راستے میں مولانا محمد حسین آزاد سے ملاقات ہوگئی۔ منشی ذکاءاللہ نے تعارف کرایا مولانا محمد حسین آزاد نے مولانا میرٹھی سے انجمنِ لاہور کے مشاعرے کے لیے نظموں کی فرمایش کی۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اس مشاعرے کے لیے تین مثنویاں لکھیں (۱)

مکھیاں (۲) چاند (۳) آبِ زلال۔ مثنوی آبِ زلال ان سب میں اچھی ہے۔

(۴) پانی پت کا سفر: ۱۸۷۰ء میں مولانا نے سید غوث علی شاہ سے بیعت کی تربیتِ باطنی اور تزکیۂ نفس کی خاطر پانی پت حاضر ہوئے۔ پنشن پانے کے بعد مولانا نے باقی زندگی میرٹھ میں بسر کی۔ وہ پابندی کے ساتھ ہر برس اپنے پیر و مرشد کے عرس میں شرکت کے لیے پانی پت تشریف لے جاتے تھے۔ آخر میں کئی سال تک حاضری نہ ہو سکی۔ وفات سے دو برس قبل یعنی 1915ء میں آخری بار پانی پت میں حاضر ہوئے۔

(۵) موسم گرما میں مسوری پہاڑ پر قیام ۱۸۷۰ء میں مولانا دفتر انسپکٹر مدارس قسمت میرٹھ میں کلرک تھے۔ عملے کی بعض ضرورتوں کے تحت موسمِ گرما میں مسوری جانے اور وہاں قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں پہاڑوں کے سکوت نے طبیعت میں ایک خاص کیفیت پیدا کی۔ شاداب گھاٹیوں، پھولوں کے تختوں، چشموں کی روانی اور آبشاروں کے گیتوں نے دل پر خاص اثر کیا اور انھوں نے اپنی مشہور نظم "کوہ ہمالہ" لکھی۔

(۶) لکھنؤ میں قیام: مولانا کے بیٹے محمد محمود سیفی تجارتی کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ میں قیام کرتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا بھی لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں دو ماہ تک رہے۔ لکھنؤ میں مولانا کی ملاقات رائے بہادر منشی نولکشور کے صاحبزادے رائے بہادر منشی پراگ نرائن سے ہوئی۔ مولانا نے ان کو نہایت شریف النفس، کریم الاخلاق متواضع اور حوصلہ مند پایا۔

(۷) علی گڑھ میں وُرود: مولانا کو سر سید احمد خان کی شخصیت اور علی گڑھ کالج سے بے حد عقیدت تھی۔ مالی اعانت کرتے تھے، انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سے بھی وابستگی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں جب "ٹیچرز کانفرنس" علی گڑھ میں منعقد ہوئی اور سر عبدالقادر اس کے صدر اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکریٹری مقرر ہوئے تو مولانا کو ایک تجربہ کار ٹیچر کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا علی گڑھ گئے اور اس موقع پر ایک قطعہ بھی تصنیف کیا۔

(۸) الہ آباد کا سفر: حکومت کی جانب سے ایک کمیٹی اردو اور ہندی ریڈروں کی عبارت کی درستی کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ پنڈت راما شنکر مشر کلکٹر (پینشنر) کمیٹی کے صدر تھے۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور پنڈت منوہر ناتھ زتشی اراکین میں شامل تھے۔ مارچ، اپریل ۱۹۱۱ء میں اس کمیٹی کے جلسے میں شریک ہونے کے لیے مولانا الہ آباد تشریف لے گئے اور بیرسٹر ظہور احمد کی کوٹھی اڈمانس ٹن روڈ میں قیام فرمایا۔

سر علی امام کے ایک عزیز عبدالودود میور سینٹرل کالج الہ آباد میں۔ ایل، این، بی کلاس کے متعلم تھے۔ انھیں مولانا کے الہ آباد میں تشریف فرما ہونے کا علم ہوا تو ملاقات کے لیے پہنچے اور گزارش کی کہ مولانا، طلبہ کو نظم میں خطاب کریں۔ مولانا نے پہلے تو عذر کیا مگر بعد میں ان کے بے حد اصرار پر انھوں نے ایک قصیدہ ''خدائی لشکر'' پینتالیس (۴۵) اشعار پر مشتمل کہا جسے بہت پسند کیا گیا۔

الہ آباد میں قیام کے دوران سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے دولت کدے پر مولانا تشریف لے گئے۔ نہایت تپاک اور محبت کی فضا میں ملاقات ہوئی۔ مولانا کے صاحبزادے محمد اسلم سیفی نے مولانا کی ایک غزل اور رُباعی حضرت اکبر الہٰ آبادی کو سُنائی انھوں نے بہت داد دی۔ خاص طور پر مطلع پسند کیا اور فرمایا کہ پہلے مصرعے میں پورا شعر ہے مطلع درج ذیل ہے۔

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں — ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

ملاقات کے بعد مولانا نے ایک رباعی کہی جس میں کلامِ اکبر کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

حقا کہ بلند ہے مقامِ اکبر — توقیعِ سخن ہے اب بنامِ اکبر
دیوان ہے لطائف و حِکَم سے معمور — اکبر کا کلام ہے کلامِ اکبر

---

(۹) آگرہ میں قیام: جولائی ۱۸۸۸ء میں ملازمت کے سلسلے میں آگرہ پہنچے اور وہاں ۱۸۹۹ء تک قیام پذیر رہے۔

دائرۂ احباب

مولانا محمد اسمعیل میرٹھی کے سب سے گہرے اور مخلص دوست منشی نجم الدین تھے دونوں نے "یک جان و دو قالب" کی مثل کو سچائی کے ساتھ زندگی میں ثابت کر دیا تھا ان کے والد کا نام قمر الدین تھا مولد و مسکن خیرآباد (اودھ) اور وطن ثانی دہلی تھا۔ نواحِ دہلی کے ایک خاندان میں شادی ہوئی۔ اس خاندان کی بود و باش قصبہ کاٹھ، باغپت اور دہلی میں تھی۔ نجم الدین کی پیدائش ۱۲۵۲ھ میں دہلی کے محلے کشمیری دروازہ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ نواب شمس الدین خاں کو جس روز پھانسی دی گئی اسی روز موصوف کی ولادت ہوئی ابتدائی تعلیم مولانا امام بخش صہبائی سے حاصل کی پھر دلی کالج میں داخلہ لیا اور کالج کے ممتاز طلبہ میں شمار ہوئے۔ مولوی نذیر احمد، منشی ذکاءاللہ، ماسٹر رام چندر اور مولوی نصیر الدین کے معاصر و ہم سبق تھے۔ نجم الدین کے والد کا انتقال ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ پچاس ہزار روپے کا سرمایہ چھوڑا تھا۔ جو ۱۸۵۷ء کے انتشار میں تاراج ہو گیا اس وقت نجم الدین کی عمر اُنیس (۱۹) سال کی تھی۔ فتح دہلی سے چند ہفتے پہلے شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور پانی پت کی راہ سے پیدل سفر کر کے سہارنپور پہنچے وہاں سے دہرہ دون اور پھر مسوری پہنچ گئے ریڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈائرکٹر ان کے والد کے دوست تھے۔ انھوں نے اپنے دفتر میں کام سیکھنے کی اجازت دے دی۔ اس دفتر کے میر منشی مولوی کریم بخش تھے۔ جو دلی کالج میں نجم الدین کے استادِ ریاضی رہ چکے تھے انھوں نے بہت مہربانی کا برتاؤ کیا۔ ۱۸۵۸ء میں ڈائرکٹر تعلیم نے ان کو بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کر دیا۔ وہاں دو سال تک کام کیا۔ سیّد احمد خاں اور میر تراب علی اکبرآبادی سرکاری کام کی تکمیل میں ان کی رہنمائی کرتے رہے ۱۸۶۰ء میں اسی عہدے پر میرٹھ کو تبادلہ ہوا۔ یہاں محلہ مشائخان میں رہنے لگے ان کا مکان مولانا محمد اسمعیل کے مکان سے تقریباً ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر واقع تھا۔ رفتہ رفتہ مولانا سے تعلقات اُستوار ہوئے اور اتنا خلوص پیدا ہو گیا کہ ڈپٹی صاحب کا انتقال ۱۹۰۷ء میں مولانا کی

گود میں ہوا۔ حیاتِ اسمٰعیل کے مصنف نے لکھا ہے

"ڈپٹی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسمٰعیل کا انتقال میرے سامنے ہوا تو میں اس کے بغیر ایک گھڑی زندہ نہ رہ سکوں گا۔" (۱)

ڈپٹی صاحب مولانا کے پیر بھائی بھی تھے۔ انھوں نے "نجم الاخبار" جاری کیا تھا۔ مولانا اس کی قلمی اعانت کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اخبار مرتب کرنے میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

(۲) منشی تفضل حسین، ان کا تعلق سررشتۂ تعلیم سے تھا۔

(۳) مولوی محمد حیات مالک ضیائی پریس۔

(۴) قلق میرٹھی۔ یہ اور مولانا ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ ٹی۔ جے۔ کین انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ نے انگریزی زبان کی اخلاقی نظموں کا ترجمہ قلق میرٹھی سے کرایا تھا، مولانا کو اس ترجمہ کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

(۵) ڈاکٹر رحیم اللہ شاہ جہانپوری۔ میرٹھ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مولانا کے معالج تھے اور دونوں میں گھر سے دوستانہ تعلقات رہے۔ انھوں نے اپنے تین بیٹوں کو بغرضِ تربیت مولانا کی خدمت میں آگرے بھیجا تھا جو کئی سال مولانا کے پاس رہے۔ ان میں سب سے چھوٹے حیدر حسن بی، اے۔ بیرسٹر، ایٹ لا، بعد میں انسپکٹر مدارس حلقۂ میرٹھ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے چھ بیٹے تھے اور سب کو مولانا کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔

(۶) مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی۔ یہ سر سید احمد خاں کے لٹریری سکریٹری تھے مولانا سلیم کے والد حاجی سید فرید الدین کا تعلق خانقاہ غوثیہ سے بہت قریب کا تھا وہ سید غوث علی شاہ کے خدام میں شامل تھے اور مولانا میرٹھی کا شمار سید غوث علی شاہ کے خاص مریدوں میں تھا اس واسطے سے مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا سلیم میں قربت کا رشتہ پیدا ہوگیا تھا پھر ادبی ذوق بھی ایک دوسرے کے لیے ذہنی قربت کا باعث تھا۔ مولانا سلیم ہی نے اپنے رسالہ "معارف" میں مولانا میرٹھی کی نظمیں

---

(۱) ص۔ ۲۱

"شمع ہستی" اور "سیف وقلم"، ایم، آئی کے نام سے سب سے پہلے شائع کی تھیں۔

(۷) شمس العلما منشی ذکاء اللہ۔ مولانا میرٹھی کی نظمیں "نجم الاخبار" میں چھپا کرتی تھیں مگر ان پر نام نہیں درج ہوتا تھا۔ ان نظموں میں "صبح کی آمد" اور "طمع کی انگوٹھی" کو منشی ذکاء اللہ نے بہت پسند کیا اور ڈپٹی نجم الدین کو لکھا کہ اس گمنام شاعر کا نام ظاہر کریں۔ ڈپٹی نجم الدین نے شمس العلما کو میرٹھ آنے کی دعوت دی۔ موسم گرما کی تعطیل میں منشی ذکاء اللہ میرٹھ پہنچے اور ڈپٹی نجم الدین کے یہاں قیام فرمایا یہاں گمنام شاعر یعنی مولانا محمد اسمٰعیل سے تعارف ہوا اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس وقت سے آخر زندگی تک دونوں میں مخلصانہ تعلقات قائم رہے۔ منشی ذکاء اللہ مولانا کی نظم گوئی کے قدردان تھے اور اپنے ریڈروں میں ان کی نظموں کو شامل کیا کرتے تھے چنانچہ "بچہ اور ماں"۔ "ماں اور بچہ"۔ "ایک لڑکا اور بیر" "میرا خدا میرے ساتھ ہے"۔ "پن چکی" "صبح کی آمد"۔ "ہماری گائے" "اب آرام کرو"، "تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے"، "کوشش کیے جاؤ"، "ایک پودا اور گھاس"، "دال کی فریاد"، "چھوٹی چیونٹی"، "خدا کی قدرت"، "سچ اور جھوٹ"، "ماں کی ممتا"، یہ تمام نظمیں منشی ذکاء اللہ کے مرتبہ ریڈروں میں شامل کی گئیں۔

(۸) مولوی محمد حسین آزاد۔ ان سے بھی مولانا اسمٰعیل کی شاعرانہ رسم و راہ رہی۔

(۹) مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا کو ظفر علی خاں کی طرز انشا بے حد پسند تھی ظفر علی خاں کے "دکن ریویو" اور "پنجاب ریویو" دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے اور "روزنامہ زمیندار" کے تو شیدائی تھے ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے دوران جب اخبار زمیندار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی اور اخبار بند ہوگیا تو مولانا کو افسوس ہوا انھوں نے ایک قطعہ اس سلسلہ میں کہا تھا۔

قطعہ

طبع کے آلات کی ضبطی کے ساتھ — ہوگیا اخبار زمیندار بند

چھٹنا تھا اس چاٹ کا مشکل مگر
اب ہے کئی ہفتے سے ناچار بند
صدق کا اور کذب کا وہ احتمال
بے خبری میں ہوا یک بار بند
روگ ہے اخبار بھی افیون بھی
کردے کہیں دونوں کو سرکار بند
چاہیے اصطبل میں اپنے رہے
خامۂ چالاک کا رہوار بند
کاسۂ سر میں رہے پیکِ خیال
جیل میں جس طرح گنہگار بند
پھر تو بڑے چین سے گزرے اگر
سارے زمانے کے ہوں اخبار بند
کوئی ایڈیٹر کا نہ پیشہ کرے
نامہ نگاری کا ہو بازار بند
بعض کی یہ رائے ہے بایں ہمہ
حضرت ریوٹر کے نہ ہوں تار بند

(۱۰) خواجہ حسن نظامی۔ مولانا کے خواجہ حسن نظامی سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے ان کے جرائد میں مولانا کی نظمیں چھپتی تھیں۔ بعض نظمیں خواجہ حسن نظامی کی فرمایش پر بھی لکھی گئیں۔ ایک عیدی اُنھیں کی فرمایش پر تصنیف کی تھی جو ناتمام رہ گئی۔ درجِ ذیل ہے

اے مسلمانو! مبارک ہو تمھیں عید الضحیٰ
دین و ملت سے رکھے اللہ دائم شاد کام
ہو عطا توفیق تم کو کسبِ علم و فضل کی
قوم کے اعزاز کا پرچم اُڑے بالائے بام
قابلیت ہر صنف میں جلد تر پیدا کرو
تا معیشت کے مدارج تم کو حاصل ہوں تمام
ہاں تجارت اور صناعت میں رہو تم پیش پیش
جیسے تھے اسلاف بحر و بر میں دنیا کے امام
ہے خبر تم کو کبھی یورپ کا تھا اُستاد کون
آج تک مغرب میں ابنِ رُشد کا روشن ہے نام
تم نے چمکایا تھا برفستان میں خورشیدِ علم
ہیں تمھارے فیض کے ممنون اب تک خاص و عام
کیا طبیعی، کیا ریاضی، کیا ادب، کیا فلسفہ
تھی تمھارے ہاتھ میں کشتیٔ حکمت کی زمام
بیشتر تو میں کہ جن میں تھی ابھی وحشت کی بُو
ان کو سکھلایا سیاست اور تمدن کا نظام
شرک اور توحید کی تفصیل کر دی صاف صاف
جس سے دنیا میں ہوئی تمیزِ انوار و ظلام
رود بارِ غرب سے تا ساحلِ دریائے چین
تھا تمھارے عزمِ سیاحی کے آگے نیم گام

(۱۱) مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند۔ ایک زمانے میں مولانا محمد قاسم کا تعلق مطبع ہاشمی میرٹھ سے تھا۔ یہ مطبع محلہ اندر کوٹ میں واقع تھا اور مولانا کے گھر کے

بہت قریب تھا۔ ڈپٹی نجم الدین کے یہاں مولانا محمد قاسم تشریف لاتے تھے اور وہیں مولانا میرٹھی سے تعلقات پیدا ہوئے۔

(۱۲) مولانا عبدالرب دہلوی۔ یہ اپنے زمانے کے مایۂ ناز اور بے نظیر مقرر اور واعظ تھے۔ مولانا کے ان سے بھی اچھے تعلقات تھے۔

(۱۳) ڈپٹی محمد صدیق رئیس میرٹھ۔ یہ میرٹھ کے معزز رئیس تھے۔ ابتدا میں حکومت انگریزی کے ملازم تھے بعد کو مملکتِ نظام سے وابستہ ہو گئے۔ حیدرآباد میں ہی انتقال فرمایا۔ مولانا میرٹھی سے ان کے تعلقات گہرے اور دوستانہ تھے۔ حیدرآباد سے ڈپٹی محمد صدیق نے ایک مرتبہ مولانا میرٹھی سے فرمایش کی تھی کہ وہ عربی خطبات کا ترجمہ اردو نظم میں کر دیں چنانچہ مولانا میرٹھی نے اپنے دوست کی فرمایش پر دو خطبوں کا ترجمہ کیا۔ یہ دونوں خطبے 'کلیاتِ اسمٰعیل' کے پہلے اڈیشن میں صفحہ ۹ پر درج ہیں۔

(۱۴) مولوی کریم بخش دہلوی۔ دلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ تعزیراتِ ہند کا ترجمہ اردو زبان میں انھیں کا کیا ہوا ہے۔ ڈپٹی نجم الدین کے شفیق استادوں میں تھے۔ میرٹھ تشریف لاتے تھے تو ان کے یہاں قیام فرماتے تھے۔ مولانا میرٹھی سے ملاقات اور تعلقات کی استواری وہیں پیدا ہوئی۔ مولوی کریم بخش نے مولانا سے "مناجات" لکھنے کی فرمایش کی تھی یہ مناجات 'کلیاتِ اسمٰعیل' میں شامل ہے۔

(۱۵) خان بہادر ڈاکٹر مولوی بشیر الدین زبیری بانیٔ اسلامیہ کالج اٹاوہ سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ ان کے ہفتہ وار اخبار "البشیر" سے زندگی بھر دلچسپی رہی۔

پیر بھائی

پیر بھائیوں میں مندرجہ ذیل حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

ڈپٹی نجم الدین، مولوی گل حسن شاہ، قاضی فتح محمد لدھیانوی، نواب محمد ابراہیم عرف نواب پہلوان دہلوی، شیخ احسان اللہ جھجر، حافظ ظہور محمد انصاری مدنی،

میر غالب حسین بریلوی۔ قاضی فتح محمد جب کبھی میرٹھ تشریف لاتے تھے تو نظم کی فرمائش ضرور کرتے تھے۔ بعض نظمیں "نذرانۂ پیرجی" کے نام سے کلیات میں شامل ہیں۔ یہ نظمیں ان کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں۔

مولانا کے شاگرد

مولانا کی پوری زندگی درس و تدریس میں گزری ان سے فیضیاب ہونے والے افراد کی فہرس ایک کتاب کی ضخامت اختیار کرسکتی ہے یہاں صرف چند شاگردوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) ڈاکٹر وزیر سنگھ۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے ضلع اسکول میرٹھ میں مولانا سے تعلیم پائی تھی۔ آگرہ میڈیکل کالج میں پروفیسر رہے۔ اسسٹنٹ سول سرجن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انھوں نے دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ ایک کتاب اناٹومی سے متعلق تھی اور دوسری فزیالوجی پر تھی۔ مولانا میرٹھی نے ان کتابوں کے ترجمے کی عبارت دُرست کی تھی۔

(۲) ڈاکٹر رنجیت سنگھ۔ اِن کا وطن میرٹھ تھا ضلع اسکول میرٹھ میں مولانا سے تعلیم پائی تھی۔ بہت ترقی کی۔ سول سرجن کے عہدے پر فائز ہوئے "رائے بہادر" کے خطاب سے ممتاز کیے گئے۔ تصوّف سے بھی لگاؤ تھا۔

(۳) مولوی عزیز الحسن ایم۔ اے۔ بھرت پور کے رہنے والے تھے۔ آگرہ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ تعلیم کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ وہ شاعری میں مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ میں شامل تھے۔ غالباً ۱۸۹۸ء میں ایک روز مولانا میرٹھی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غزل اصلاح کے لیے پیش کی۔ مولانا نے فرمایا اپنے اُستاد سے مشورہ کیجیے۔ عزیز الحسن نے اصرار کیا کہ میں تبرکاً آپ سے اصلاح چاہتا ہوں۔ مجبور ہو کر مولانا نے مطلع پر دوبارہ فکر کرنے کا مشورہ دیا اُنھوں نے درخواست کی کہ مولانا آپ ہی دُرست فرما دیں۔ مولانا نے اِس طرح

بنا دیا۔

زعمِ باطل میں نہ کافر ہوں نہ دیں داروں میں ہوں
آسرا تیرے کرم کا ہے گنہ گاروں میں ہوں

خدّام

ان کے خدمت گزاروں میں قابلِ تذکرہ ایک ملازم بدھن تھا جو فیض آباد کا رہنے والا تھا۔ وہ مولانا کے مزاج کو پہچانتا تھا اور ان کے آرام کا نہایت خیال رکھتا تھا۔ بڑا وفادار تھا۔ وہ اس خاندان کا ہو کر رہ گیا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ مولانا کے نواسے سیّد احسان الحق کے پاس ملازم رہا۔

ایک اور شخص جس کو مولانا کی خدمت کا شرف حاصل رہا اور جو مولانا کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان کی آسایش کا دن رات خیال رکھتا تھا۔ مولانا کے معمولات پر اس کی نظر تھی۔ اس کا نام شیخ محمد عمر گدّی تھا۔ وہ اپنے شوق سے مولانا کے کمرے کے باہر سوتا تھا۔ جاڑا گرمی ہر موسم میں مولانا کے لیے حقّہ تیار کر دینا اس کا خوش گوار فرض تھا۔ مولانا حقّہ بہت پیتے تھے۔

حلیہ اور لباس

"مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کا قد ۵ فٹ ۸' انچ تھا' سر گول ماتھا چوڑا اور اونچا داڑھی بھری ہوئی' آنکھیں بڑی ناک اونچی اور چوڑی ہونٹ پتلے' چہرہ گول اور شاندار جس سے آثارِ بزرگی نمایاں' سینہ چوڑا' کمر ذرا جھکی ہوئی ممکن ہے کثرتِ نشست سے یہ بات پیدا ہو گئی ہو۔ کفِ دست بھرے ہوئے' انگلیاں لمبی اور گاؤ دُم' پا تو متوسط' قوی الجثہ نہ تھے مگر نحیف الجثہ بھی نہ تھے۔ جوانی میں جسم لاغر تھا۔" (۱)

---

(۱) حیاتِ اسمٰعیل۔ ص ۱۱۴

"عمدہ لباس زیب تن نہیں فرماتے تھے یہاں تک کہ زمانۂ شباب میں بھی سادہ لباس پہنتے تھے۔ سر پر زیادہ تر عمامہ باندھتے تھے۔ جوتا ہمیشہ دیسی پہنتے تھے۔ پاجامہ شرعی، کرتا اوسط لمبائی کا پہنتے تھے نہ کہ حاجیوں کی وضع کا۔ شیروانی استعمال کرتے تھے موسمِ سرما میں شیروانی پر اوورکوٹ۔ جب باہر تشریف لے جاتے تھے تو چھڑی ہاتھ میں ضرور رکھتے تھے۔ مولانا جامہ زیب تھے کیسا ہی لباس ہو ان پر خوب پھبتا تھا۔" (۱)

بیماری اور وفات

تندرستی: مولانا کی تندرستی ایامِ جوانی میں اچھی نہ تھی۔ اکثر دردِ قولنج کی شکایت رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی دردِ گردہ کی بھی۔ یہ کیفیت قیامِ آگرہ میں جاری رہی۔ سینہ کی کھانسی جسے انگریزی میں "کرانک برانکائٹس" کہتے ہیں۔ مزید برآں تھی۔ یہ شکایت سگریٹ کی کثرتِ استعمال سے پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کی ممانعت پر سگریٹ کا پینا یک لخت ترک کر دیا تھا۔ موسمِ سرما میں طبیعت زیادہ ناساز رہا کرتی تھی۔ (۲)

۱۹۱۷ء میں مولانا کے سر میں درد شروع ہوا۔ ۵ محرم الحرام ۱۳۳۶ ہجری کو بخار آ گیا۔ شہر کے اعزّا اور عمائدین مزاج پرسی کو آتے رہتے تھے۔ مولانا کے ایک پرہائی حافظ ظہور محمد روزانہ خیریت معلوم کرنے آتے تھے۔ ۹ محرم الحرام کو اُن سے گفتگو کرتے رہے اور اثنائے گفتگو میں فرمایا ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، بس چودہ تک سمجھنا چاہیے وہ اس کے معنی یہ سمجھے کہ مولانا کا وصال چودہ تاریخ کو ہوگا لیکن حافظ صاحب نے کسی سے اس امر کا تذکرہ نہیں کیا۔

رحلت

مولانا کا وصال ۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ ہجری مطابق یکم نومبر ۱۹۱۷ء جمعرات

---

(۱) حیاتِ اسمٰعیل۔ ص ۱۱۴ (۲) حیاتِ اسمٰعیل۔ ص ۱۱۴، ۱۱۵

کے دن چار بجکر ۲۰ منٹ پر ہوا۔

مدفن: انتقال کے وقت مولانا نشست گاہ میں قیام فرما تھے بعد وفات اِن کو زنانے مکان میں لے جایا گیا اسی مکان میں مولانا کی ولادت ہوئی تھی۔ جس کمرے میں پیدائش ہوئی تھی اسی کمرے میں غسلِ میت دیا گیا۔

مولانا نے وفات سے دو تین برس پہلے عیدگاہ جاتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہمیں اس مقام پر دفن کرنا اور مدفن کے لیے یہ زمین خرید لینا۔ یہ مقام باغپت اور غازی آباد کی سڑکوں کے سنگم سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر جانبِ شمال واقع ہے چنانچہ وصیت کے مطابق اسی مقام پر مزار بنا یا گیا۔ اس مقام سے دو سو قدم کے فاصلہ پر ڈپٹی نجم الدین کا مزار ہے۔

جنازہ مغرب کے وقت اُٹھایا گیا۔ ۸ بجکر ۴۰ منٹ پر جسمِ پاک سُپردِ خاک کیا گیا۔ ہندو اور مُسلمان کثیر تعداد میں جنازے کے ساتھ تھے آنریبل سر سیتارام رئیسِ میرٹھ بھی تدفین کے وقت موجود تھے۔ مولانا کی عمر انتقال کے وقت انگریزی حساب سے تہتر (۷۳) برس اور ہجری حساب سے پچھتر (۷۵) برس کی تھی۔

(ب) شخصیت اور کردار

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ یعنی شاعر اور معلّم۔ ان دونوں پہلوؤں سے ان کی مکمل شخصیت کا نقش بنتا ہے۔ ان کی شخصیت کا پہلا رُخ تو واضح طور ان کی نظموں سے منعکس ہوتا ہے۔ وہ اس مادّی دنیا کو فانی تصور کرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ تصور انسانی محبّت اور حقوق و فرائض کی راہ میں حائل نہیں ہوتا نیز ماحول کو بہتر بنانے کے ارادوں اور کوششوں میں بھی بددِلی یا رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ مولانا کے معاصرین، تلامذہ اور ان کی تخلیقات سے فیض پانے والے ہمیشہ ان کے مدّاح رہے۔

ذہن: غزل گوئی سے اپنا دامن بچانے کے بعد مولانا نے جو کچھ تخلیق کیا ہے وہ ان کے ذہن کی پختگی پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ہمیں ایک

ایسے ذہن کا پتا چلتا ہے جو صاف گو اور مخلص ہے انھوں نے کائنات کے حُسن و خیر کی تصویریں بڑی ہمدردی اور چابکدستی کے ساتھ کھینچی ہیں۔ ان کے ہاں اِنسانی ابتلا اور کلفتوں کے نقوش میں شفقت اور خلوص کی لہریں موجزن ہیں۔ اپنی ذات اور اس جہانِ رنگ و بو کے ناپایدار ہونے کا ان کو یقین ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے زندگی کے حُسن و خیر سے مُنہ موڑنے کی تلقین نہیں کی۔ وہ کائنات کے بے ثبات ہونے پر زور دیتے تھے لیکن ان کو انسان کے اضافی نقطۂ نظر سے اس کے اثبات کا بھی احساس تھا۔ ان کا لگاؤ صوفیۂ کرام سے تھا۔ انھوں نے رسائلِ تصوف کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے یہاں ماورائیت کا ایک واضح احساس روحانی خلش اور اس کے ساتھ ہلکی سی غم کی تہہ ملتی ہے۔ مولانا کو اس مادی دنیا کی تمام رعنائیوں اور مسرّتوں کا ادراک تھا۔ فنونِ لطیفہ میں ان کو سچی مسرت ملتی تھی۔ روشنی، رنگ اور موسیقی کے معاملے میں وہ نہایت رچا ہوا احساس رکھتے تھے۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چمن میں نوشگفتہ کلی کا سبز شاخوں کے پس منظر میں مشاہدہ کرنا پسند کرتے تھے یا نیلے آسمان پر سُرمئی بادلوں کے منظر یا برسات کی پھوار یا مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کا ظرف رکھتے تھے۔

ان کے ذہن کو ایک شاعر کی نزاکت، لطافت، حس اور ادراک عطا ہوا تھا اسی کے ساتھ ساتھ اُنھیں ایک عملی کاروباری انسان کا شعور بھی ملا تھا۔ وہ خواب و خیال کی دنیا کے شاعر نہ تھے۔ انھوں نے مطالعے میں بہت ریاضت کی تھی۔ قدما اور اپنے بہترین معاصرین کے شہ کاروں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے تھے۔ اپنی نظموں کی بار بار اصلاح و ترمیم کرکے مصرعوں کو جِلا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض مصرعے اور اشعار اپنی ارتقائی صورت میں بالکل تبدیل ہو کر منظرِ عام پر آئے۔

تحمل و بُردباری: وہ جس طرح شاعری میں نظم و ضبط کے پابند تھے اس طرح کردار کے معاملے میں بھی خاصے سخت تھے۔ ایک شاعر عام انسانوں کے مقابلے میں

بات کو کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں زیادہ عمق ہوتا ہے۔ لیکن وہ چونکہ بے حد حساس ہوتا ہے۔ اس کی مزاجی کیفیت دوسروں کے لیے ایک عجیب و غریب خطرہ بن جاتی ہے۔ مولانا نے اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا اور اپنی طبیعت پر قابو پا لیا تھا۔ چنانچہ جب "قواعد اردو" حکومت کے یہاں سے نامنظور ہوئی تو انھوں نے غم و غصہ کے اظہار کی بجائے تحمل سے کام لیا اور نصابی کتابوں اور قواعد اردو کی ترتیب و تدوین کا کام برابر کرتے رہے اور معاصرانہ اعتراضوں میں اگر ذرہ برابر بھی صداقت نظر آئی تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے معلمی کے فرائض کے علاوہ ان کو دفتر کے کام بھی سپرد ہوئے یا آگرے میں نارمل اسکول میں مستقل طور پر ہیڈ مولوی رہے لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنی صلاحیتوں کو نکھارتے رہے تصنیف و تالیف کا کام مستقل مزاجی سے جاری رکھا اور اس کے ساتھ شعری تخلیق کا عمل بھی جاری رہا۔ وہ حالات کا مقابلہ ضبط اور پامردی سے کرتے تھے اور یہی ان کے نزدیک شیوۂ انسانیت تھا۔

احساسِ فرض بہ حیثیتِ معلّم: معلّم کی حیثیت سے ان کی بلند کرداری قابلِ رشک تھی۔ اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں نہایت مستعد اور دیانت دار تھے علم کو مفید اور موثر طور پر پھیلانے کو وہ عبادت سمجھتے تھے۔ بچّوں کی قدر کرتے تھے۔ اپنی شفقت، اعانت اور ہمدردی سے طلبہ کی شخصیت کی مناسب طور پر نشوونما کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ تدریس کے علاوہ انھوں نے ایک کامیاب معلّم کی زندگی کے بھرپور تجربوں کی روشنی میں طلبہ کی مشکلات کو دُور کرنے اور اُن میں مطالعے کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لیے ابتدائی کتابیں مرتّب کیں جو نہایت کامیاب اور مقبول رہیں۔ یہ ہندستان اور پاکستان میں اب تک استعمال ہوتی ہیں۔ اور ان سے چوتھی نسل مستفید ہو رہی ہے۔ ان کی یہ علمی نیکی عبادت سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ اس کا فیض کسی

جماعت یا فرد یا فرقے تک محدود نہیں بلکہ پوری قوم کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔

مذہب: مولانا سخت قسم کے توحید پرست مسلمان تھے۔ وہ تمام اوصاف کے ساتھ خدا کی ذات میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے کردار کی ایک اہم خصوصیت ایمان کی لگن اور بے لوثی تھی۔ ان کا دل بچوں کی طرح معصوم تھا۔ ذاتی احتیاج کا خیال انھیں کم تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی احتیاج کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے عہد میں مقابلے کے امتحانات اور خطابات و انعامات کا رواج ہو چلا تھا۔ اس لیے نتیجے کے طور پر خود غرضی کا عنصر غالب ہو جانا کچھ عجیب نہ تھا۔ بعض معاصرین میں دوسروں کی کامیابی اور حصولِ اعزاز و اقتدار پر حسد اور چشمک پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس طرح کی خود غرضی جو دوسروں کی ترقی میں حائل ہو، مولانا کی فطرت اور مزاج میں داخل نہ تھی بلکہ دوسروں کی کامیابی میں وہ اپنی خوشی دیکھتے تھے۔ خود غرضانہ رقابت اور تنگ نظری اور کم سواد حسد سے وہ قطعی آزاد تھے۔ ان کا مذہب انسانیت تھا۔

کفایت شعاری و دیانت داری! دنیوی وجاہت کا جہاں تک تعلق ہے اس نقطۂ نگاہ سے مولانا کچھ زیادہ صاحب اقتدار نہ تھے اگرچہ آخر میں انھیں خان صاحب کا خطاب مل گیا تھا۔ تمام عمر وہ کبھی کسی بڑے سرکاری منصب پر فائز نہیں رہے۔ انھوں نے معلمی کے پیشے میں زندگی بسر کی لیکن اسی روزگار میں اس سلیقے اور رکھ رکھاؤ سے زندگی کا بہتر معیار قائم رکھا کہ اپنے صاحبزادے کو انگلینڈ بھیجا پھر یورپ سے تجارت شروع کرائی کفایت شعاری اور محنت کی روزی سے اولاد کے لیے جائداد خریدی مگر دولت جمع کرنے کی ہوس پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے سے معذور تھے بلکہ یہ ان کی طبیعت کا رنگ نہیں تھا۔ دنیوی امارت ان کی شخصیت کو کبھی یکسر جذب نہ کر سکی۔ دولت کے ذریعے خوشی میسر آنے کا ان کا

ایک طریقہ رہا یعنی وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی مالی اعانت کرکے خوش اور مطمئن ہوتے تھے۔ انھیں اپنے دوستوں اور شاگردوں کی فارغ البالی کی اطلاع سے بھی خوشی میسر آتی تھی۔ ان کا ذہن تحصیلِ علم پر مرکوز تھا۔ وہ علم کی دولت کو ہر قسم کی دولت سے برتر سمجھتے تھے اور علم کا خزانہ دستیاب ہونے کو وہ اصل معنوں میں دولت کا حصول سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے عمرِ عزیز کو علم کی جستجو اور وسیع تر حصولِ علم میں لگا یا۔ حصولِ علم کا مقصد ان کے یہاں محض 'علم برائے علم' نہ تھا ان کا حقیقی مقصد اپنے عہد کی عقلی اور ذہنی روح تک رسائی حاصل کرنا تھا۔

انھوں نے جتنا علم حاصل کیا تھا اپنی تخلیقات کے ذریعے ہم وطنوں تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ انھیں اتنا وقت کس طرح مل جاتا تھا

وضع داری : مولانا کی ایک اور خوبی ان کا پابندِ وضع ہونا تھا۔ روزانہ زندگی کی عام عادتوں میں بھی اور لباس، غذا اور رہن سہن کی وضع میں بھی۔ وہ جب نارمل اسکول میں ہیڈ مولوی تھے یا پھر جب پینشن پاکر فارغ البال زندگی میرٹھ میں گزار رہے تھے ان کی پابندیِ وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے صاحبزادوں کی اعلا تعلیم ہوئی تھی۔ انگلینڈ سے تجارت شروع کی تھی۔ انگریزوں اور انگریزی تعلیم یافتہ افراد کا ساتھ رہا مگر انھوں نے قدیم ہندستانی رواج و عادت، خواہ وہ لباس سے متعلق ہوں یا زندگی کے اطوار سے یا روزانہ کی غذا سے، ان میں کبھی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سرسیّد احمد خان کے اثر سے انھوں نے ترکش فیض اور موسمِ سرما میں شیروانی پر اوور کوٹ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج کو اپنی تہذیب کا مرکز سمجھتے تھے اور اس سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اسلام میں ان کا پختہ عقیدہ تھا لیکن اس میں مذہبی عصبیت، حسد یا توہم پرستی کا رنگ نہ تھا۔ وہ انسان دوستی کے قائل تھے۔

قومی یک جہتی اور مساوات : وہ اپنی روزانہ کی سماجی اور مذہبی زندگی میں

آدمی اور آدمی میں مذہبی بنیاد پر امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ سماجی اعتبار سے وہ ہندو، مُسلمان، عیسائی سب سے خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ملتے تھے۔ ان کے یہاں سماجی اور مذہبی امتیازات نہ تھے اور اس معاملے میں گفتگو یا برتاؤ میں کسی شخص کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مولانا نہایت روادار، اتحاد پسند، انسان دوست اور صلحِ کُل انسان تھے۔ ان کی زندگی قومی ہم آہنگی اور اتحاد کی زندہ مثال تھی۔

مولانا بہت کم گو اور عزلت نشیں تھے کثرتِ مطالعہ، شغلِ تصنیف و تالیف اور سگریٹ پینے کے باعث دردِ قولنج، دردِ گردہ، اور سینہ کی کھانسی (کرانک برانکائٹس) میں مبتلا رہتے تھے لیکن اس کے باوجود زندہ دلی سے تصنیف وتالیف کا کام کرتے تھے۔ صبح کو چار بجے بیدار ہوتے اور اپنے معمولات میں منہمک ہو جاتے تھے۔

مولانا کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا لیکن جن سے روابط قائم ہو گئے ان کو وضع داری کے ساتھ عمر بھر نباہتے رہے۔ تواضع مولانا کے کردار کا جوہر تھا۔ کسی کی دعوت کرتے تو چہرہ مسرت سے دمک اٹھتا تھا۔ مولانا خیرات کرتے تھے مگر نہایت خاموش طریقے سے۔ غریبوں کو قرضِ حسنہ دیتے تھے۔ بعض ضرورت مند اور شوقین طلبہ و طالبات کے تعلیمی مصارف کے کفیل بن جاتے تھے۔ اکثر بیوہ خواتین کی تعلیم کا اپنے مدرسے میں اہتمام کیا اور ان کی ٹریننگ کرائی تاکہ وہ معلمہ بن سکیں ۱۹۰۹ء میں مدرسہ بنات المسلمین قائم کیا جو ۱۹۲۵ء سے محمد اسمٰعیل گرلز اسکول اور اب اسمٰعیلیہ ڈگری کالج ہے۔ تعلیمی و تہذیبی اداروں اور انجمنوں کو چندہ دیتے تھے اردو اخبار و رسائل ان کے نام اعزازی طور پر جاری کیے جاتے تھے۔ مگر وہ اصرار کے ساتھ ان کا سالانہ چندہ ادا کیا کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار لاہور اور خان بہادر ڈاکٹر مولوی بشیر الدین کا اخبار البشیر اٹاوہ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

مولانا کی شخصیت میں تہور اور جاہ و جلال کا عنصر نہ تھا۔ ان میں کوئی نہایت غیر معمولی ذہانت نہ تھی لیکن محنت ان کا امتیازی وصف تھا۔ وہ خضرِ راہ بننے کے

لیے پیدا نہیں ہوئے تھے اور نہ قطعی طور پر تقلید کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے انھوں نے انسانوں پر فرمانروائی کے لیے نہیں بلکہ خدمت گزاری کے لیے آنکھ کھولی تھی۔ انھوں نے اپنی قدرت کے ذریعے دلوں پر غلبہ حاصل کرنے کو جنم نہیں لیا تھا بلکہ نرمی اور شفقت سے دلوں کو جیتنے کے لیے فضا میں سانس لی تھی۔ ان کی شخصیت میں آتش فشاں پہاڑ کی جولانی نہ تھی بلکہ شمع کا گداز تھا۔ ان کی زندگی کے تابناک اوصاف خلوص، خدمت اور لگن تھے وہ سراپا انسانیت تھے۔ مولانا انتہا پسندی کے قائل نہ تھے۔ توازن اور اعتدال کے ساتھ نباہ کرتے تھے۔ ان کی تصانیف سے تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اشتعال پذیر، دل گیر اور متلوّن مزاج نہ تھے بلکہ سادگی پسند، متین، پرسکون اور غور و تامّل کے اوصاف سے متصف تھے۔ وہ صابر و شاکر تھے ادعا پسند نہ تھے۔ حالات کی انتہائی ناسازگاری کے وقت بھی وہ تقدیر کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے تھے۔

شفقت آمیز رجائیت: مولانا کی ایک اور خصوصیت ان کی خلقی شفقت آمیز رجائیت ہے۔ ان کی تصانیف میں زندگی اور زندہ دلی کا عنصر موت پر حاوی ہے۔ اشیا کے تاریک پہلو کی طرف وہ کم ہی دیکھتے تھے۔ لیکن ان کی رجائیت کی تہہ میں ہم کو بہت قریب پہنچ کر زود حسی کے ساتھ ساتھ طاقت و قوت کی علامات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا انسانوں اور آداب و رسوم کے بڑے حسّاس اور ہمدرد مشاہدہ بین تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مختلف سماجی طبقات کی اہم خصوصیات اور عادات کا بغیر عینک کے مشاہدہ کیا تھا اور ان کو پوری معروضیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

مولانا کی زندگی میں پبلک لائف اور معاملات، شاعرانہ محرکات و عوامل کے زیر اثر رہے۔ وہ نہایت کم آمیز، گوشہ نشین اور شریف المزاج انسان تھے ان کا رجحانِ طبعی واقعات کی دنیا سے زیادہ تصوّف اور روحانیت کی دنیا کی طرف تھا۔ تذکرۂ غوثیہ اور بچوں کی کتابیں اس عالم کی شاہد ہیں۔ اسی انہماک اور خلوت کے

ماحول میں انھوں نے اپنے مقبولِ عام ریڈروں کی سیریز مرتب کیں اور ان کی اشاعت کی۔

مولانا کی زندگی ایک شاعر کی مخصوص ناکامیوں، فخر اور نازک مزاجی سے خالی نہ تھی۔ انھوں نے ایک زمانے میں اپنا ایک راز دار دوست تخلیق کر لیا تھا اور ایم، آئی کے مخفف نام سے نظمیں لکھا کرتے تھے۔ معارف علی گڑھ میں چھپی ہوئی نظم یاسر سید کی موافقت میں انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں کافی جھلاہٹ ہے اسی طرح رسمی غزل کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے اس میں لہجہ اُس متانت اور نرمی سے مختلف ہے جو مولانا کے مزاج کی عام کیفیت ہے لیکن یہ وقتی رجحان ہیں۔ ان کا اصل انداز وہی متانت اور تھمی تھمی بردباری کا ہے۔

مولانا صحیح معنوں میں انسان کے شاعر تھے (A Poet of men) اور انسان کی انفرادیت اور اعمال ان کی شاعری کے موضوعات تھے۔ اس جہانِ رنگ و بو کی زندگی کے لیے ان میں بڑا ولولہ تھا۔ بنی نوعِ انسان کی سوسائٹی کے لیے بلند و پست، اچھے اور بُرے، سچے مرد و عورت، بچے سب کی عزت تھی اور ان کی اچھائی اور نیکی سے خوشی حاصل کرتے تھے وہ سب طرح کے انسانوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اچھے میں بھی اور بُرے میں بھی۔ لیکن یہ سمجھنا بھی غلطی ہوگی کہ وہ بدقوارہ آدمیوں کو سماج کے معزز افراد سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ عہد نامہ نہیں بھرا تھا کہ صرف گلیوں کی گندگی ہی پر نظر ڈالیں گے بلکہ شاہراہوں کے کنارے لگے ہوئے پھولوں پر بھی ان کی نظر جاتی تھی۔

انسان دوستی

مولانا کو اجتماعی حیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کا فراخ و وسیع جذبۂ ہمدردی بنی نوعِ انسان کے لیے تھا۔ زندگی کی مسرت، طمانیت اور شادمانی

ان کی نظموں سے پھوٹی پڑتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ چند شخصیتوں کے ساتھ ان کو والہانہ عشق تھا۔ وہ ان کی عظمت کے قائل تھے۔ لیکن ایک محبت دوسری کو فنا نہیں کرتی ان کے دل کی دنیا میں سب کے لیے جگہ تھی۔ کراہت یا بغض ان کے یہاں ناپید ہے وہ ان سے بھی متنفر نہیں ہیں جن کے کردار کی خامیوں کو انھوں نے دکھایا ہے وہ کٹ ملّا اور فریبی خانقاہوں سے بھی بیزار نہیں ہیں جن کے مکروریا پر انھوں نے گرفت کی ہے وہ بدی کا مطالعہ اچھائی کے پس منظر میں کرتے تھے۔ وہ اس مسلک کے ماننے والے نہیں تھے کہ بنی نوعِ انسان کو برائی اور بھلائی یعنی خیر و شر کے دو الگ الگ گھروندوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ انھیں احساس تھا کہ انسانی کردار بڑی پیچیدہ چیز ہے اور انسان میں اکثر خیر و شر یا اچھے بُرے اوصاف کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنا رشتہ کہیں پر بھی انسان سے نہیں توڑا اور سماج کے افراد پر بہ حیثیت مجموعی بھی نظر ڈالی۔ وہ اس راز سے آگاہ تھے کہ انسانوں کی مشترکہ ناکامیوں کا شعور ہی انھیں متحد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب ان کی خامیوں کو دیکھتے ہیں تو وہ قہقہہ نہیں لگاتے ہنستے بھی نہیں بلکہ مسکراتے ہیں اور اس میں لحاظ و برداشت کی زیریں لہر ہوتی ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مجموعۂ اضداد ہونے کی آگہی پر ہے۔

○

باب دوم

ماحول

(الف) تاریخی اور ادبی پس منظر

برطانوی سامراج کے خلاف ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ یہ تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا اگرچہ سیاسی اعتبار سے یہ جنگِ آزادی ناکامی پر ختم ہوئی لیکن نفسیاتی اور ذہنی طور پر ہندستانیوں کو ایک نئی قوت عطا ہوئی۔ ایک نئی راہِ عمل سامنے آئی۔ کچھ مدت کی عارضی مایوسی سے امید کی نئی صبح کے جلوے بکھرنے لگے۔

عمرانی اور سیاسی فتح مندی کا واضح نشان 'متوسط طبقہ' کا جنم لینا تھا جو بعد میں آزادی کی قومی تحریک یعنی آل انڈیا کانگریس کی صورت میں نمایاں ہوا اور ہمارے ملک کو آزادی کی نعمت عطا ہو سکی۔ یہ بات یقیناً ناقابل فراموش ہے کہ سیکولرزم اور سوشلزم کے قومی ترانے کا پہلا بول، ۱۸۵۷ء کے شہیدوں نے اپنے پاک خون سے لکھا تھا۔

سماجی طور پر اس دور میں قومیت، جمہوریت اور سوشلزم کے تصورات کا آئینہ اتنا تابناک نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا، پھر بھی عقلیت اور سائنس کی روشنی میں ملک کے چند عظیم رہبروں نے عوام کو ایک بہتر زندگی کی راہ دکھائی ان عقلیت پسندوں میں راجا رام موہن رائے

اور سر سید احمد خاں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رائے نے برہمو سماج قائم کر کے معاشرے کو ابتری سے بچا لیا اور سر سید نے علی گڑھ تحریک کی بنا ڈال کر معاشرے میں نئی زندگی کا نیا خون داخل کیا ہر چند قومی پیمانے پر کوئی عوامی تحریک سامنے نہیں آئی اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور اور نظام میں کسی ایسی تحریک کا دعویٰ کرنا بھی تاریخی عوامل سے روگردانی کے مُرادف ہوگا۔ لیکن اس دور میں جس قدر کام قومی رہنماؤں نے کیا آگے چل کر اس نے کھاد کا کام دیا۔ ذہنی بیداری نے مذہبی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی میدانوں میں الگ الگ اپنی راہیں متعین کیں۔ اس وقت مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات پر بحث کرنا ہمارے موضوع میں داخل نہیں ہے لیکن تعلیمی اور ادبی رجحانات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے ۱۸۵۷ء کے بعد ہر چند انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی لیکن اس کے ساتھ اس دور میں تعلیم کا ایک رجحان یہ بھی تھا کہ ہندستانیوں نے دیسی زبانوں کی ترقی پر زور دیا۔ حاکم قوم کے دانشور طبقے اور مشنری حلقے میں دیسی زبانوں اور مشرقی علوم کی تحصیل پر کافی توجہ کی گئی۔ یہاں ہمیں اردو زبان و ادب سے بحث کرنی ہے اس لیے سر سید کے تعلیمی نظریے اور علی گڑھ تحریک کے متعلق بیان کرنا ضروری ہے۔

سر سید کا تعلیمی نظریہ اور اس کا پس منظر

۱۸۵۷ء کے اردگرد ملک میں عام طور پر ذہنی بے چینی تھی۔ انفرادی اور کسی حد تک اجتماعی طور پر اس کا اظہار بھی ہوا۔ 'علی گڑھ تحریک' اس ملکی بے چینی کے بطن سے ہندستانی مُسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ دراصل یہ تحریک ہمارے ہم وطنوں کی بیداری کا ایک جز تھی جس کو ہم "ہندستانی نشاۃ ثانیہ" کا نام دے سکتے ہیں۔ اس تحریک کی جڑیں اُن سیاسی، مذہبی، اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالات میں پیوست تھیں جو ملک میں نشوونما پا رہے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی: ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی تسلّط نے ملک کی اقتصادی زندگی پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ جاگیرداری نظام جو تاریخی واقعات کے

غلبہ کا کامیابی سے مقابلہ کرتا رہا تھا، اب اس کا شیرازہ منتشر ہو چلا تھا۔ چھوٹے پیمانے کی تمام صنعتیں ختم ہو رہی تھیں اور رفتہ رفتہ ہندستان خام اجناس کے بازار کی شکل میں بدل رہا تھا۔ ہندستانی سرمایہ داری ملک میں اپنا طبقاتی رول ادا کرنے کی بجائے برطانوی سرمایہ داری کا منہ تکنے پر مجبور تھی۔ ایچ، ایچ ولسن کے لفظوں میں:

"کروڑوں ہندستانی دستکاروں کی روزی ناپید ہو گئی تھی۔ ہندستانی آبادی کا ایک بڑا ذریعہ منقطع ہو گیا تھا۔ ہندستان میں یہ انگریزی راج کی تاریخ کا ایک المناک افسانہ تھا۔ انگلینڈ میں بجلی سے چلنے والی کپڑا بننے کی مشینوں کی ایجاد نے ہندستانی صنعت کے زوال کو مکمل کر دیا۔" (۱)

زمینداروں اور ان کے حکمرانوں کے روز افزوں مطالبات کے بارِ گراں اور ٹیکس کلکٹروں کی زیادتی کے باعث کسانوں کی اپنے کام میں دلچسپی نہیں رہی اسی طرح ملک کی صنعتی اور زراعتی دونوں قسم کی زندگی تباہ کر کے کمپنی نے مادرِ وطن کو افسوسناک افلاس کے آغوش میں ڈھکیل دیا۔

عیسائی مشنریاں: تمام تباہ کن اقتصادی حالتوں کے باوجود ہندستانی ابھی اپنی بعض مذہبی اور اخلاقی قدروں کو دل سے لگائے ہوئے تھے اور ان کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ عیسائی مشنریوں نے ہندستان میں اپنا کام سولھویں صدی میں شروع کر دیا تھا پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز مشنریاں عیسائیت کی تبلیغ میں جارحانہ طور پر مشغول تھیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف حصوں میں گرجا گھر بنائے اور مشنری اسکول کھولے غریب ہندستانی صرف اپنے اقتصادی حالات بہتر بنانے کی امید میں عیسائی مذہب کو قبول کرنے لگے تھے۔ لیکن ۱۸۱۳ء کے چارٹر کے بعد مشنری کے کام

---

(۱) بحوالہ محمد نعمان۔ مسلم انڈیا۔ ص ۲۵

کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ۱۸۳۰ء میں الیگزینڈر ڈف ہندستان آیا۔ اس نے اس کمی کو محسوس کیا اور ہندستانی نوجوانوں کو اسکولوں اور کالجوں کے ذریعے سے عیسائیت کے زیر اثر لانے کی مہم شروع کی۔ اس نے مشن اسکولوں کا جال پھیلا دیا جن میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ آخر کار وہ کلکتہ کے ممتاز گھرانوں کے بہت سے ہندستانیوں کا مذہب تبدیل کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ جن میں ٹکرجی، بنرجی، چکرورتی، گھوش، موزمدار، دت سرکار، ناتھ، اور گنگولی وغیرہ سب ہی گھرانے شامل تھے۔ ان میں سے بعض افراد نے بنگال میں بڑی قدر و منزلت حاصل کی مثلاً کرشن موہن بنرجی، گوپی ناتھ نندی، مہیش چندر گھوش، آنند چند موزمدار، اور لال بہاری ڈے (۱)

اس کے علاوہ فوجی افسروں نے عیسائی مذہب کی تعلیم کا پرچار ان پڑھ فوجی سپاہیوں میں بھی شروع کر دیا تھا مشنریوں کو فوجی (Cantonment) چھاؤنی میں جانے اور تبلیغ کرنے کی اجازت تھی۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ابتدا میں برطانی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستانیوں کی تعلیم کو قطعی طور پر نظر انداز کیا تھا لیکن انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں انھوں نے ہندستانیوں کی تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ہندستانیوں کی تعلیم کے سلسلے میں دو اہم سوال اُٹھائے گئے تھے۔

(۱) آیا کہ ہندستانیوں کو انگریزی پڑھائی جائے یا نہ پڑھائی جائے۔

(۲) کیریکولم میں مذہبی تعلیم کا کیا مقام ہونا چاہیے۔

ہندستان میں پریس کا قیام : تعلیم کا ایک معاون ذریعہ پریس ہوتا ہے۔

---

(1) Tarachand, History of the Freedom Movement in India, Vol. Two. 1967. P.181

اس لیے اس کا بیان بھی ضروری ہے۔ پرتگالیوں نے ۱۵۵۰ء میں ہندستان میں سب سے پہلے دو پریس منتقل کیے۔ ان سے مذہبی کتابوں کی اشاعت کا کام لیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی میں بھیم جی پارکھ نے بمبئی میں ایک پریس لاکر لگایا۔ برطانی ایسٹ کمپنی نے بھی ۱۶۷۴ء میں ایک پریس قائم کیا تھا۔ اٹھارویں صدی میں مدراس، کلکتہ، ہگلی اور بمبئی وغیرہ میں پریس قائم ہو گئے تھے۔ فارسی رسم خط کا پہلا تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم ہوا۔ اس کا نام ہندستانی پریس تھا (۱) ڈاکٹر تارا چند نے بیان کیا ہے.

"Infact by 1848, there were nearly a dozen and a half presses in the North West Provinces and the Punjab, and with the exception of two, all published news papers." (۲)

اردو ترجمہ

یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۴۸ء کے اواخر تک شمالی مغربی صوبے اور پنجاب میں تقریباً ڈیڑھ درجن مطبع قائم ہو چکے تھے جن میں دو کے علاوہ سب اخبارات ہی شائع کرتے تھے۔

دانشور طبقہ کی قیادت : غرض پریس کا استعمال عام ہوا۔ ریل، تار، ڈاک، بجلی اور نئی سڑکوں نے ہندستانیوں کے سامنے ترقی کی نئی راہیں کھول دیں۔ سائنسی رجحانات کے فروغ کی خواہش پیدا کرنے میں پریس سب سے زیادہ مددگار ثابت

---

(۱) گل کرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، ۱۹۶۰ء دہلی، ص ۳۵

(۲) ص ۲۲۵

ہوا۔ پریس نے رائے عامہ کو متاثر کیا۔ سیاست نے ہندستان میں نئے متوسط طبقے کو جنم دیا تھا۔ اب پریس کی بدولت ایک نیا کلاس یعنی دانشور طبقہ، Intelligentia پیدا ہو گیا۔ ہندستانیوں نے اخبارات و رسائل نکالنے شروع کیے پھر ورناکیولر پریس کا جنم ہوا۔ رسالوں کی تعداد زیادہ رہی۔ انگلش پریس کے مقابلے میں موضوعات کا دائرہ وسیع تھا۔ سیاست پر کم لکھا گیا زیادہ تر توجہ مذہبی، سماجی اور ادبی مضامین پر رہی۔ اسی طرح ہمارا پریس مغربی تعلیم کے خیالات کا موثر آلہ بن گیا۔

پرانا نظام اپنے اثرات کچھ مدت تک نئے نظام میں بھی باقی رکھتا ہے۔ عوام کو ماضی سے ایک ساتھ کاٹا نہیں جا سکتا اس لیے نئے خیالات کو پوری آزادی نہیں تھی۔ ایسے وقت میں علی گڑھ تحریک کا اردو زبان و ادب پر مفید اور گہرا اثر پڑا۔ اہم اثر تو یہ ہوا کہ ادیبوں اور شاعروں میں روایتی ادبی اقدار سے بے اطمینانی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں عیسائی مشنریوں نے سماج کے کئی شعبوں میں دراندازی شروع کر دی اور نوجوانوں کے ذہنوں میں خطرناک قسم کے شکوک پیدا کر دیے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کو راجا رام موہن رائے، دیوندر ناتھ ٹیگور کیشپ چندر وغیرہ نے سماجی، مذہبی، اصلاحی تحریکیں شروع کر دیں۔

نئے حالات میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ سے قیادت جاتی رہی رہنمائی کا رول دانشور طبقے کے افراد کی لیڈرشپ نے ادا کیا۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی کو توانائی بخشنے کے لیے کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ ان کو کبھی تجدید اور کبھی احیائے دین کا نام دیا گیا۔ مغل حکومت کے زوال کے زمانے میں سب سے اہم تحریک جو وجود میں آئی اس کا تعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی، اقتصادی اور سماجی زندگی پر اس نے دور رس اثر مرتب کیا۔ شاہ ولی اللہ کی وفات کے تقریباً پچاس برس بعد وہابی تحریک

کا آغاز ہوا۔ ایک طرف اس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں نئی روح داخل کرنا تھا اور دوسری طرف اس نے برطانی سامراج کی عملی مخالفت کا انداز اختیار کیا۔ اس کے علاوہ بنگال میں فرائضی تحریک پھیلی۔ درحقیقت یہ ایک عوامی، زرعی تحریک تھی۔ اس کا مقصد کسانوں کے مفاد کا تحفظ اور زمیندارانہ آمریت کے خلاف جنگ آزمائی تھا۔ ان تمام تحریکوں سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ہندستانی آبادی کے تمام دوسرے حصوں کی طرح مُسلمانوں میں بھی بے چینی تھی۔ اور اس طرح ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کے لیے زمین ہموار ہو رہی تھی۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کے بعد مغرب کی مادی برتری قائم ہوگئی تھی اور زندگی کے اس نئے نظام کے مادی اہم خصوصیات ظاہر تھے جو برِ صغیر پر تقریباً ایک صدی سے منڈلا رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو اس انقلابی تحریک نے لوگوں کو ان کی کمزوریوں کا، مُردہ دلی کا، عیش و عشرت کی دلدادگی اور عملی زندگی سے فراریت کا احساس کرایا۔

علی گڑھ تحریک: علی گڑھ تحریک کی تکمیلی شکل ۱۸۷۰ء کے بعد سامنے آتی ہے ۱۸۸۴/۸۵ء تک اس کے مثبت و مفید پہلو اُبھرتے رہے۔ تحریک پھیلی اور اس نے مُسلمانوں میں ہندستان کے عام دورِ بیداری کو وسیع تر اور مضبوط بنایا۔ جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ مذہبی اور سماجی اصلاح کے لیے ذہنوں کو تیار کیا۔ ہندستان کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی زبانوں اور ادب کو فروغ دیں۔ اور زندگی کی جدّوجہد میں حوصلہ مندی کے ساتھ شریک ہوں۔ اس تحریک نے جاگیردارانہ تصوّرِ حیات سے مسلمانوں کو جدید صنعتی دور کی طرف متوجّہ کیا۔ اس تحریک کا ایک رُخ ہندو مسلم اور مسیحی فرقوں میں مفاہمت کی اسپرٹ پیدا کرنا بھی تھا۔ ۱۸۸۴ء میں سر سیّد نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا۔

"صدیوں سے ہندو مُسلمان یہاں آباد ہیں چند سال سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم (انگریز) بھی یہاں آباد ہو۔

اب یہ تینوں کا ملک ہے۔" (۱)

'سرسید تحریک' کے علاوہ قومی خدمت کا جذبہ بعض اور تحریکوں میں بھی ملتا ہے انفرادی اور اجتماعی طور پر جنوبی اور شمالی ہند میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ۔مثلاً اس احساس کی جماعتی شکلیں برٹش انڈیا سوسائٹی ۱۸۴۳ء۔بمبئی ایسوسی ایشن ۱۸۵۰ء برٹش انڈیا ایسوسی ایشن ۱۸۵۱ء، بنگال نیشنل لیگ، انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ سارو جنک سبھا پونا ۱۸۷۵ء نیٹو ایسوسی ایشن مدراس، مہاجن سبھا مدراس ۱۸۸۴ء وغیرہ میں ملتی ہیں ۔ دوسری طرف پریس اور لٹریچر میں قومی جذبات کا اظہار ہوتا رہا ہے قومی احساس کی تشکیل ہوتی رہی ہے۔اس جذبہ کی ہمہ گیر سیاسی صورت آل انڈیا کانگریس کو کہا جائے گا۔ یہ نیشنلزم کا نمایاں ثبوت تھا۔

علی گڑھ تحریک کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں میں تنظیمی عمل کی ضرورت کا شعور پیدا کیا نیز مشرقی اور مغربی کلچر کے امتزاج کی کوشش۔ اس تحریک نے ملک کے تعلیمی نظام میں مذہبی تعلیم اور مذہب کی اہمیت پر زور دیا مذہب سے سرسید کا مطلب ان اعمال، رسوم اور عبادات سے نہیں تھا جو کسی مخصوص مذہب کی خصوصیات ہیں بلکہ اصلی مذہبی اسپرٹ جو لوگوں کو روادار اور انسانوں پر مہربان ہونا سکھاتی ہے۔ وفاداری، رواداری اور فراخ دلی، علی گڑھ تحریک کے مخصوص کردار رہے ہیں۔ تحریک کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ وسیع معنوں میں تعلیمی تحریک تھی اس کا مقصد صرف علوم اور ان کی معلومات بہم پہنچانا نہ تھا بلکہ مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنا تھا۔ان کے کلچر کی اصلاح اور کلچر کو نئی زندگی دینا تھا۔

علی گڑھ تحریک ہندستان کے تاریخی اور سماجی ارتقا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید کے اخبار تہذیب الاخلاق کے مضامین، ڈاکٹر نذیر احمد کے

---

(۱) علی گڑھ میگزین (علی گڑھ تحریک نمبر) مقالہ احتشام حسین ۱۹۵۳،۵۴ء ص ۳۲

ناول، خواجہ الطاف حسین حالی کی نظمیں اور تنقیدی بصیرت محسن الملک، ذکاء اللہ چراغ علی، وقار الملک، سید علی بلگرامی اور شبلی نعمانی وغیرہ کے ادبی شہ پارے اور ان کے زیر اثر زندہ، متحرک، ترقی پذیر فضا، اور نئی نسل میں سائنسی شعور پیدا ہو جانا یہ سب علی گڑھ تحریک کی دین تھا۔ اسی دورِ بیداری نے حقیقت پسندی، صحت مند اسلوبِ بیان، ادب اور زندگی کے قریبی رشتے پر زور دے کر ادب کو صحت مند اور جاندار بنایا۔ سرسید کا عظیم کارنامہ یہی ہے کہ نئی نسل کو عقلیت اور جدیدیت کی طرف راغب کیا۔

(ب) نئے رجحانات

اُردو پر مغربی ادب کے اثرات

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی پیدائش سے تقریباً پانچ برس پہلے یعنی ۱۸۳۹ء کے لگ بھگ ہندوستان، برطانوی حکومت کے زیر نگیں آچکا تھا۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں کسان طبقے پر ناقابل برداشت ٹیکس عائد کر دیے تھے۔ یہاں کی جنتا پر دہرے نظام کا بوجھ مسلط تھا۔ ایک طرف مقامی جاگیردارانہ نظام کے عامل اور دوسری طرف نوآدیاتی نظام کے حکمرانوں کا بار زوال آمادہ اقتصادیات پر پڑ رہا تھا۔

برطانیہ نے ہندستانی سماج کے پورے تانے بانے توڑ دیے تھے۔ ابھی تک نئی زندگی کی تعمیرِ نو کے نشانات واضح طور پر نظر نہیں آرہے تھے۔ پرانی دنیا ختم ہو رہی تھی نئی دنیا کی برکتیں نازل نہیں ہونے پائی تھیں۔ اس صورتِ حال نے ہندستانی مزاج میں ایک قسم کی قنوطیت پیدا کر دی تھی جو موجودہ حالِ زار میں ایک اضافہ تھا۔ یہ ایک خطِ تنسیخ تھا جس نے برطانی ہندستان کو اس کی تمام

قدیم روایتوں اور اس کی پرانی تاریخ سے الگ کر دیا تھا۔

ان تمام حالات اور ذہنی بے چینی کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں ایک مرتبہ تمام منتشر قوتیں یکجا ہو گئیں اور اپنی مرضی کے مطابق ہندستان کا نقشا بنانے کے لیے عملی جدوجہد شروع کر دی۔ عوام کی بے چینی کا پیمانہ ہندستانی فوج کے جذبات اور ان کی جنگِ آزادی میں نظر آیا۔ ہندستانی سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں اپنے یورپین افسروں کو قتل کیا۔ ہندو اور مسلمانوں نے اپنے مشترکہ نفرت خیز مالک کے مقابلے میں محاذ قائم کر لیا۔ اس جدوجہد میں چند علاقوں کا نقشا نہ تھا بلکہ تقریباً پورا شمالی ہندستان آزادی کی لگن کا شعلہ بن گیا تھا۔ اگرچہ پہلی جنگِ آزادی ناکامی کی صورت میں ختم ہوئی اور برطانوی اقتدار کا تسلط مستحکم مگر اس سیاسی شکست کا نتیجہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں ہوا۔

سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ہندستان کی معاشی زندگی نہیں بدلی تھی بلکہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک پرانے ڈھانچے کے سہارے چلتی رہی تھی گھریلو صنعت اور چرخے کی دین مستقل طور پر کروڑوں سوت کاتنے والے اور کپڑا بننے والے تھے۔ ہندستانی سوسائٹی کی ساخت کا اصلاً یہی مرکزی عنصر تھے

انگلستان کا صنعتی انقلاب: انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ہندستان پر گہرا اثر ڈالا۔ دُخانی انجن اور کپڑے کی کلیں ایجاد ہونے نیز سائنسی اور صنعتی ترقی نے ہندستان کی سماجی سطح کو بالکل پلٹ دیا۔ سب سے زیادہ واضح اثر یہ ہوا کہ زراعت اور دیہی صنعتوں کے بیچ کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ لنکا شائر میں کپڑوں کی کلوں کے عمل نے عجیب صورت حال پیدا کر دی۔ مشینیں انگلینڈ میں تھیں اور کپڑا بننے والے بنگال میں رہ گئے یا یہ سمجھ لیجیے کہ سوت کاتنے والے اور کپڑا بننے والے دونوں طبقے تباہ ہو گئے۔ ان کی اقتصادی بنیاد کا خاتمہ کر کے ان طبقوں کی زندگی کو تباہ کر دیا لیکن تاریخ کا فیصلہ یہ نتیجہ بھی نکالے گا کہ اس پیمانے کی

تہذیب ختم ہونے سے ایک بڑے انقلاب کو دعوت دی گئی۔ سچ پوچھیے تو یہ تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ ایشیا میں یہ ایک واحد سماجی انقلاب تھا جس کی نظیر سے تاریخ کے اوراق خالی نظر آتے ہیں۔

اس سماجی انقلاب کے معرضِ وجود میں آنے پر بحث کی گنجایش رہتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس انقلاب کے پیدا کرنے میں برطانوی حکمرانوں کی نیت کو دخل نہ تھا یا انھوں نے اپنے سیاسی، ذاتی، مالی مفاد کے مصالح کی بنا پر زبردستی ہندستان کے بنیادی تہذیبی عناصر کو ختم کر کے انگلینڈ کو سنہرا دیس بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ تمام دلیلیں اگر حقیقت کا روپ اختیار کر کے ہمیں اعتراف پر مجبور بھی کر دیں تب بھی نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا یعنی ہندستان میں "سماجی انقلاب" برطانی دور میں ہوا۔ تاریخ اس کی معتبر شہادت ہے۔

کارل مارکس نے اس سماجی انقلاب پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"انگلینڈ کو خواہ کتنے ہی جرموں کا مرتکب قرار دیا جائے لیکن اس انقلاب کے برپا کرنے میں وہی تاریخ کا غیر شعوری آلہ تھا۔" (۱)

"Whatever may have been the crimes of England she was the unconscious tool of history in bringing about that Revolution."

اس سماجی انقلاب کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی ہونے لگا کہیں تیز رفتاری سے اور کہیں سست گامی کے ساتھ۔ اس دور کی اہم ترین خصوصیات

---

(۱) The First Indian War of Independence, K. Marx and F. Engels, 1857-1859, p. 21

ہیں مذہب، تعلیم اور ادب شامل ہیں۔ مذہب پر یہاں قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں، تعلیم پر مختصر طور پر لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ادب کے سلسلے میں قدرے تفصیل سے لکھا جائے گا۔

جدید تعلیم

مغربی تعلیم اور مشرقی تعلیم میں بہت فرق تھا۔ دونوں میں علم کا رویہ اور تحقیق کا مقصد ایک سا نہ تھا۔ مغربی تعلیم میں ایک آزاد سوسائٹی کا عمل کارفرما تھا جو کسی مخصوص طبقے سے متعلق نہ تھا مگر مشرقی تعلیم تنگی کے ساتھ مخصوص طبقات تک محدود تھی۔ اسی وجہ سے ہندستانیوں نے مغربی تعلیم کو پیچ و تاب کے ساتھ قبول کیا۔ ہندستانیوں کو مغربی تعلیم سے بہرہ یاب کرنے کی ان تھک کوششوں میں راجا رام موہن رائے، ڈیوڈ ہیرے اور سر سید احمد خاں کا ہاتھ تھا۔ مشنریوں اور انفرادی طور پر کھولے گئے اسکولوں کے علاوہ سب سے زیادہ واضح نشان "کلکتہ مدرسہ" کا قیام ہے جس کو ۱۷۸۱ء میں وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا۔ ۱۷۹۱ء میں جوناتھن ڈنکن نے "بنارس سنسکرت کالج" کھولا۔ اس کے بعد ولزلی نے ۱۸۰۰ء میں "فورٹ ولیم کالج" قائم کیا۔ ۱۸۱۷ء میں "ہندو کالج" کا افتتاح ہوا راجا رام موہن رائے نے ۱۷-۱۸۱۶ء میں اپنے صرفے سے ایک انگریزی اسکول کھولا تھا۔ اس اسکول میں ان کے بیٹے رام پرساد نے تعلیم پائی اور رائے کے دوست مہارشی دوارکا ناتھ ٹیگور کے بیٹے دیبندر ناتھ ٹیگور نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۱۹ء میں کلکتہ اسکول سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس نے ابتدائی اسکول کھولنے اور استادوں کی تربیت کا کام شروع کیا۔ ۱۸۲۳ء میں حکومت کی جانب سے مالی امداد بھی دی گئی۔

ولیم بینٹنگ کے عہد میں میکالے نے انگریزی کی پُرزور حمایت کی اس زمانے میں انگریزی تعلیم کا رجحان بہت بڑھ گیا۔ ہندستانی نوجوانوں نے ایک

کمیٹی کو ایک درخواست پیش کی تھی جس میں سنسکرت کالج کی بدحالی کا ذکر کیا گیا تھا۔ اسکول بک سوسائٹی کی شائع شدہ ۳۱ ہزار انگریزی کتابیں دو سال میں فروخت ہوئیں۔ اس کے مقابلے میں سنسکرت اور عربی کی کتابیں تین برس میں اتنی بھی فروخت نہ ہو سکیں کہ کتاب گھر کے دو ماہ کے اخراجات ادا کیے جا سکیں۔ چھپائی کے حرفے کا مذکور ہی کیا۔" (۱)

بنارس کے سنسکرت کالج میں انگریزی کلاس کھولے گئے۔ اس کے علاوہ ۱۸۲۴ء میں آگرہ، ۲۵-۱۸۲۴ء میں دہلی، ۱۸۲۷ء میں بریلی کالج قائم ہوئے ۱۸۳۵ء سے پہلے ان میں انگریزی پڑھائی جانے لگی تھی۔ مزید برآں گورکھپور سے اجمیر تک چودہ انگریزی اسکولوں کا سلسلہ پھیلا دیا گیا تھا۔ ہندوستانیوں کی انگریزی تعلیم سے وابستگی کا ایک تاریخی واقعہ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

"A petition was submitted to parliament by four thousand Indians requesting the Government to make English compulsory for civil services. The Select Committee of the House of Commons suggested in 1832 that proficiency in English may be required as a qualification for services." (2)

اردو ترجمہ

چار ہزار ہندوستانیوں کی طرف سے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی

---

(1) Trevelyan, C.E., on the Education of the people of India (London 1838) p.9

(2) P. 197

گئی جس میں حکومت سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی زبان (کی واقفیت) لازمی قرار دی جائے۔

دارالعوام کی مجلس انتخاب (سلیکٹ کمیٹی) نے ۱۸۳۲ء میں تجویز کیا کہ انگریزی زبان کی استعداد ملازمتوں کے لیے لازمی قرار دی جاسکتی ہے۔

ہندستان میں مسیحی افراد نے لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ کی (Mrs. Hannah Marsh man) مسز ہنا مارش مین نے لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول سیرام پور میں کھولا اور دوسرا اسکول کلکتہ میں قائم کیا۔

انگریزی تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ مسلمانوں نے اس کو بہت مدت گزار کر قبول کیا۔ ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں اینگلو اورنٹیل کالج کھلا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں برطانوی حکومت نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ذریعے ایسا تعلیمی نظام جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو انگریزی نمونے کا تھا جس میں مغربی سائنس، آرٹ، تاریخ، فلسفہ اور ادب کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے دی جائے رفتہ رفتہ اس پر عمل ہوا انفرادی طور پر اس سے پہلے بھی کام ہو رہا تھا ملک میں تعلیم کے لیے انگریزی زبان لازمی قرار دیے جانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مغرب کی ادبی تحریکوں سے جان کاری ہو گئی۔ انگریزی ترجمے ہونے لگے جس کے باعث مغرب کے شاہکاروں سے اردو ادب کو فیض پہنچا۔

اخبار و رسائل کا اجرا اور ان کا اثر

ہندستان میں انگریزی جدید تعلیم کے ساتھ پریس کے قیام اور پھیلاؤ نے اہم رول ادا کیا اخبار و رسائل کا اجرا ہونے لگا اس سے ایک طرف رائے عامہ متاثر ہوئی اور دوسری طرف ملک کی دیسی زبانوں پر مغرب کے گہرے اثرات پڑے۔ اس لیے چند اخبار و رسائل کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم اور مغربی ادب کے اثرات کو سب سے

پہلے بنگال نے قبول کیا۔ ۱۷۸۰ء میں ہکی (J.A.Hicky) نے ہفتہ وار بنگال گزٹ نکالا اس کو کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر بھی کہا جاتا تھا۔ اور عام طور پر وہ ہکی کے گزٹ کے نام سے معروف تھا۔ ۱۸۱۶ء میں گنگا دھر بھٹاچاریہ اور ہرچند رائے نے کلکتہ سے بنگالی گزٹ جاری کیا۔ ۱۸۱۸ء میں پہلا بنگالی ماہ نامہ ڈگ درشن نکلا۔ اس میں سائنسی، تاریخی اور ادبی مضامین چھپتے تھے۔ یہ ماہ نامہ انگریزی اور بنگالی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ صحافت کے میدان میں تاراچند دت اور بھوانی چرن بندوپادھیائے کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخرالذکر نے سمبند کومودی (بنگالی ہفت روزہ) کو مرتب کرنے کی ذمہ داری لی۔ اس کا پہلا شمارہ ۴؍ دسمبر ۱۸۲۱ء کو نکلا۔ رام موہن رائے اس ہفتہ وار میں پابندی سے مضامین لکھتے تھے۔

آزاد خیال صحیفوں میں بنگال ہیرالڈ قابلِ ذکر ہے جس کا پہلا شمارہ ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انگریزی، فارسی، ہندی اور بنگالی چار زبانوں میں مضامین چھپتے تھے۔ اس پرچے کے حامیوں میں مارٹن، دوارکا ناتھ ٹیگور پرسنا کمار ٹیگور، اور رام موہن رائے وغیرہ شامل تھے۔

فارسی اخباروں میں رام موہن رائے کے مراۃ الاخبار کا ذکر ضروری ہے۔ ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا۔ دوسرا فارسی اخبار جامِ جہاں نما تھا جس کو منشی سدا سکھ ایڈٹ کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس کی چند برس سرپرستی کی تھی۔ اس اخبار کے فارسی ایڈیشن کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ جامِ جہاں نما کے نام سے چھپتا تھا۔ اس اخبار میں خبروں اور مضامین کے علاوہ فارسی اور انگریزی کتابوں کے ترجمے اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۸۲۳ء میں زبدۃ الاخبار جاری ہوا۔ منشی رام ٹھاکر اور ماتھر موہن نے اسی برس شمس الاخبار نکالا۔ ۱۸۲۶ء میں کرسچین مشن سیرام پور کی جانب سے سیرام پور اخبار کا اجرا ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں آئینہ سکندر اور ۱۸۳۳ء میں ماہِ عالم افروز جاری ہوا جس کو سراج الدین ایڈٹ کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں رجب علی لکھنوی نے سلطان الاخبار شائع کیا۔ ۱۸۴۱ء میں مہرِ منیر اور سراج الاخبار

جاری ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں احسن الاخبار کا اجرا ہوا۔

ہندی میں پہلا اخبار ۱۸۲۶ء میں ادنت مرتنڈ نکلا۔ اس کو کانپور کے پنڈت جگل کشور شکلا نے شائع کیا تھا۔

اردو اخباروں میں آگرہ اخبار، دہلی اخبار، سید الاخبار، صادق الاخبار کریم الاخبار، اسد الاخبار، بنارس اخبار، آفتابِ ہند اور کوہ نور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں باغ و بہار بنارس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طِب اور اسٹرانومی پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ دوا ردو ماہ نامے قران السعدین اور فوائد الناظرین یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ یہ مطلع العلوم پریس دہلی سے شائع ہوتے تھے۔

شمالی ہند کے چند اخباروں کا ذکر بھی ضروری ہے اس لیے کہ انھوں نے صوبۂ دہلی اور اُتر پردیش میں انگریزی خیالات کے پھیلانے میں خاصا رول ادا کیا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں کانپور ایڈورٹائزر شائع ہوا۔ ۱۸۲۸ء میں اوم نی بس نکلا ۱۸۳۵ء میں میرٹھ سے یونیورسل میگزین شائع ہوا۔ ۱۸۳۳ء میں دہلی سے انگریزی ہفتہ وار دہلی گزٹ کا اجرا ہوا۔ ۱۸۳۸ء میں دہلی ایڈورٹائزر نکلا جو ۱۸۵۶ء میں انڈین ٹائمز کے نام سے چھپنے لگا۔ بنارس سے رپورٹر جاری ہوا۔ مختصر یہ کہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان سَو سے زیادہ اخبار جاری ہوئے اور ۱۹۰۰ء میں شمالی مغربی سوبے (اُتر پردیش) میں جریدوں کی تعداد ۱۰۹ تک پہنچ گئی۔ جن میں ۷۰ اردو ۳۲ ہندی اور دو ہندی اردو دونوں زبانوں میں چھپنے والے تھے۔

وکٹورین عہد میں دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے سرکاری طور پر کوشش کی گئی تھی۔ اس سے ہندستان کی دیسی زبانوں کو صوبائی حدوں میں فروغ بلا۔ ادھر ملک میں انگریزی کالجوں کا قیام ایک طرح دُہری برکت ثابت ہوا۔ کچھ اخبار و رسائل کے ذریعے اور زیادہ تر مشہور مغربی شخصیتوں کے فیض سے ہندستانی شاعروں اور ادیبوں کے ذہن بدلے۔ انھوں نے مغربی ادب سے استفادہ کرکے اپنی اپنی زبانوں کو مغربی ادب کی قدروں سے زیادہ حقیقت پسند، زندگی سے قریب

اور حسین بنا دیا۔ اس موقع پر بعض اہم اداروں اور شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے۔

فورٹ ولیم کالج

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۴ر ساون سمت اور ۱۷ر صفر ۱۲۱۵ھ کو گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل ڈالی[1] اس کالج نے اردو زبان و ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ کالج کے نصاب میں مشرقی اور مغربی بیشتر علوم کو شامل کیا گیا تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے نصاب کا حسبِ ذیل خاکہ پیش کیا ہے۔[2]

(مشرقی) زبانیں —	عربی، فارسی، سنسکرت، ہندستانی، بنگلہ، تلنگی، مرہٹی اور تامل
قوانین	اسلامی فقہ، ہندو دھرم شاستر، علم الاخلاق، علم قوانین، قوانین اقوام (بین الاقوامی قوانین) قانون انگلستان، گورنر جنرل کی کونسل، قلعہ سینٹ جارج اور بمبئی پریسیڈنسی کی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین۔
(تجارتی کاروبار)	معاشیات، تجارتی اداروں خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد (کی تعلیم) جغرافیہ اور علم الحساب
یوروپ کی جدید زبانیں۔	یونانی، لاطینی، اور انگریزی کلاسکی ادب
(تاریخ)	قدیم و جدید تاریخ (عالم) ہندستان و دکن کی قدیم و جدید تاریخ اور طبعی تاریخ
(سائنس)	علم نباتات، علم کیمیا اور علم نجوم

اس کالج میں چھ پروفیسروں کا تقرر عمل میں آیا

جان بیلے (John Bailie) اور ولیم پیٹ رک (W. Kirk Patrick) عربی زبان اور اسلامی فقہ کا درس دینے کے لیے مقرر ہوئے۔

---

(۱) گل کرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، ص ۱۳۔ (۲) ص ۱۳۸،

فارسی زبان و ادب کے شعبے فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin)
اور ایڈمانسٹن N. B. Edmanstone کے سپرد تھے۔
ہندستانی زبانوں کی تدریس کا کام گلکرسٹ کے ذمے تھا۔
جان بارلو (G.H. Barlow) ہندستان کے برطانوی مقبوضات
کے لیے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے نافذ کردہ قوانین کی تعلیم
دینے پر تعینات کیے گئے۔
یونانی، لاطینی، اور انگریزی کلاسکی ادب کے درس و تدریس کی ذمہ
داری پادری بکھانن (Rev. Buchanan) کے سپرد تھی۔
گورنر جنرل نے کالج کے انتظامی امور کے لیے ایک کونسل بنائی تھی
جو حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی۔
پادری ڈیوڈ براؤن پرووسٹ (پرنسپل)، پادری بکھانن وائس
پرووسٹ، جج بارلو، ایڈمانسٹن اور کرک پیٹرک اس کونسل کے
ممبر تھے۔

کالج کے ہندستانی شعبہ میں چودہ منشیوں کا تقرر کیا گیا تھا۔ چیف منشی میر بہادر علی حسینی تھے۔ اور سکنڈ منشی تارنی چرن مِتر تھے۔ اول الذکر کو دو سو روپے ماہوار اور آخر الذکر کو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ باقی تمام منشی چالیس روپے ماہانہ کی تنخواہ پر مقرر ہوئے تھے۔ منشیوں میں مرتضیٰ خاں، غلام اکبر، نصیر اللہ، میر امین، غلام اشرف، ہلال الدین، محمد صادق، رحمت اللہ خاں، غلام غوث، کندن لال، کاشی راج اور میر حیدر بخش حیدری شامل تھے۔ ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو محمد صادق، رحمت اللہ خاں کاشی راج اور غلام غوث کی جگہ سید جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی خاں کا تقرر کیا گیا۔ ۷ر جون ۱۸۰۲ء کو ہندوستانی شعبہ میں میر شیر علی، کاظم علی جوان، مظہر علی خاں، سری (للو) لال کب بھاکا منشی اور محمد (مہانند) ناگری نویس کے ناموں کا اضافہ ہوا۔

فورٹ ولیم کالج نے فارسی اور سنسکرت کتابوں کے اردو ترجمے کرانے اور انھیں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ کالج کے ہندستانی شعبہ کے مصنفین اس کام کو انجام دیتے تھے اس کے علاوہ دوسرے ہندستانی مصنفین بھی جو کالج کے شعبہ سے متعلق نہ تھے ان کو بھی ترجمے کا کام دیا جاتا تھا۔ ترجمے کے فن کو فروغ دینے اور معیاری کتابیں اردو میں منتقل کرنے کے لیے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی خاطر ان کی تصانیف پر انعامات دینے کا دستور بھی تھا۔

گِل کرسٹ: فورٹ ولیم کالج کی اہم شخصیت اور اردو نثر کے محسن ڈاکٹر گِل کرسٹ کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ لکھنا ضروری ہے موصوف کی پیدائش ۱۷۵۹ء میں ایڈنبرا میں ہوئی۔ نسلاً وہ اسکاٹش تھے۔ ہندستان میں مختلف ملازمتوں کے بعد وہ کالج سے وابستہ ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی، پالیسی یہ تھی کہ اپنے کارکنوں کو فارسی سکھانے پر زور دیا جاتا تھا تاکہ انھیں کام چلاؤ فارسی آجائے۔ اس وقت فارسی ہی درباری زبان تھی۔ گِل کرسٹ کی لگن اور عمل قابلِ حیرت ہیں۔ انھوں نے ہندستانی لباس پہن کر اُن صوبوں کا سفر کیا جہاں ہندستانی خالص طور پر بولی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ سنسکرت، فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کا علم حاصل کیا۔ اس کامیابی کو دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں ایک نئی روح بیدار ہو گئی اور ہندستانی کا مطالعہ مقبول ہو گیا۔ گِل کرسٹ نے ہندستانی زبان کو مقبول بنانے کے لیے خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی کتابیں لکھوائیں۔

گِل کرسٹ نے ایک انگریزی ہندوستانی لغت دو حصوں میں مرتب کیا۔ پہلا حصہ ۱۷۸۶ء میں اور دوسرا حصہ ۱۷۹۰ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں لغت کا مکمل ایڈیشن اڈنبرا سے شائع ہوا۔ گِل کرسٹ کی دوسری تالیف "ہندوستانی زبان کے قواعد" ہے جو ۱۷۹۶ء میں کلکتے سے چھپی تھی۔ اس میں ہندستانی شعرا کا کلام اور مولف کی عبارتِ نثر، اردو رسم خط میں درج ہے۔ شکسپیر کے

ڈراموں کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ اردو زبان اور اردو رسم خط میں ملتا ہے۔ گل کرسٹ نے قواعد و لغت پر ایک مقدمہ مرتب کیا اور ۱۷۹۸ء میں بطور ضمیمہ اپنی تیسری کتاب شائع کی۔ اُسی برس اپنی معروف کتاب مشرقی زبان شائع کی جس میں مکالمات قصّے اور نظمیں شامل تھیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی اور اردو غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے انگریزی ترجمے درج ہیں۔

دلّی کالج اور ماسٹر رام چندر

اس کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا۔ مختلف مشرقی علوم کے علاوہ اس کالج نے اردو زبان و ادب کو پھیلانے اور معیار کو بلند کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس کالج میں اردو کے ذریعے سائنس، ہیئت، ریاضی اور نیچرل فلاسفی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس کالج کے بعض تعلیم یافتہ افراد ملک کے مشہور اور ممتاز مصنّفین بن کر چمکے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بیان کیا ہے۔

"تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت مشرق و مغرب کا امتزاج اور وہ سائنسی اور سیکولر نقطۂ نظر جس پر آج ہم زور دے رہے ہیں اور جس کی مدد سے اس زمانے میں ہم اپنی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا اوّلین احساس دلّی کالج ہی نے پیدا کیا۔" (۱)

اہم شخصیتوں میں اِشپرنگر، ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، مملوک علی، صہبائی، شِو نرائن آرام، کریم الدین ضیاء الدین وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں صرف اشپرنگر کی تصانیف کا ذکر ضروری ہے۔

اشپرنگر نے چار کتابیں مرتب کی تھیں۔ انگریزی ہندوستانی قواعد، عربی ادب کا انتخاب، اصطلاحاتِ صوفیہ، اور محمود غزنوی۔ اس کے علاوہ فوائد الناظرین جو

---

(۱) ذوق و جستجو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۹۶۷ء۔ ص ۲۶۰

۱۸۴۵ء میں جاری ہوا اور جس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے دراصل اشپرنگر نے ہی شروع کیا تھا۔

ماسٹر رام چندر: یہ دلی کالج سے وابستہ تھے۔ انگریزی زبان وادب پر قدرت حاصل تھی۔ تنقید، شعروادب، ترجمہ وتاریخ، سیرت وسوانح، مضمون نگاری اور صحافت وغیرہ میں انھوں نے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لیے شمعِ ہدایت بنا۔ رام چندر کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے بول چال کی اردو اور سادہ وسلیس نثر پھیلانے کا کام بڑی مستعدی اور مستقل مزاجی سے کیا ۱۸۴۷ء میں رسالہ خیرخواہ ہند جاری کیا جس کا نام بعد میں 'محبِ ہند' کر دیا گیا تھا۔ یہ رسالہ انگریزی اور یورپی زبانوں کے طرز پر نکالا گیا تھا۔ رام چندر نے اپنے رسالے میں حبُ الوطنی' قوم کی توہم پرستی اور اس کی ترقی۔ کے وسائل و ذرائع پر مضامین لکھے تھے۔ خیرخواہ ہند میں رام چندر کا ایک مضمون مشاعرے پر ملتا ہے۔ جس سے اس دور کے مشاعروں کی کیفیت اور آداب کا پتا چلتا ہے۔ اس مضمون میں اردو شاعری پر تنقید بھی شامل ہے۔ رام چندر نے اپنے رسالے کے ذریعے مغربی ادب کے اثرات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ یوسف خاں کمبل پوش ۱۸۳۷ء میں انگلستان اور فرانس گئے تھے۔ ان کا سفرنامہ تاریخ یوسفی اور عجائبات فرنگ دونوں ناموں سے مشہور ہے۔ رام چندر نے ان کے سفرنامے کے بعض حصے محبِ ہند میں شائع کیے تھے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بیان کیا ہے۔

> "رام چندر نے سرسید سے پہلے مضمون نگاری وصحافت' ذکاء اللہ سے پہلے ترجمہ وتاریخ اور حالی سے پہلے سیرت نگاری شروع کی اور اس طرح ان کی حیثیت چراغِ راہ کی سی ہے۔" (۱)

---

(۱) ذوق وجستجو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ـــ ۱۹۶۷ء ص ۲۷۴۔

رام چندر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مکتوب نویسی کے قدیم ڈھنگ پر سخت اعتراض کیا اور آسان عبارت لکھنے پر زور دیا۔ انھوں نے اردو نثر میں Essay کو رواج دیا۔ (۱)

ہندستان میں نثر و ترجمہ کی اہمیت کو واضح کرنے اس کو معیاری بنانے اور اس کو جدید نقطۂ نظر عطا کرنے کا کام مشنریوں نے کیا۔ انھوں نے جدید بنگالی نثر کی بنیاد ڈالی اور اس کا سہرا کیرے (Carey) کے سر رہا۔

نیلکس کیرے (۱۸۸۲-۱۷۸۶) نے پہلی بنگالی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی۔ جس میں اناٹومی، طِب اور کیمسٹری پر ابواب شامل تھے اور اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی درج کی۔ اردو کا قدیم لغت Maure-French سورت کے مقام پر ۱۷۰۴ء میں مکمل ہوا۔

ولیم ایٹس (۱۸۴۵-۱۷۹۲) نے بنگالی زبان پر دو جلدوں میں تعارف لکھا (INTRODUCTION) ہنری مارٹن جس نے کلکتہ، دیناپور اور کانپور میں ملازمت کی تھی اور جس کی وفات ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ اس نے بائبل کا اردو فارسی اور عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ دوسرے مسیحی مترجمین نے بھی خاصا کام کیا اور اپنے ترجمے کے ذریعے اردو نثر کے عمدہ نمونے پیش کیے۔

اردو نثر پر مغرب کا اثر

انگریزی اثر سے قبل اردو نثر ناپید تھی۔ سب سے پہلی کوشش فضلِ علی فضلیؔ کی کربل کتھا ملتی ہے۔ جو عام طور پر "دہ مجلس" کے نام سے مشہور و معروف ہے یہ کتاب ملّا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدار کا ترجمہ ہے۔ فضلی کی کربل کتھا میں کربلا کے واقعات درج ہیں یہ کتاب ۱۱۴۵ ہجری مطابق ۳۳-۱۷۳۲ء میں

---

(۱) Essay کا اردو ترجمہ، مضمون یا مقالہ کیا گیا ہے مگر ہم اردو میں انگریزی لفظ کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

لکھی گئی۔ اس پر ۱۱۶۱ ہجری مطابق ۴۹-۱۷۴۸ء میں نظر ثانی کی گئی۔ کربل کتھا کے مرتبین مالک رام اور مختار الدین آرزو کا بیان ہے:

"کربل کتھا دہلوی زبان کا اوّلین نقش ہے۔ ابھی تک یہاں اس سے پہلے کوئی ترجمہ شدہ یا مستقل تصنیف نہیں ملی"۔ (۱)

لیکن حافظ محمود شیرانی اور سید سلیمان ندوی نے کربل کتھا سے پہلے کی ایک تصنیف "فقہ ہندی" کی نشان دہی کی ہے جس کا مفصل تعارف ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے رسالہ اردو کراچی میں کرایا عبدی نے فقہ ہندی ۱۷۰۴ء میں اورنگ زیب کے عہد میں لکھا (۲)

مرزا محمد رفیع سودا نے بھی اسی طرح کی کوشش کی ہے۔ سید انشاء اللہ اور مرزا جانِ جاناں نے بھی چند جملے لکھے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو نثر کا نام دینا زیادتی ہے۔ وہ اردو نثر کیا ہے یوں سمجھیے کہ انڈو پرشین ٹائپ کی ایک شے ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک اردو نثر صحیح معنوں میں نثر نہ تھی۔

جدید اردو نثر کی ابتدا اصلاً فورٹ ولیم کالج سے ہوئی گل کرسٹ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تعداد ۳۶ تھی۔ ہندوستانی مصنفین جو کالج کے ملازم نہیں تھے گل کرسٹ نے کالج کے ہندستانی شعبے کے لیے ان سے بھی کتابیں لکھوائی تھیں۔ کالج کونسل نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو حسبِ ذیل ہندستانی مصنفین کو انعام دینے کا فیصلہ کیا۔

حاجی مرزا مغل کو بوستاں کے ترجمے پر چار سو روپے انعام ملا۔
کندن لال کو کلا کام پر سو روپے۔ غلام حیدر کو گل دہرمز پر سو روپے

---

(۱) کربل کتھا اکتوبر ۱۹۶۵ء پٹنہ۔ ص ۲۴

(۲) رسالہ اردو کراچی اکتوبر ۱۹۵۹۔ ص ۵۵-۱۰۱

نہال چند لاہوری کو گل بکاؤلی پر سو روپے اور محمد بخش کو قصۂ فیروز شاہ پر سو روپے کا انعام ملا۔

اس دور کی اہم کتاب میر امّن کی باغ و بہار ہے۔ اس کا پہلا نام چار درویش ہے۔ میر امّن نے اس کا تاریخی نام باغ و بہار رکھا۔ محمد عتیق صدیقی نے بیان کیا ہے۔

"باغ و بہار کے اعداد اور خود میر امّن کے بیان کے مطابق اس کا سن تالیف ۱۲۱۷ ہجری مطابق ۱۸۰۲ء ہے۔" (۱)

میر امّن نے باغ و بہار کو سادہ اور دلنشیں طرز میں لکھا ہے۔ ان کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔ حفیظ الدین نے ابو الفضل کی عیار دانش کا ترجمہ خرد افروز کے نام سے کیا۔ مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں گلشنِ ہند ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ ہے جس میں ابتدا سے اٹھارویں صدی کے ختم تک کے شعرا کا حال درج ہے۔ اس کی بنیاد علی ابراہیم خاں کا فارسی تذکرہ گلزارِ ہند ہے۔ ۱۸۰۱ء میں محمد حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی لکھی۔ میر بہادر علی حسینی نے مثنوی سحر البیان کو اردو نثر میں منتقل کیا۔ مفتی تاج الدین کی مفرح القلوب کو ہندستانی میں منتقل کیا جس کا نام اخلاقِ ہندی رکھا۔ ۱۸۰۲ء میں نثر بے نظیر لکھی۔ میر لندنی یعنی میر حسن علی Addiscambe میں اردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے گولڈ اسمتھ کے ناول Vicar of Wakefield کے ایک باب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان ترجموں کے بعد اردو نثر کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ نثر نگاری کے لیے نئے فارم وجود میں آئے جیسے Essay، لیکچر، سوانح، ریویو، مثالیہ یا مجازیہ ادبی سیرت نگاری اور تاریخ و تنقید وغیرہ۔ چند مصنفین کے ناموں کا اشارہ کافی ہوگا۔ مثلاً تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید، محسن الملک اور سید چراغ علی کے مضامین شائع ہوئے۔ ماسٹر رام چندر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

---

(۱) گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ ص ۱۵۲

انفرادی احساس و شعور کو ابھارنے میں مرزا غالب کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انھوں نے مغرب کی آنچ کو غالباً سب سے پہلے محسوس کیا اور اس کا اظہار اپنی شاعری میں رمزیہ انداز میں کیا۔ لیکن نثر میں انھوں نے فطری طرز کی طرف واضح طور پر رہ نمائی کی۔ انھوں نے مکتوب نویسی کو ایک ادبی فن کی حیثیت دی رقعاتِ غالب نثر میں ایک نئی طرز کی داغ بیل ہیں "جو بولو وہ لکھو" کا اطلاق ان رقعات میں اپنائے ہوئے اسلوبِ بیان پر ہوتا ہے لیکن "برجستگی اور معنی خیز اختصار" نہایت اہم خصوصیات میں شامل ہیں۔ اس طرح مرزا نے جاندار ادبی تحریر کے نمونے پیش کیے۔ ۱۸۶۹ء میں مرزا کا انتقال ہوا۔ اس وقت یہ طرز نہایت پسندیدہ اور قابلِ قدر تسلیم کی گئی۔ اس کے بعد اس کا رواج نہایت شدت کے ساتھ ہوا۔

لیکچروں میں سر سید اور ڈاکٹر نذیر احمد کے لیکچر قابلِ ذکر ہیں۔ سوانح میں شبلی کی الفاروق اور عبدالحلیم شرر کی حسن بن صباح اہم ہیں۔ ریویو کا بہتر نمونہ مخزن لاہور، دلگداز لکھنؤ، ادیب الہ آباد اور اردو اورنگ آباد میں ملتا ہے۔ مثالیہ یا مجازیہ میں محمد حسین آزاد کی نیرنگِ خیال نہایت عمدہ اور اہم ہے۔ سیرت نگاری میں حالی کی حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب وغیرہ۔ تاریخ میں مولوی ذکاء اللہ کی تاریخِ ہند کی چھ جلدیں اور شبلی کی شعر العجم کی جلدیں قابلِ توجہ ہیں۔

ان موضوعات کے علاوہ انگریزی ناول کا بھی اردو نثر پر اثر پڑا۔ جدید ناول کے تصور تک پہنچنے والا پہلا نام یا پہلی کوشش پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" ہے۔ یہ ناول اودھ اخبار میں قسط وار دسمبر ۱۸۷۸ء اور دسمبر ۱۸۷۹ء میں چھپا تھا۔ طرزِ تحریر کی سادگی اور اسلوب کی دلکشی اور سماجی زندگی کی عکاسی اور ماحول کے آداب کی ترجمانی میں یہ ناول پہلے کی کہانیوں پر ایک ترقی یافتہ قدم ہے۔ اس دور میں سماجی اور تاریخی ناول لکھے گئے جن میں ڈاکٹر نذیر احمد عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور مرزا محمد ہادی رسوا کے نام نمایاں ہیں۔ ناول نویسی

سے اردو نثر کے اظہار میں وسعت پیدا ہوئی۔ اردو نثر کو نیا آب و رنگ ملا۔ اس کے ساتھ ڈراما لکھنے کا رواج شروع ہوا جس سے اردو نثر کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

مغربی ادب کا سب سے زیادہ انفرادی اور مفید اثر تنقید کو کہا جائے گا۔ سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے ادیبوں اور شاعروں میں تنقید کا شعور پیدا کیا۔ سر سید نے تہذیب الاخلاق کو انگلینڈ کے جریدوں "اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر" کے انداز پر چلایا جو اڈیسن اور اسٹیل کی ذہنی بالیدگی کا نتیجہ تھے۔ تہذیب الاخلاق نے ادب قدیم کے تصنع اور عدم خلوص کو بے نقاب کیا۔ تہذیب الاخلاق کی ادبی و تنقیدی روایتوں کو مقدمۂ حالی اور شعر العجم نے آگے بڑھایا۔

مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ جمہوریت، سیاسی آزادی، سماجی آزادی اور مساوات، مذہبی رواداری اور آزادیٔ ضمیر، ادبی فرسودہ روایت سے آزادی اور ذہنی بندھن سے نجات، یہ تمام برکتیں کسی نہ کسی شکل میں انگلینڈ سے ہندستان میں داخل ہوئیں اور ان سے ہمارے نثری سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

اردو نظم پر مغرب کا اثر

اردو میں ترجمہ کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ مثلاً سید احمد علی نے روضۃ الشہدا کا منظوم ترجمہ کیا۔ کربل کتھا کے مرتبین مالک رام اور مختار الدین آرزو کا بیان ہے۔

"سید احمد علی کا کیا ہوا ایک اور منظوم ترجمہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں ہے اس کا سالِ تصنیف ۱۱۸۲ھ ہجری ہے۔" (۱)

(۱) کربل کتھا ص ۹۔

اٹھارویں صدی سے ہندستانیوں نے انگریزی زبان وادب پر توجہ کرنی شروع کردی تھی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ذوقِ جستجو میں بیان کیا ہے:

"مہاراجہ اپورو کرشن بہادر دہلی کے درباری شاعر، انگریزی سے
واقف اور ہیمبرگ اکادمی کے ممبر تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۸ء میں
اپنی ایک فارسی نظم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔"

ماسٹر رام چندر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایک اور نام بھارتندو ہریش چندر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ انھیں جدید ہندی تحریک کا بانی قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے ہندی زبان میں قرآن شریف پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا، لیکن یہاں ان کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ وہ اردو میں رساؔ تخلص کرتے تھے۔ اردو زبان میں انھوں نے نظمیں لکھی ہیں اور ۱۸۶۶ء میں بنارس میں انھوں نے ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا تھا۔

اردو زبان وادب پر مغربی ادب کے اثرات تلاش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو زبان ادب نے مغرب کے اثر کو یکایک کسی کمتری کے احساس یا حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس قبول واخذ کا فطری عمل ہمارے ادب میں مستقل طور پر جاری رہا ہے جو اس کی وسعتِ امکانات اور ترقی پذیری و ترقی پسندی کا ضامن ہے۔ چنانچہ اختصار کے طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جدید اردو نے ان تمام حکمراں نسلوں کی زبانوں اور خیالات کو اپنے اندر اس طرح سمویا ہے کہ ان میں اجنبیت کا شائبہ باقی نہیں رہا۔ ان نسلوں میں بعض ہندستانی بھی ہیں اور بیرونی نسلیں بھی شامل ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان وادب میں یہ لین دین نہ صرف ضروری بلکہ زبان وادب کی ترقی اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کا بہترین عمل خیر و برکت ہے۔

حکمراں طبقے کے علاوہ ہندستان میں تاجر، صنّاع، ادیب، شاعر، مورّخ اور مذہبی پرچارک جو دور دراز ملکوں سے یہاں آتے رہے اور اس ملک کے باشندوں خصوصاً اردو پبلک سے روزانہ زندگی میں جن کا سابقہ پڑا، عوامی سطح پر اس

میل ملاپ، کاروبارِ حیات اور کاروبارِ شوق میں جو روابط قائم ہوئے اُنھوں نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ لیکن ہمیں اپنے ماضی کے ادبی اقدار اور روایات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اسی کے ساتھ کسی لٹریچر پر تنقیدی نظر نہ رکھنا بھی عصبیت اور رجعت پسندی کی نشانی ہے۔ زندگی کے ساتھ ادبی اقدار کا بدلنا ضروری ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے قدیم لٹریچر کا جائزہ لیتے وقت بدلتے ہوئے حالات میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اس لیے کہ زبان و ادب کے ارتقا میں خامیوں کا ہونا فطری بات ہے۔ زبان و ادب کوئی الہامی نسخہ نہیں جس پر نظرِ ثانی نہ کی جا سکے۔

مغربی ادب کے اثرات رونما ہونے سے پہلے ہمارا ادبی سرمایہ زیادہ تر شعری صورت میں ملتا ہے۔ نثری حصہ کم اور نہایت کم۔ شاعری کا جائزہ لیجیے تو چند باتوں کا احساس فوراً ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) شاعری زیادہ تر تقلیدی تھی۔ (۲) عام طور پر صنعت گری کو کمال سمجھا جاتا تھا (۳) اردو شاعری زیادہ تر غیر موثر تھی۔

ان خامیوں کے اسباب ہمیں اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات میں مل جاتے ہیں چونکہ ادب کو قومی زندگی کا عکس قرار دیا گیا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ قوم ایک زوال آمادہ دور سے گزر رہی تھی۔ اس میں فرار، کم ہمتی اور تنگ نظری کے عناصر سرایت کر گئے تھے۔ اور اس جذبۂ کمتری، احساسِ شکست اور بے علمی پر پردہ ڈالنے کے لیے مبالغہ اور قلندرانہ قناعت سے زیادہ بہتر کوئی شے نہ تھی۔ اس سلسلے میں قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ چند شعرا کو مستثنیٰ قرار دے کر باقی تمام شعرا اور ان کے شاگرد یعنی نئی نسل کے یہاں بھی شاعری کے قواعد و ضوابط سخت محدود اور یکساں تھے۔ تذکیر و تانیث اور تراکیبِ لفظی کی بحثوں میں لکھنؤ اور دلّی کے اسکولوں میں غیر معیاری جھڑپ ہوتی تھی۔ تنقید کا وجود نہ تھا۔ استاد کی حیثیت مسلّم تھی۔ اسی لیے خیال، ترکیبِ لفظی، محاورہ، روزمرّہ، تشبیہ، استعارہ، کنایہ

ہر شے کے استعمال کی تصدیق کو سند درکار تھی اور یہ سند اُستاد کے یہاں سے ملتی تھی۔ اس زبان و ادب کے خالق زندگی اور اس کے تقاضے نہ تھے بلکہ صرف "اُستاد"، تھا نتیجہ یہ کہ زندگی سے شاعری دور ہوتی جاتی تھی لہٰذا تقلید، تصنّع اور بے اثری کے عناصر کا غلبہ لازمی تھا۔

عمومی طور پر ہمارا ادب مقصدی اعتبار سے صرف شاعرانہ تھا۔ اس کی نوعیت خارجی محاسن کی تھی۔ واقعیت پسندی یا معروضی فضا نہیں تھی۔ اس ادب کے پیش نظر جو معیار تھا وہ تخلیقِ ادب کی پیداوار کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی جاننا چاہیے کہ اس دور میں اخلاقی اور مادّی اعتبار سے جو ترقی رونما ہوئی اس نے ملک میں نئی فضا پیدا کر دی تھی جس نے لوگوں میں نئی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں کا شعور پیدا کیا تھا۔

مغربی ادب کے جاندار اثرات، ہمیں سب سے پہلے بنگالی ادب میں نظر آتے ہیں۔ بنگالی تھیٹر کی ترقی اس کا نمایاں ثبوت ہے۔

> " وہ قومی ترقی اور زندگی کا ایک خاص ذریعہ بن گیا۔ بنگالی ناول نے بنگالی زبان میں اپنی جگہ پیدا کر لی اور اس نے معاصرانہ معاشرتی زندگی کا خاکہ اُتارنے، تجزیہ و تبصرہ کرنے اور زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے عملی کاروائی شروع کر دی۔" (۱)

> " مدھوسودن دَت نے بنگالی کو بے قافیہ نظم کا عطیہ دیا۔" (۲)

اس دَور کی یہ حقیقت ہے کہ دوسری دیسی زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان کی ترقی اور نشو و نما بعد کو ہوئی۔ اس ترقی اور نئے رجحان کے پروان چڑھانے میں کچھ تو انفرادی کوششوں کا حصہ ہے، لیکن اس کی تمام تر کامیابی اور مستقبل میں

---

(۱) علامہ عبد اللہ یوسف علی "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ہندستانی اکیڈمی ۱۹۳۶ء ص ۲۸۱

(۲) ایضاً ایضاً ص ۱۸۳

روشن امکانات کی ضمانت سر سید اور علی گڑھ تحریک کو قرار دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک بڑا موثر ذریعہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت تھی۔

یہاں ایک اور ادارہ کا ذکر ناگزیر ہے جس کی عملی جدوجہد نے ایک نئی ادبی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی یعنی انجمن اردو پنجاب۔ جس کی بنیاد مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۵ر اگست ۱۸۶۷ء کو رکھی۔ اس کی تفصیل ہم اپنے مقالے کے باب سوم میں درج کریں گے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علی گڑھ تحریک اور انجمن اردو پنجاب نے اپنے اپنے علاقوں اور حلقۂ اثر میں ایک نئی روح اور نئی جاندار تحریک کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جس نے بہ حیثیتِ مجموعی اردو زبان و ادب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا، اصلاح کا فرض ادا کیا اور ہمارے ادب میں تنقید، علم اللسان، بچوں کے لٹریچر اور نصابی کتابوں کا مفید اضافہ کیا۔

جدید اسکول کے آغاز کے سلسلے میں چند اہم شخصیتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی ڈاکٹر نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ۔

حکومت پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے بھی نئے رجحانات کو آگے بڑھانے میں اہم حصّہ لیا۔ اس محکمہ کے نگراں کرنل ہالرائنڈ تھے۔ اردو شاعری کے ارتقا کے سلسلے میں ان کا ذکر اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح اردو نثر کا ذکر کرنے میں ڈاکٹر گل کرسٹ کا نام لیے بغیر اردو نثر کی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائڈ کے حسب ایما انجمن پنجاب نے ماہانہ مشاعرے کیے جن میں غروبِ آفتاب، خوابِ امن اور ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر تاثرات پیش کیے۔ حالی نے چار نشستوں میں شرکت کی برکھا رت، نشاطِ امید، حبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف پر اپنی نظمیں پڑھیں۔ اس مشاعرے میں مصرع طرح کی بجائے موضوعِ نظم دیا جاتا تھا۔ اس جدّت کو اور افادیت کو ملک میں دوسرے شعرا نے بھی محسوس کیا اور نظمیں کہنے کا رواج ہونے لگا۔

یہاں اتنا ذکر ضروری ہے کہ آزاد نظم سے قطع نظر مسدس اور مثنوی یقیناً ایسے اصناف ہیں جن کی ہیئت میں آزادی کو دخل ہے۔ سید عبد اللطیف نے بیان کیا ہے

"If we exclude blank verse out of consideration, it may with out exaggeration be asserted that Musaddas and the Masnawi afford the writer as such freedom as any form in English Literature."

اُردو ترجمہ:

"نظم معرّیٰ سے قطع نظر، یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ مسدس اور مثنوی میں لکھنے والے کو وہی آزادی حاصل ہے۔ جو انگریزی ادب کی کسی بھی صنف میں پائی جاتی ہے۔"

مسدسِ حالی، اردو زبان کی طویل نظم ہے جس میں اس ہیئت کو برتا گیا ہے حالی کی بعض مثنویاں مثلاً 'بیوہ کی مناجات'، 'حبِ وطن'، 'برکھا رت'، محمد حسین آزاد کی مثنویوں میں 'شام کی آمد اور رات کی کیفیت'، شبلی نعمانی کی 'صبح امید'، یہ نئے اسکول کے شاعروں کی بہترین مثنویاں ہیں۔ مثنوی اور مسدس کے علاوہ اس نئے اسکول نے رباعی، قطعہ اور ترکیب بند کو اظہارِ خیال کے لیے پسند کیا۔ مثلاً عمر فاروق کے عہد کا ایک واقعہ، ایثار کی اعلیٰ مثال، زوال اسلام کی اصل وجہ Hardinge وائسرائے سے خطاب، کو بہترین نمونوں میں شمار کیا جائے گا۔ حالی کا شکوۂ ہند

---

(1) The influence of English Literature on Urdu Literature: S. Abdul Latif, 1924, p.63.

بہترین ترکیب بند ہے۔

اس دور میں ایک اور اہم کام کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اردو میں نصابی کتابیں مولانا محمد حسین آزاد اور حالی نے مرتّب کیں۔ منشی ذکاء اللہ نے ریاضی کی کتابیں اردو میں لکھیں۔ یہ کتابیں ہندستانی اسکولوں کے لیے تھیں اور انگریزی نمونے پر مرتّب کی گئی تھیں۔ یعنی مغرب کا اثر ذہنوں پر مستقل طور پر پڑ رہا تھا۔

ابھی تک ہم نے مغرب کے جن اثرات کا احاطہ کیا ہے وہ بالواسطہ طور پر ہمارے زبان و ادب پر مرتسم ہونے کا حکم رکھتے ہیں۔ اب ہم اس اثر کا ذکر کریں گے۔ جو قطعی طور پر ہمارے ادب پر کارفرما رہا۔

نظم طباطبائی نے گرے کی مشہور ایلجی کا ترجمہ "گورِ غریباں" براہ راست انگریزی سے کیا تھا۔ یہ پہلی بار جولائی ۱۸۹۷ء کے 'دل گداز' میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ طباطبائی نے اس ترجمے کی مقبولیت کے بعد کئی اور ترجمے کیے جن سے اردو کی جدید نظم نگاری کو فروغ ملا۔ زمزمۂ بہار اور دولتِ خداداد افغانستان بالترتیب گرے اور سر الفریڈ لائل کی نظموں کے ترجمے ہیں۔ لانگ فیلو کی بعض نظموں کے منظوم ترجمے بھی نظم طباطبائی نے کیے تھے۔ اکبر الہ آبادی کی نظم "روانیِ آب" معارف علی گڑھ یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی جو انگریزی سے ترجمہ ہے۔ عبدالحلیم شرر نے آزاد نظم میں ڈراما کا ترجمہ کیا۔ پہلا سین ۱۹۰۰ء کے 'دلگداز' میں چھپا۔ ستمبر میں دوسری قسط شائع ہوئی اس کے بعد تیسرا سین اشاعت پذیر ہوا۔ شرر اور نظم طباطبائی کے منظوم ترجموں نے دوسرے شاعروں کو متاثر کیا۔ ضامن کنتوری نے بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ ان نظموں کا مجموعہ 'ارمغانِ فرنگ' کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ محمد اظہر علی آزاد کاکوری نے شکسپیئر کے ڈرامے

"A Mid Summer Night's Dream"

کا ترجمہ "جامِ الفت" کیا جو ریاض الاخبار پریس گورکھپور سے چھپا۔ اس سلسلے میں تقدّم

کا شرف محمد امتیاز علی کو حاصل ہے۔ اُنھوں نے شکسپیر کے ہملٹ کا ترجمہ "جہاں گیر" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا تھا۔ نادر کاکوری کے انگریزی سے منظوم ترجمے بڑی تعداد میں مخزن لاہور میں شائع ہوئے۔

انگریزی سے ترجموں کے علاوہ انگریزی نظموں کے نمونے کے طور پر طبع زاد نظمیں کہنے کا رواج ہونے لگا۔ انگریزی سے منظوم ترجمے کرنے والے اور جدید نظم نگار شعرا کی فہرست کافی طویل ہے جن میں وحید الدین سلیم، شوق قدوائی، مرزا محمد ہادی رسوا، ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد اقبال، سرور جہاں آبادی، حسرت موہانی وغیرہ شامل ہیں۔

اردو نظم نگاری میں جدید ہیئت واسلوب کو رائج کرنے اور اسے فروغ بخشنے کا کام عبدالحلیم شرر نے اپنے ماہ نامے دلگداز کے ذریعے کیا اور ان کی اس روایت کو سر عبدالقادر نے اپنے جریدہ مخزن کے سہارے آگے بڑھایا۔ اس طرح ہمارے ادب کو نظم جدید کا قیمتی سرمایہ میسر آسکا اور اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ مغربی ادب کی دین ہے۔

باب سوم

شاعری

اسمٰعیل نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، سلام، ہر صنف پر وہ حادی تھے۔ مگر انھوں نے اپنے کلام کی ابتدا غزل گوئی سے کی اور اصناف سخن میں غزل سب سے زیادہ مقبول رہی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا کہنا درست ہے کہ اس زمانے میں "غزل گو ہونا علم مجلسی کا جزو تصور کیا جاتا تھا۔" (۱)

طبیعت کی موزونی کے باوجود یہ فطری جوہر ایک آنچ کا حاجت مند تھا۔ شروع میں مولانا کی غزل گوئی میں کچھ اِڑکا ڈُسا تھا اور یہ ذوق رُک رُک کا سا تھا۔ شاید کوئی نفسیاتی نکتہ اس کا باعث رہا ہو۔

ان کی شعر گوئی اور اردو شاعری کے مطالعہ سے متعلق "حیاتِ اسماعیل" میں ایک روایت درج ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۶ برس کی تھی اور انھوں نے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ یہ بات ۱۸۶۰ء کی ہے۔ اس زمانے میں منشی نجم الدین میرٹھ

---

(۱) اردو غزل، دہلی، ۱۹۵۲ء (بار دوم) ص ۱۸

میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کے یہاں اہلِ علم کی محفل جمتی تھی۔ منشی تفضّل حسین جن کا تعلق سررشتۂ تعلیم سے تھا اور مولوی محمد حیات مالک ضیائی پریس اور دیگر باذوق حضرات کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک دن اس محفل میں شعر و سخن کا حسبِ معمول چرچا ہوا اور بہترین پسندیدہ اردو اشعار سُنانے کا تقاضا کیا گیا اس واقعہ کو مولّف "حیات و کلیاتِ اسماعیل" نے یوں بیان کیا ہے۔ (۱)

"ایک دن کسی صاحب نے فرمائش کی کہ حاضرین میں سے ہر شخص اپنی پسند کا بہترین اردو شعر سُنائے۔ جب مولانا کی باری آئی تو خیالات یک لخت منتشر ہو گئے۔ کوئی اُردو کا شعر یاد نہ آیا آپ نے باجازت احباب فارسی کا ایک شعر سُنایا۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را با کسے کارے نہ باشد

خیر یہ وقت گذر گیا مگر خفّت و پریشانی کا اثر طبیعت پر مستقلاً قائم ہو گیا۔ آپ نے اساتذہ کا اردو کلام بالاستیعاب پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ ابتدا حضرت امام بخش صہبائی دہلوی کے "گلدستۂ سخن" سے کی جو شعرا اردو کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد ذوقؔ و مومنؔ و غالبؔ کا کلام اوقاتِ فرصت میں نہایت توجّہ کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ کسی اُستاد کی زمین میں بھی خود غزل لکھ لیتے۔ لیکن احباب کو اس مشق کا مطلقاً علم نہ تھا۔"

اس روایت کی صحت پر ہمیں اعتماد ہونا چاہیے۔ اوّل تو اس لیے کہ مولانا میرٹھی کے نجی حالات کا علم اُن کے صاحبزادے سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہماری زندگی میں ایسے جوہرِ قابل موجود ہیں جن کی صلاحیت کو نکھارنے کی ذمّہ دار کوئی عظیم شخصیت یا ادبی انجمن رہی ہے۔ نفسیاتی طور پر جن طبیعتوں میں جھجک یا کم آمیزی یا خودداری

---

(۱) حیاتِ اسماعیل، ص ۲۴، ۲۵

کا شدید احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں Initiative کا مادّہ کم ہوتا ہے اور مذکورہ روایت سے ظاہر ہے کہ مولانا اسمٰعیل اسی قسم کے انسان تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنی شعرگوئی کی صلاحیت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت نہیں کی لیکن یہ پردہ داری بہت دن نہ چل سکی اور ایک تقاضا تھا جسے وہ رد نہ کر سکے اور اس صلاحیت پر نکھار آنا شروع ہو گیا۔ شیخ قمرالدین رسالدار مولانا کے برادرِ نسبتی تھے ان کو مولانا کے شغل شعرگوئی کا کسی طرح پتا چل گیا اور اُنھوں نے مشاعروں کے لیے غزلیں کہنے کی فرمائش شروع کر دی۔ انجامِ کار مولانا طرحی غزلیں کہہ کر اُنھیں دیتے تھے اور وہ میرٹھ، شاہجہاںپور، اور سیتاپور کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ غزلیں پسند کی جاتی تھیں اور رسالدار صاحب کو کافی داد ملتی تھی۔ کلیاتِ اسمٰعیل کے نئے اڈیشن میں دو غزلیں درج ہیں جن کے یہ مقطع ہیں۔

۱۔ کچھ آج ہی نہیں ہیں ثنا خوانِ مُصطفےٰؐ   ہے مجھ کو اے قمرؔ یہ وظیفہ دوام کا

۲۔ اس بحرِ نور کا جو شناگر ہوا قمرؔ   سیراب جامِ لُطف سے ہر خشک لب ہوا

رسالدار قمرالدین کے نام کی نسبت سے ان غزلوں میں قمرؔ تخلص رکھا گیا ہے، لیکن مولانا نے خود کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی اور ان کی کسی غزل میں اسمٰعیل تخلص نہیں ملتا۔ مذکورہ روایت کی روشنی میں یہ بات درست سمجھی جائے گی کہ یہ غزلیں ۱۸۶۰ء کے بعد کہی گئی ہیں۔ مؤلف حیات وکلیاتِ اسمٰعیل نے کل غزلوں کی تعداد ۸۸ بتائی ہے۔ اور دوسرے مقام پر ۸۶ بیان کی ہے۔ اس تعداد کے بیان کرنے میں پُرانے دواوینِ شعرا کا طریقہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ جن میں حمد و نعت منقبت، مدح پیر، سلام اور اس قبیل کی بعض نظموں کو غزل کے تحت شمار کر لیا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کی روش کے مطابق مولانا کی غزلیں ۶۹ سمجھی جائیں گی۔

کلیاتِ اسمٰعیل میں بعض غزلوں پر تاریخِ تخلیق درج ہے۔ اس اعتبار سے غزل گوئی کا سلسلہ ۲۰ر اگست ۱۹۱۴ء تک مل جاتا ہے۔ مولانا نے ایک غزل

۱۸۶۵ء میں کہی تھی جب کہ ان کی عمر ۲۱ برس تھی ۔ اس غزل کا مطلع ہے ۔

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں ‌ ‌ ‌ ‌ شرماؤگے کبھی، نہ کرو صد حجاب میں

اس غزل میں بارہ شعر ہیں اور آخری شعر سے قبل ایک شعر درج ہے جس کے مضمون سے بھی یہ مہک نکلتی ہے کہ یہ عالمِ شباب کی تخلیق ہے ۔

کس کس کے جور اُٹھائیں گے آگے کو دیکھیے ‌ ‌ ‌ ‌ دشمن ہے چرخِ پیر "زمانِ شباب" میں

ایک غزل مولانا نے ۲۳ برس کی عمر یعنی ۱۸۶۷ء میں کہی ہے ۔

دل گیا ہاتھ سے کیا ہاتھ سے داماں نکلا ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ترے پاؤں کے مانند گریباں نکلا

۱۸۷۳ء کی غزلوں کے مطلع حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا ‌ ‌ ‌ ‌ دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا ‌ ‌ ۱۱ رمئی
۲۔ ہے بے لب و زبان بھی غُل تیرے نام کا ‌ ‌ ‌ ‌ محرم نہیں ہے گوش مگر اس پیام کا
۳۔ رسوا ہوئے بغیر نہ نازِ بتاں اُٹھا ‌ ‌ ‌ ‌ جب ہو گئے سبک تو یہ بارِ گراں اُٹھا
۴۔ وہیں سے جبکہ اشارہ ہو خودنمائی کا ‌ ‌ ‌ ‌ عجب کہ بندہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
۵۔ وہ پیرہن جاں ہیں، جانِ حجابِ تن ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ ہوں وہم جدائی سے عجب رنج و محن میں ‌ ‌ ۷ر دسمبر
۶۔ معشوقِ دل نواز اگر تُند خو نہ ہو ‌ ‌ ‌ ‌ ثابت خلوصِ عاشق ولافِ عدو نہ ہو ‌ ‌ ۸ر جون

۱۸۸۰ء کی ایک غزل ہے ۔

نامہربانیوں سے یوں پائمال کرنا ‌ ‌ ‌ ‌ ہیہات دوستوں کو دشمن خیال کرنا
روزِ جزا میں آخر پوچھا نہ جائے گا کیا ‌ ‌ ‌ ‌ تیرا یہ چُپ لگانا میرا سوال کرنا
او شہسوار اتنی اچھی نہیں ہے عُجلت ‌ ‌ ‌ ‌ ہیں چند پاشکستہ ان کا بھی خیال رکھنا
ناقص بھی کاملوں سے کچھ کم نہیں کہ اُن سے ‌ ‌ ‌ ‌ سیکھا ہے کاملوں نے کسبِ کمال کرنا

۱۰ر نومبر ۱۸۹۷ء کی ایک غزل کا مطلع ہے ۔

کیا مانگیے جس کا کبھی چسکا نہ لگا ہو ‌ ‌ ‌ ‌ دے راہِ خدا ہم کو بھی ساقی کا بھلا ہو

۱۹۱۴ء کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

وہی سائل، وہی مسئول، وہی حاجت مند ‌ ‌ ‌ ‌ گر ہوں مقرونِ اجابت تو سوال اچھا ہے

ہے تری خوئے کرم تلخ نوائی کا علاج   عوض سنگ ثمر دے وہ نہال اچھا ہے
ہو گئی مخمصۂ قحط و گرانی میں کمی   شکر ہے سالِ گزشتہ سے یہ سال اچھا ہے

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اصلاحِ سخن کے لیے مرزا غالب کا انتخاب کیا تھا۔ مولانا اسمٰعیل کی غزلوں میں ہمیں دو واضح تصوّر مل جاتے ہیں جن سے مل کر ان کی غزلوں کی فضا نکھرتی ہے۔

(۱) تصوّف (۲) رومان

مولانا کی غزلوں پر گفتگو سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تصوّف کے اثر سے اردو شاعری میں کن موضوعات کا اضافہ ہوا۔ اور تصوّف کے وہ کلیات کیا ہیں جو شاعر کے ذہن میں رچ بس گئے تھے۔

صوفیانہ شاعری میں سب سے اہم مسئلہ ہمہ اوست کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے ذاتِ خدا ہے۔ کثرت، غیر اصل ہے حقیقت صرف وحدت کی ہے۔ یہ دُنیا اسی وحدت کی جلوہ گاہ ہے۔

تصوّف کے چند مضامین یہ ہیں۔ فنا، ترک، توکّل، قناعت، تسلیم و رضا، عشق مشاہدہ، زہد، بقا۔

مولانا نے اپنے جذبات و خیالات کے ابلاغ کا ذریعہ صوفیانہ غزل کو بنایا وہ فارسی ادب سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت فارسی ماحول میں ہوئی تھی، اس لحاظ سے بھی ان کا ذہن فارسی غزل گو شعرا سے متاثر تھا اور فارسی غزل کے سرمائے میں تصوّف کا جز وان کی محبوب پونجی تھی۔ اپنی شاعری کے بارے میں اُنھوں نے ایک شعر میں اشارہ کیا۔

نہیں ہے اب کے زمانے کی رَوش زنہار   ہیں یادگار ہوں خاقانی و سنائی کی

اس سے ظاہر ہے کہ اُنھیں اپنے زمانے کی روایتی غزل سے بیزاری تھی، اُنھوں نے اپنے دور کے روایتی شاعر اور شاعری سے سخت بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً :

مشاعرہ ہو تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مُرغ　　لہولہان ہیں پنجے شکستہ ہیں منقار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصولِ موضوعہ　　کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی　　غزل ہے یا کوئی ہذیان ہو بوقتِ بُخار

یعنی مولانا کی شاعری میں خلوص و صداقت پر یقین تھا اور اس یقین کی بنیاد محبوبِ حقیقی کی محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ "تصوّف" کے علاوہ اور کوئی جذبہ اس کا محرک نہ ہو سکتا تھا۔ اس خیال اور جذبہ کی سچائی کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ ۱۸۷۰ء میں مولانا سیّد غوث علی شاہ صاحب کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے اور نہایت خلوص، ریاضت کے ساتھ تربیتِ باطنی کی طرف مائل رہے اور آخر کار ان کے شیخ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

"اسمٰعیل ایک فرشتہ ہے جو ہر وقت عالمِ سکوت میں رہتا ہے۔" (۱)

اُن کی غزلوں میں سب سے زیادہ تعداد انھیں اشعار کی ملتی ہے جن میں "ہمہ اوست" کے نظریہ کا اظہار کیا گیا ہے۔

ذرہ ذرہ حیرتی ہے مہرِ پُرتنویر کا　　بے خودی آئینہ ہے ہنگامۂ تکبیر کا
ہے مسلّم نازِ یکتائی اسے ہر رنگ میں　　جلوۂ نقش آفریں خاکہ ہو جس تصویر کا

کائنات میں آثارِ مظاہر کی طرف مرزا غالبؔ کی نگاہ اُٹھتی ہے تو ان کے ذہن میں ایک سوال اُبھرتا ہے۔

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

مولانا میرٹھی اپنی آگہی کا اظہار یوں فرماتے ہیں :-

اُٹھے تری نقاب تو اُٹھ جائے ایک بار　　سب تفرقہ یہ روز و شب و صبح شام کا

صوفیوں کے یہاں "عبد و معبود" کی تفریق رسمی چیز سمجھی گئی ہے۔ مولانا نے اس کو

---

(۱) تذکرہِ غوثیہ ص ۴۵۰
(۲) فاروقی، بہ اہتمام محمد معظّم (سن اشاعت ندارد)

"وہم" بتایا ہے اور محض دل لگی کا مشغلہ۔

وصل و فراق وہم سہی، دل لگی تو ہے   پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اٹھا

ہمہ اوست کے ایک اور پہلو پر نگاہ کیجیے۔

وہیں سے جبکہ اشارہ ہو خودنمائی کا   عجب کہ بندہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

میر درد کو صوفی شعرا میں امام کا درجہ حاصل ہے انھوں نے ایک شعر میں اس نازک مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ "انسان خدا ہے" یہ تصوف کا خلاصہ ہے۔

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان کا دیکھا   جو کچھ کہ سنا تجھ میں وہ انسان میں دیکھا

ایک مقام پر مولانا کو "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" پر یقین رکھنے کے باعث فراقِ محبوب پریشان کرتا ہے اور وہ زندگی کو ایک پردہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔

وہ پیرہنِ جاں میں، جان حجلۂ تن میں   ہوں وہم جدائی سے عجب رنج و محن میں

اس شعر میں فنا و بقا کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

مولانا نے ایک شعر میں وحدت الشہود کے مسئلہ کو نہایت واضح طور پر ادا کر دیا ہے۔

بس اے رنگ و بو! تو نہ کر نازِ بے جا   خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

یہ شعر سن کر حالی پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بار بار داد دیتے تھے اور بار بار پڑھواتے تھے۔

ہمہ اوست سے متعلق یہ مطلع سن کر اکبر الہ آبادی نے بہت داد دی۔

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں   ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

اس سلسلے کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

واں برابر ہے خلوت و جلوت   اس کی بے پردگی حجاب بھی ہے

مولانا نے ایک غزل ایماں، لیناں، پریشاں وغیرہ قوافی میں کہی تھی۔ مولانا کی موجودگی میں ان کے صاحبزادے محمد اسلم سیفی صاحب نے یہ غزل حالی کو سنائی۔ انھوں نے بہت پسند کی۔ اس غزل میں مطلع نہیں ہوا تھا۔ حالی نے

غزل میں مطلع شامل کرنے پر اصرار کیا اور مولانا محمد اسمٰعیل نے حسنِ ذات سے متعلق یہ مطلع کہا:

عارضِ روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہو گئیں — کفر کی گمراہیاں ہم رنگِ ایماں ہو گئیں

تلاشِ حسن اور وادیِ عشق کی رہ نوردی کو مولانا اسمٰعیل نے جس خوبی سے پیش کیا ہے اس کی مثال معاصرین میں کم یاب ہی کہی جاسکتی ہے۔

بتلا دیا ہے راہ نمانے مجھے پتا — دنیا بھی اک مقام ترے رہگزر میں ہے

اس قسم کا مضمون ہمیں آتش لکھنوی کے یہاں بھی ملتا ہے۔

نہ پوچھو اہلِ عالم ہم سے دیوانوں کی بیتابی — یہاں مجمع ستایاں بھی تلاشِ یار میں آئے

صوفیوں کے حسنِ مجازی کو بھی عشق کی ایک منزل قرار دیا گیا ہے جو حسنِ حقیقی کا واسطہ بن جاتا ہے۔ مرزا غالب نے مادّیت اور روحانیت کا تعلق اسی نسبت سے بیان کیا تھا یعنی "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"،

مولانا میرٹھی نے مجاز و حقیقت کو اس صورت میں پیش کیا ہے:

کھولا ہے مجھ پہ سرِّ حقیقت مجاز نے — یہ پختگی صلہ ہے خیالاتِ خام کا

راہِ سلوک میں سالک کا ثابت قدم رہنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ نفسِ امّارہ پر پورا قابو پالے کے بعد سخت عبادت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً کانٹوں پر بیٹھ کر عبادت کرنا، یا نمازِ معکوس ادا کرنا، غرض سر دے کر یہ منزل طے کی جاتی ہے۔ اس مجاہدے کو آتش نے یوں ادا کیا ہے۔

ٹھہرے نہ پھر جو راہ میں تیزی نکل چلے — شل ہو گئے جو پاؤں، تو ہم سر کے بل چلے

مولانا میرٹھی نے اسی خیال کو بڑی جرأت آموزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

سر ہی کے بل گئے ہیں سدا رہروانِ عشق — حیرت زدہ نہ بن، کہ نشانِ قدم نہیں

تصوّف میں معرفت کا اہم مقام ہے۔ معبودِ حقیقی کی معرفت کے لیے اور اس کی حقیقت کے ادراک کو یہ ضروری ہے کہ پہلے انسان اپنی ذات کا عرفان

حاصل کرے۔

مولانا میرٹھی نے بندگی کے مفہوم پر دو شعروں میں اظہار کیا ہے۔

خاک اڑتی جو ہم خدا ہوتے　　　بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا
بندگی کا شعور ہے جب تک　　　بندہ پرور، وہ بندگی ہی نہیں

مولانا کے کلیات میں ایک غزل مسلسل درج ہے جس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ صوفیہ کے یہاں ہمہ اوست کا مسئلہ تصوّف کا مہتم بالشان سمجھا گیا ہے۔ تصوّف کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا ہے۔ ایک ذات مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت مولانا کی غزل سے ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر تو ہے، تو میں نہاں ہوں　　　باطن تو ہے، تو میں عیاں ہوں
تو ہی ظاہر ہے، تو ہی باطن　　　تو ہی تو ہے، تو میں کہاں ہوں
تیرے ہوتے کہیں نہیں میں　　　اوّل، آخر، نہ درمیاں ہوں
تو تو، میں میں، نے مار ڈالا　　　دم بند ہے، کیجیے نہاں ہوں
میں ہی لیلیٰ ہوں، میں ہی محمل　　　ناقہ بھی ہوں، میں ہی ساربان ہوں
ہوں کنج قفس میں بند لیکن　　　بیرونِ زمین و آسماں ہوں
دریا کی طرح رواں ہوں لیکن　　　اب تک بھی وہیں ہوں، میں جہاں ہوں

جز نام نہیں نشان میرا
سچ پُچھ میں بحر بیکراں ہوں

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا "فلسفۂ خودی" مولانا کے نظریۂ وحدت الشہود سے ملتا جلتا ہے۔ اقبال کی بعض شاعرانہ علامتیں اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں مل جاتی ہیں۔ چونکہ دونوں نے فارسی کے کلاسکی اور صوفی شاعروں سے استفادہ کیا ہے۔ اقبال کے معاملے میں یہ بات مستزاد ہے کہ انھوں نے پرانی رمزی علامتوں کو نئے معنی پہنائے ہیں مثلاً شہباز کی شاعرانہ علامت کو

لیجیے۔ مولانا اسمعیل میرٹھی کا مصرع ہے۔

طائرِ مُردہ نگر طعمۂ شہباز نہیں

اقبال نے اسے ضربِ کلیم میں یوں ادا کیا ہے۔

شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اس سے مولانا کی صوفیانہ شاعری کی عظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

غزل کا دوسرا رُخ

مولانا میرٹھی کی زندگی کے ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں ملتا جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اُنھوں نے عشقِ مجازی کی فریفتگی میں اپنی حیات کا کون سا دور گزارا۔ ہمارے سامنے یہی ایک ذریعہ ہے کہ ان کے عشقیہ اشعار میں ان کی جذباتی پابندگی، غمِ محبت کی کسک، قلب کے سوز و ساز، احساس اور خیالات کی گم گشتگی کو تلاش کریں۔ اس تلاش کا حاصل ایک شعر ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ حُسنِ مجازی کے آخری عمر تک دلدادہ رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اب تک بھی ہے نظر طرفِ بامِ ماہ وش　　　ہیں گرچہ آفتاب لبِ بام ہو گیا

اس کے ساتھ ان کا ایک اور شعر قابلِ ملاحظہ ہے۔

ہے تو اغیار سے خطاب مگر　　　میری ہر بات کا جواب بھی ہے

اس بلیغ مجازیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شوخ طرحدار محبوب کے انداز کا اثر قبول کیے بغیر یہ شعر کہنا ممکن نہیں ہے۔

مولانا کے لب و لہجہ کی ایک سطح ہے اور باوقار ـــ ان کی غزلوں میں مشاہدے، فکر، اور ذاتی تجربوں سے حاصل کی ہوئی ایک کیفیت ملتی ہے جو اسلوب کی خوبصورتی میں گھُل مل کر دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ان کے رنگِ تغزل اور غزل گوئی کی اہمیت کا اندازہ ان کے غزلیہ اشعار سے بخوبی

ہو سکے گا" جیسا کہ پہلے کہا گیا، اپنے ذوقِ غزل گوئی کی تکمیل کے لیے وہ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے غالب کی زمین میں تیرہ غزلیں کہی ہیں۔ بعض غزلوں میں غالب کا رنگ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً چند اشعار پیش ہیں۔

اب اور ڈھونڈیے کوئی جولاں گہہ جنوں — صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہو گیا

چارۂ جوشِ جنون، خانہ خرابی نہ ہوئی — گھر سمجھتے تھے جسے ہم سو بیاباں نکلا

یوں تو مولانا کی غزلوں میں کئی ممتاز اور مشہور شاعروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مومن کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا — دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا — اب مہرباں ہو گئے، یہ کیا غضب ہوا

میں در پہ ترے ناصیہ سا ہو نہیں سکتا — دشمن کا بھی نقشِ کفِ پا ہو نہیں سکتا

باقی نہ رہی غیر کو اب جائے شکایت — شکرِ ستمِ یار ادا ہو نہیں سکتا

اور اپنے حق میں طعنِ تغافل غضب ہوا — غیروں سے ملتفت بتِ خود کام ہو گیا

میں نظر بند، غیر مدِ نظر — اپنا دل، اور مرا جگر دیکھو

پائے غیر اور میرا سر دیکھو — ٹوٹ جائے نہ سنگِ در دیکھو

مولانا کے ایک شعر میں میر تقی میر کی نرمی، بانوسیت و معصومی، جذباتی طہارت اور اسلوب کی گھلاوٹ ملاحظہ فرمائیے

کم نمائی و خویشتن بینی — کتنے بے دید ہو ادھر دیکھو

مولانا کا ایک انفرادی رنگ بھی ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد کم ہے اور بعد میں انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی تھی اگر وہ غزلیں کہنے کا سلسلہ جاری رکھتے تو اردو غزل میں ان کا رنگ ایک منفرد حیثیت اختیار کر لیتا۔ چند اشعار سے ان کے انفرادی رنگ کی تراوش ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

انفرادی رنگ

یہ ہنگامہ آرا ہیں سب بے خبر — وہ چپ ہیں جنھیں کچھ خبر ہو گئی

خواہش کہ تھی آدمی کو لازم — بڑھ کر الزام ہو گئی ہے

تمہیدِ پیام ہی میں اپنی — تقریر تمام ہو گئی ہے

قدسیوں کے بھی ہوش اُڑتے ہیں — سُن کے اس مشتِ خاک کی باتیں

مولانا کی غزلوں میں نفسیاتی نکات، رموزِ حُسن وعِشق اور محاسن کی کمی نہیں۔ چند مثالیں کافی ہیں۔

مکرِ شاعرانہ

میرا نشاں مِٹا تو مِٹا، پر یہ رشک ہے — وردِ زبانِ خلق ترا نام ہو گیا

مہربانی بھی تو کچھ عیب نہیں — دشمنی شرطِ محبت ہی سہی

محبوب کے لبِ جان نواز کا بوسہ پانے کے لیے عاشق کا فنا ہو کر جامِ شراب بننا پرانا مضمون ہے۔ مولانا نے اس میں نئی بات پیدا کی ہے۔

اللہ رے بوسۂ لبِ میگوں کی آرزو — میں خاک ہو کے دُردِ تہِ جام ہو گیا

نفسیاتی نکتہ

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں — ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

رمزِ عشق

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا — ورنہ دیارِ حُسن میں رسمِ ستم نہیں

غور کیجیے تو محبوب کی شخصیت، مولانا کے یہاں نہایت دل آویز اور پاکیزہ ہے۔ ان کے معاصرین میں محبوب کا تصور قطعی مختلف تھا۔ روایتی طور

پر تقریباً سب محبوب کو قاتل، بُت، ستمگر، سمجھتے تھے ۔ مولانا کے یہاں محبت میں خلوص اور پائندگی ملتی ہے ۔ ان کا محبوب خلوص اور رفاقت کا پیکر ہے۔

محاکاتی رنگ اور ناز و نیاز

اس انجمن میں جائیے اب کس امید پر　　　ہم بیٹھنے نہ پائے کہ وہ بدگماں اُٹھا

مشاہدۂ حُسن

وہ قامتِ دلکش ہے عجب فتنۂ عالم　　　چُھپتا ہی نہیں پیرہنِ نو و کہن میں

خوبیٔ محاورہ

دل گیا ہاتھ سے کیا، ہاتھ سے داماں نکلا　　　کہ ترے پاؤں کی مانند گریباں نکلا

نصابیہ غزلیں

مولانا میرٹھی کی پوری زندگی درس و تدریس میں گزری تعلیم کی فضا سے ان کا ذہن ہم آہنگی پیدا کرچکا تھا ۔ انھوں نے "خالق باری" کے رنگ میں دو نصابیہ غزلیں کہی ہیں ۔ دونوں غزلوں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ وہی کارواں، وہی قافلہ، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　　وُہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۲۔ کجا ہستی بتا دے تو کہاں ہے　　　جسے کہتے ہیں بسمل، نیم جاں ہے

ایک غزل مولانا نے "ردیف" کا فن دکھانے کو کہی ہے ۔ یقیناً ردیف نہایت دشوار ہے مگر مولانا کے کسی شعر میں ردیف غائب نہیں ہوئی ۔ مطلع ہے

ہے جانِ حزیں میں ایک لبِ روح فزا دو　　　اے کاش کہ اس ایک کی ہو جائیں دوا دو

مولانا کے کلام میں توارد یا ترجمہ :

مولانا کو فارسی ادب پر عبور حاصل تھا اور تصوف سے گہرا شغف تھا اس لیے ان کے یہاں حافظ شیرازی اور سعدی شیرازی کے خیالات کا اثر ملتا ہے۔ اس قبیل کے کلام کو توارد یا ترجمہ سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مثلاً

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود　　سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود
(حافظ)

۱۔ اب تک ہے سجدہ گاہِ عزیزانِ روزگار　　جس خاک پر نشان تری کفش پا کے ہیں
(اسمٰعیل)

یا وفا خود نبود در عالم　　یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد
(سعدی)

۲۔ یا وفا ہی نہ تھی زمانے میں　　یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں
(اسمٰعیل)

ایک عارف کا قول ہے۔

آدمی زادہ طرفہ معجون است　　از فرشتہ سرشتہ در حیوان
گر کند میل ایں شود کم ازیں　　در کند قصد آں شود بہ ازیں

یہ مولانا کی قدرتِ کلام کا ثبوت ہے کہ انھوں نے اس خیال کو غزل کے ایک شعر میں سمو دیا

۳۔ کیا کہنے آدمی کے عجب چیز ہیں جناب　　برتر ملائکہ سے فروتر دواب سے
(اسمٰعیل)

آخر میں دو شعر اور ملاحظہ فرمایئے جن میں محبوب اور ماحول کی تصویریں دو مختلف انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

سمجھتے ہیں شیروں کو بھی نرم چارا　　غزالانِ شہری سے ہشیار رہنا
شمع پھیکی، رات کم، محفل اُداس　　اب مغنّی کا ترانہ اور ہے

مولانا نے اپنی غزلوں میں مجازی عشق اور وارداتِ قلب کے جو نقوش

اُبھارے ہیں اس سے ان کی قدرتِ مشاہدہ، فکر اور شدّتِ احساس کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جذبہ کی پختگی اور شدّتِ احساس نے غزل کو موثر زبان بھی دی ہے۔

مولانا کے طرزِ اظہار میں جو تعمیم پائی جاتی ہے اس نے ان کے انفرادی تصورات کو کائناتی وسعت بھی عطا کی ہے۔ رموز و تمثیلات نے تکمیل کا رنگ بھرا ہے۔ ان غزلوں میں رمز و کنایہ کی وہ جلوہ گری ہے جن کو ملزومات خارجی کہہ لیجیے۔ ان کی غزلوں میں ہمیں بلیغ مجازیت کا عنصر ملتا ہے۔

قصائد

"قصیدہ" اہلِ عرب کی دین ہے۔ عربی قصیدوں کے موضوعات بیشتر مفاخرت اور مبارزت پر مشتمل ہوتے تھے۔ عربی کے اثر سے اس صنفِ سخن کو اہلِ فارس نے اپنایا۔ فارسی قصیدہ نگاروں نے اس میں مدح کے عنصر کو شامل کیا اور اس میں وہ شدّت اختیار کی اور فن کے لحاظ سے ایسا کمال پیدا کیا کہ فارسی قصیدہ "مدحیہ شاعری" تک محدود ہو کر رہ گیا۔

موضوعات کے علاوہ اہلِ فارس نے قصیدہ کی تصنیف و ترتیب میں بعض اجزا کی پابندی کی اور ان اجزائے ترکیبی کو بھی انھوں نے ایک مستقل صورت عطا کر دی چنانچہ فارسی قصیدوں میں تشبیب، گریز، مدح، دعا، اور خاتمہ اہم عناصر تسلیم کر لیے گئے۔

اردو شاعری میں قصیدہ نگاری کی روایت فارسی ادب سے داخل ہوئی قصیدے کے ارکان وہی قرار پائے جو فارسی قصیدوں کا چلن تھا اصل میں اردو قصیدے کی داغ بیل دکنی شعرا کی شاعری میں پڑی۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اردو قصیدہ نگاری میں سودا کی روایت کو پھر تازہ کیا۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی اور اصلیت کی سطح کو نہ صرف

برقرار رکھ کر بلکہ اس میں اور بلندی پیدا کر گئے۔ مولانا میرٹھی نے سودا کی روایت قصیدہ نگاری سے انحراف بھی کیا اور یہ جداگانہ شاہراہ ہمیں اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ ہم اس کو مولانا میرٹھی کا امتیازی وصف قرار دے سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قصیدے میں روایتی اجزائے ترکیبی کی پابندی کو پسند نہیں کیا۔ عموماً تمام قصیدہ نگار شعرا نے تشبیب کو قصیدہ کا لازمی جز قرار دیا ہے اس میں شکایتِ زمانہ یا ذکرِ بہار کو شامل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مولانا میرٹھی کے اُستاد مرزا غالبؔ کے یہاں بھی اس روایت پسندی کا مظاہرہ ہے۔ لیکن مولانا نے اپنے قصیدے سے تشبیب کا عنصر خارج کر دیا۔ نیاز فتحپوری قصیدہ گوئی کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

> "قصیدہ کہنے کے لیے جس فضل و کمال اور وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس سے اکثر ہمارے شعرا کو بہرہ یاب ہونے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ اس کے لیے علومِ قدیمہ اور فارسی و عربی ادب کا جاننا ضروری ہے۔" (۱)

اس معیار کے پیشِ نظر مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو قصیدہ نگاری کا اہل سمجھنا چاہیے۔

۱۔ 'جریدۂ عبرت' میں مولانا نے اپنے دور کے چند اجتماعی کرداروں کا نقشا پیش کیا ہے۔ مثلاً (۱) محرّم کے اجتماع میں پھری گتکا کے کمال دکھانے والوں کا حال اور اس کی مذمّت (۲) شاعر اور نمونۂ غزل (۳) اخبار اور اس کے ایڈیٹر (۴) فلسفی علماء (۵) معلّم (۶) طبیب (۷) دنیا پرست دیندار (۸) مشائخ (۹) عوام (۱۰) انگریزی فیشن والے۔

ان تمام کرداروں پر سخت صحت مند تنقید کی گئی ہے اور اس کا انداز منفی نہیں ہے، جھلاہٹ نہیں ہے، سطحی نہیں بلکہ پُر وقار انداز ہے اور

---

(۱) نگار، کراچی، اپریل ۱۹۶۲ء ص ۳۴

مثبت طور پر عالمانہ روش کے ساتھ اپنے ذہن کو اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پیش کیا گیا ہے اس قصیدے میں دو سو پچپن (۲۵۵) اشعار شامل ہیں۔

اس قصیدے میں مولانا نے روایت پسندی سے انحراف کر کے تشبیب کو خارج کر دیا ہے اور براہِ راست درجِ ذیل شعر سے قصیدہ کا آغاز کیا ہے اس کو مقتضب کہا جا سکتا ہے۔

میں شاعرانہ روش پر نہیں قصیدہ نگار — یہ ایک سادہ گزارش ہے یا اولی الابصار

اس شعر کے بعد ہی گریز اختیار کرتے ہیں اور اصل قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے۔

کہ اب کے ماہ محرّم کی ساتویں تاریخ — گیا جو گھر سے قضارا بجانب بازار
تو دیکھتا ہوں کہ گزری میں ایک اکھاڑا ہے — اور اتنی بھیڑ کہ جسکا نہیں حساب و شمار
ہیں دو حریف مقابل لیے پھری گتکا — ہر ایک فن پھکیتی میں طاق اور طرّار
جو اس نے پاؤں بچایا، تو اس نے سر تا کا — دکھایا چہرہ تو پہلو پہ جا کیا ہے وار
عجب ہے ٹھاٹھ، نئے پنیترے، غضب پھرتی — نرالے ڈھنگ سے کرتب کا کرتے ہیں اظہار
چلا ہے ایک بنیٹی کا باندھ کر چکّر — کھڑا ہے ایک لیے سیف لڑ رہا ہے گو ہار
میں اپنے دل میں لگا کہنے کیا حماقت ہے — مٹے ہوئے ہیں جو اس فن پہ یہ خدائی خوار

اس کے بعد اشعار میں اس فن کی مذمّت کی ہے اسے بیہودہ اور مضحک بتایا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ اب فنِ سپہ گری کا زمانہ گزر گیا۔ اس ہنر کے قدردان نہ رہے۔ جنگ کے انداز اور ہتھیار بدل گئے۔ اب اس فن سے دین و دنیا کا کوئی فیض حاصل نہیں ہوتا۔ اس موقع پر ان کے دل کی آواز شاعر کو مخاطب کرتی ہے

جواب دل نے دیا یوں کہ مت تعجب کر — میں اس سے بڑھ کے سناؤں زمانہ کے اطوار

اس کے بعد مولانا نے رسمی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور توجہ اس نکتہ پر مرکوز کرنا چاہی ہے کہ بے پڑھے عوام اور شاعروں کا ذہن قدامت پسندی اور نقل و روایت کے معاملہ میں یکساں ہوتا ہے۔ نیا زمانہ اور نئی تہذیب اپنے ساتھ جو نئی قدریں لاتے ہیں اس کا شعور، اس کا احساس، عام شاعروں کو نہیں ہوتا

اور یہ قومی پستی کی علامت ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت — کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑئیے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انھیں مضمون — سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگِ حکمت و قدرت — نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصولِ موضوعہ — کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشقِ زار

ہے ایک غار میں پانی سڑا ہوا لبریز — پڑا ہے نیم کا پتہ اور اس پہ پشہ سوار
وہ پشہ آپ کو سمجھا ہے ناخدائے جہاز — اور اس سڑے ہوئے پانی کو لجۂ زخار
اسی طرح سے ہمارے زمانے کے شاعر — سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عینِ وقار
مبالغہ ہے تو بیہودہ عقل سے خارج — ہے استعارہ، تو بے لطف اور دور از کار
کیا ہے نام زٹل قافیہ کا اپنے سخن — وہ کنکری ہے جسے کہتے ہیں دُرِ شہوار
اس سلسلہ کا آخری شعر ہے
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی — غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقتِ بخار

اس کے ساتھ قصیدے میں اس رسمی غزل کا نمونہ پیش کیا گیا ہے جو مولانا کے نزدیک ہدفِ ملامت ہے۔

نمونۂ غزل

صفت ہے دوست کی جلّاد و ظالم و غدار — ستم شعار، دل آزار، بے وفا، مکّار
ہے دلبروں کی بھی شامت، نہ مُنہ رہا نہ کمر — بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار

شبِ فراق کا دُکھڑا اگر کریں تحریر — تو ایشیا کو ڈبو دیوے دیدۂ خونبار

کریں چڑیل کو حورانِ خلد سے نسبت — بنائیں اونٹ کٹیلی کو گلشنِ بیخار

کریں جو مدح کسی چرکٹے کی وہ بالفرض
تو پھر سکندر و دارا ہیں اس کے باج گذار
بنائیں اس کے تئیں بر و بحر کا سلطان
جو فی المثل ہو کسی گوردہ کا نمبردار

اس سلسلہ میں مولانا نے اپنے آخری اشعار میں اخبار اور ایڈیٹر کا ذکر کیا ہے، خوشامدی شاعر کے ہاتھ میں اخبار اور ایڈیٹر کا منصب ذلیل ہو جاتا ہے۔ تین شعروں میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔

تو اب وہ پھرتے ہیں ناچار مانگتے کھاتے
بنا کے کاسہ گدائی کا پرچۂ اخبار
کسی کی مدح سرائی کسی کی بد گوئی
ایڈیٹری کی بھی کرنے لگے ہیں مٹی خوار

کلام دیکھو تو صورت حرام سرتا سر
سلاح بر در وکس نیست درمیانِ حصار

مولانا نے فلسفی علمار کا کردار شاعروں کے بعد ظاہر کیا ہے اور درج ذیل شعر دونوں کرداروں کو معنوی ربط میں ملانے کی ایک کڑی ہے۔

نہ شاعروں ہی پہ تنہا پڑے ہیں یہ پتھر
کہ عالموں کا بھی اس دور میں یہی ہے شعار
وہیں ہیں آج جہاں تھے یہ دس صدی پہلے
گیا ہے قافلہ دور، اب ٹٹو لیتے ہیں غبار
وہی ہیں یاد پرانے اُصولِ یونانی
جنھیں علوم جدیدہ نے کر دیا بیکار
وہی قدیم زمانے کا فلسفہ سڑیل
ہو جیسے کہنہ کھنڈر کی ڈھئی ہوئی دیوار
ہنوز فخر و مباہات اس پہ کرتے ہیں
وہ جن کے سر پہ فضلیت کی ہے بندھی دستار
ہے درس میں وہی ترتیب مادّہ اب تک
کہ پہلے خاک ہے، پھر آب، پھر ہوا، پھر نار
اگرچہ ہو گئے تحلیل خاک و باد و آب
مگر ہیں علم میں ان کے وہی عناصر چار
ہے آسمان، طوافِ زمین میں مصروف
ہے آفتاب ابھی چرخ چار میں پہ سوار
وُہی ہے ڈھانچ پُرانا نظامِ ہیئت کا
جڑے ہوئے ہیں فلک میں ثوابت و سیار
وہی ہے مسئلۂ خرق والتیام ہنوز
کہ جس کا اب نہ کوئی مدّعی نہ جانبدار
وہی حساب ہے لکھا ہے جو خلاصہ میں
گھٹے بڑھے گا نہ اک صفر تا بروز شمار
جو کہہ گئے ہیں فلاطون اور بطلیموس
اسی کی بحث ہے اب تک اسی کی ہے تکرار

جو شرح چغمنی و میبندی میں لکھا ہے | ز روئے کشف کھلے تھے وہ غیب کے اسرار
جو شمس بازغہ میں آچکا سو ہے الہام | کہ ہے مسائلِ حکمیہ کا اسی پہ مدار
بھرا ہوا انھیں کج بحثیوں سے ہے منطق | کہ ایک کو جو کہیں دو، تو پھر نہ ہو انکار
ہوا دلائل وہمیہ سے جو کچھ ثابت | تو پھر مشاہدہ بے سود، تجربہ بیکار

مولانا نے علوم و فنون کی فرسودگی اور علما کی ان سے اندھی عقیدت مندی کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد گریز کی ایک نئی شکل پیدا کی ہے۔ انھوں نے سوالات کی روشنی میں روایت پسند اور قدامت پسند ذہنوں کو رموزِ کائنات اور جدید علوم کی برکتوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔

نہیں ہے گوشۂ خاطر کا اس طرف میلان | کہ غور کیجیے قدرت کے دیکھ کر آثار

اس کے بعد سولہ اشعار میں خزاں و بہار، روز و شب، موسم، مختلف ہواؤں، سمندر، بادل، سورج، بخار، برف، بارش، پہاڑ، اوس، کہر، اشجار، پھول پودے، پھل، کشتی، دریا، مسافر، سیاحت، تجارت، مدّوجزر، زلزلہ، زمیں کے طبقات وغیرہ اشیا کا تذکرہ کیا ہے۔ ہر شعر استفہامیہ ہے۔ آخر میں درج ذیل شعر آتا ہے، جو سوالوں کا جواب سمجھیے اور اس نفس مضمون کے ضمن میں اصلی گریز بھی۔ شعر یہ ہے۔

غرض کہ صفتِ حق کے نکات ہیں بے حد | کہ جن سے عالم کون و فساد ہے سرشار

اس شعر کے بعد مولانا نے "چاہیے" والی بات کہی ہے۔

نہ ان مظاہرِ قدرت پہ ڈالتے ہیں نگاہ | نہ ان رموز کی تحقیق ہے نہ استفسار
ہے جن علوم سے انسان کے حال میں برکت | ہے جن فنون سے گلزار شہر و ملک و دیار
ہیں جو علوم صنائع کے قبلہ و کعبہ | ہے جن فنون سے حُسنِ معاشرت کا سنگار
ہے جن علوم سے انسان کی زندگی سرسبز | ہیں جن فنون سے اہلِ زمانہ برسرِ کار
یہ ان کے نام پہ کہتے ہیں د، ف، اور ع | یہ ان پہ کرتے ہیں لاحول اور استغفار

اگرچہ ریل کی سیٹی نے کر دیا بیدار
یہ ڈھونڈتے ہیں وہی لیکھ اور وُہی چھکڑا

آخر میں مولانا کا جذبہ شدّت اختیار کرتا ہے اور وہ کہتے ہیں

چلے گی تیغ وہ کب جس کو کھا گیا زنگار
ہلے گا ہاتھ وہ کیا جس پہ گر چکا فالج

کیا ہے گردشِ گیتی نے جس کو ملیامیٹ
سمجھ رہے ہیں اسے یہ بزرگوار حصار

اس کے بعد مولانا نے معلّم کی زندگی کا نقشا پیش کیا ہے، لیکن اس مقام پر ہمیں قصیدے میں جھول نظر آتا ہے۔ یہاں تسلسل باقی نہیں رہا۔ کوئی شعر ایسا نہیں کہا گیا جو پہلے موضوع اور دوسرے موضوع میں واسطہ بن سکے۔ مولانا نے ایک ساتھ معلّم کا ذکر شروع کر دیا ہے جس سے قصیدے میں وحدتِ تاثر قائم نہیں رہتی۔ ملاحظہ فرمائیے:

ہیں وہ بھی زخمۂ فارس کے استخواں بردار
معلّموں کو جو دیکھو تو روحِ دقیانوس

کہ جس میں زندہ دلی کے نہیں رہے آثار
وُہی ہے ان کا پُرانا طریقۂ تعلیم

کہ جن سے تازہ ہے انشائے دلکشا کی بہار
وُہی خوشامدی القاب اور وُہی آداب

اس موقع پر مولانا نے اوٹ پٹانگ ترجمہ کرنے کے طریق، بچّوں کا ہل کے اور پکار پکار کے سبق دُہرانے، تاریک مکان میں طلبہ کی کثرت، مکتبی تعلیم کی اقتصادیات میں بے فیضی اور بغیر سند سرکاری ملازمت کی محرومی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں معلّم کی جسمانی صحت کا بھی اشارہ کیا ہے۔

فتورِ ہاضمہ، آشوبِ چشم، نزلۂ حار
سوائے ضعفِ دماغ اور بھی مرض ہیں کئی

اس کردار کے بعد طبیب کا کردار سامنے آتا ہے اس حصّے میں تسلسل ملتا ہے اور اس شعر سے آغاز ہوا ہے۔

ہنوز نبضِ طبابت کی سُست ہے رفتار
اسی روش پہ اطبّا کا ہے مرض مزمن

خدا نے ان پہ لگا دی ہے مہرِ استمرار
وہی سدیدی و قانون و تحفہ و مخزن

انھیں بھی مردہ پرستی کا ہے بڑا آزار
مجرّبات وہی، اور وہی ہیں دستورات

وُہی ہے فصد، وُہی منضج، وہی مسہل — وُہی سناۓ، گُلِ سُرخ و شربتِ دینار
معالجہ میں ترقی نہ کچھ مداوا میں — وُہی سبب، وُہی تشخیص اور وُہی تیمار
غذا بتائیں وُہی دال مونگ یا کھچڑی — بلا سے ان کی مرے یا جیے کوئی بیمار
نہ کچھ دوا کی ہے تحقیق، نے دوا سازی — وُہی دوا ہے جو پوڑیہ میں باندھ دے عطار

طبیب کے بعد مولانا نے دنیا پرست دینداروں کی زندگی کو بے نقاب کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ان کے عمل شعائرِ دین سے قطعی مختلف ہیں۔

ہر ایک علم و عمل میں پڑی ہے یہ پھٹکی — ہر ایک طرز و روش پر پڑی ہے یہ پھٹکار
امام و حافظ و واعظ، موذّن و مفتی — نہ کوئی دین میں پورا، نہ ٹھیک دنیا دار
زبس کہ دعوت و نذر و نیاز پر ہے معاش — ہوئے ہیں قوم میں پیدا بہت سے پنشن خوار
جو اینڈتے ہیں پڑے کھا کے لقمۂ خیرات — گئی حمیت و غیرت دلوں سے ان کے سدھار
وہ پھولتے ہیں، اُبھرتے ہیں، فخر کرتے ہیں — فقط اسی پہ کہ ہم ہیں بڑے نمازگزار
نہ خلق نیک، نہ ہمت بجا، نہ عزم درست — نہ حُبِّ قوم، نہ حُبِّ وطن، نہ حُبِّ تبار

اس سلسلے میں اور بھی اشعار ہیں جن کا لکھنا ضروری نہیں۔ اب چند اشعار وہ بھی ملاحظہ فرمائیے جن میں مذہب کی فروعات پر بحث رہتی ہے جس کا مذہب کی روح سے کوئی علاقہ نہیں۔

مدارِ دین ہے اس پر کہ جھٹ کتر ڈالیں — جو پائیں ٹخنے سے نیچی ذرا کسی کی ازار
فقط مسائلِ غسل و وضو و استنجا — یہی ہیں وحیٔ الٰہی کے آج کل اسرار
کہیں ضاد کی قرأت پہ غل غپاڑہ ہے — کہیں ہیں جہر پہ آمین کے جوتی اور پیزار
کسی گروہ میں ہے ضمّ فاتحہ پر جنگ — کہیں ہے مجلسِ میلاد موجبِ تکرار
ہیں سُنتوں میں یہی سُنتیں اُنھیں مرغوب — نکاح و دعوت و قیلولہ، عجلتِ افطار
گھٹی جو دور میں ان کے تو راستی کی قدر — بڑھی جو عہد میں ان کے تو ریش کی مقدار
ملے ٹکا تو کریں ثبت مُہر فتوے پر — غضب ہے نقد علیہ السلام کی جھنکار

مولانا نے مشائخ کا جہاں ذکر شروع کیا ہے وہاں بھی کوئی شعر

ربط پیدا کرنے والا نہیں کہا ہے بلکہ براہ راست بیان شروع کر دیا ہے۔

بہت سے راہزنی کر رہے ہیں بن کے پیر　　غریب قوم کو ہیں مارتے یہ شاہ مدار
لیا ہے معتقدوں کی نجات کا ٹھیکا　　کہ گویا ہیں یہی باغِ جناں کے ٹھیکے دار
ہزار دانہ کی تسبیح، گیروا کپڑے　　یہی ہیں ان میں علاماتِ اولیائے کبار

چند اشعار کے بعد یہ دو شعر قابلِ توجہ ہیں

اگر ہیں یاد تصوف کی اصطلاحیں چند　　تو پہنچا عرشِ معلّٰی پہ گوشۂ دستار
یہی ہیں آج ابوالوقت اور قطبِ زمان　　یہی ہیں شیخِ شیوخ اور زبدۂ احرار

عوام کے بارے میں مولانا کا جائزہ اور اظہار آج کے قاری کے لیے تعجب انگیز بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف کا سبب بھی۔ لیکن ایک چیز ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آج ہندستان میں عوام کا مفہوم اس سے قطعی مختلف ہے جو برطانوی سامراج کے ہندستان میں سمجھا جاتا تھا۔ جمہوریت میں عوام کو اہم مقام حاصل ہے برطانی سامراج میں سر، خان بہادر، اور رائے بہادر عظمت کا نشان تھے اور عوام کو گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مولانا کے یہاں بھی سب سے زیادہ معائب عوام کے کردار میں نظر آتے ہیں۔

عوام کی ہے یہ صورت کہ بس خدا کی پناہ　　ہر ایک پیشۂ بے غیرتی میں کارگزار
ہر ایک لہو میں شامل ہر اک لعب میں شریک　　کہیں کا سانگ تماشا، کسی کا ہو تہوار
دغا فریب ہو، چوری ہو، یا اُچکا پن　　نہیں ہے باک کسی کام سے اُنھیں زنہار

اب ان کے واسطے ہیں یہ مدارجِ اعلیٰ
پریس مَین، قُلی، کوچوان، خدمت گار

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نئی تہذیب سے بیزار نہ تھے وہ جدید علوم کے دلدادہ تھے اور سائنسی دور کی قدروں کا خیر مقدم کیا کرتے تھے مگر بعض پُرانی قدروں کو بھی دل سے لگائے ہوئے تھے وہ انگریزی رہن سہن کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ انگریزی فیشن کے معاملے میں وہ اکبر الہ آبادی کے ہم نوا

تھے اگرچہ تعلیم و ترقی کے سلسلے میں وہ سرسید کے مدّاح و مقلّد تھے۔ چنانچہ ہندستان میں وہ اس طبقے سے مطمئن نہیں جس میں انگریزی تہذیب رچ بس گئی ہے۔

رہا وہ جرگہ جسے چرگئی ہے انگریزی ∴ سو واں خدا کی ضرورت، نہ انبیا درکار
وہ آنکھ میچ کے برخود غلط بنے ایسے ∴ کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش، تو بس دریدہ کوٹ ∴ سواریوں میں سواری، تو ڈم کٹا رہوار
جو ارد لی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید ∴ بجائے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹل مین ∴ اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے، نہ اخلاق، نے خدا ترسی ∴ گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں، یا ریڈی کل ہیں ∴ مگر ہیں قوم کے حق میں بہ صورتِ اغیار
نہ انڈین میں رہے وہ، نہ وہ بنے انگلش ∴ نہ ان کو چرچ میں آنے، نہ مسجدوں میں بار
ہے استفادہ مکالے سے جن کو انشا میں ∴ قلم کے زور سے بنتے ہیں قوم کے غم خوار

اس کے بعد قوم کا زوال دکھایا ہے۔ رسومِ بد کا تذکرہ کیا ہے۔ کردار کی خرابیوں کو پیش کیا ہے، جس کے باعث ادبار میں قوم مبتلا ہوئی۔

اسلاف کی عظمت اور خوبیوں کا بیان بھی شامل ہے۔ اس کے بعد نئے علوم و فنون کی ترقی اور نئے دور میں ترقی کے موقعوں کا امکان بتایا ہے۔

پلٹ گیا ہے زمانہ بدل گئی ہے رُت ∴ نمو کا وقت ہے اور ابتدائے فصلِ بہار
نہیں بعید کہ ہو جائیں ایک سب جَل تھَل ∴ برس رہا ہے ترقی کا ابرِ گوہر بار

مولانا نے قصیدہ کے آخری جز کو اس شعر پر ختم کیا ہے

کرد نگا اب میں قصیدے کو اک دعا پر ختم ∴ کہ جس کے طرزِ بیاں میں ہوں تازہ نقش و نگار

مولانا نے دعائیہ عنصر میں دوسرے قصیدہ نگاروں کا تتبع بھی کیا ہے اور اپنی انفرادیت کا مظاہرہ بھی۔ قصیدہ نگاری میں دعائیہ جز میں یہ روایت سی قائم رہی ہے کہ تمام شعرا آسمان اور اس کے متعلقات ثوابت و سیّار کی

پائندگی اور جمال و جلال کا تذکرہ کر کے اپنے ممدوح کے اوصاف میں وہ ابدی عناصر پیدا ہونے کی دعا کرتے رہے ہیں لیکن مولانا نے اپنی دعا، زمین اور اس کی قدرتوں کے بیان سے شروع کی ہے اور آسمان کا تذکرہ بعد میں کیا ہے۔

رہے زمانہ میں جب تک زمین کو گردش ۔۔۔ بنائیں زاویہ تا محور اور سطحِ مدار
رہے زمین پہ تا ایک سال کے اندر ۔۔۔ برابری میں سدا امتدادِ لیل و نہار
رہے زمین میں تا قوتِ کشش باقی ۔۔۔ اور اس کشش سے گریں ٹوٹ ٹوٹ کر اثمار
یہ ایک چاند رہے تا زمین کا خادم ۔۔۔ جلو میں تا زحل و مشتری کے ہوں اقمار
رہے نجوم میں جب تک زمین سیارہ ۔۔۔ اور آفتاب رہے مثل نقطۂ پرکار
خدا ہر ایک مسلمان کو کرے روزی ۔۔۔ معاشِ نیک و دلِ پاک و خوبیٔ کردار
حصولِ علم و رہِ مستقیم و فہمِ سلیم
جمالِ صورت و معنی، کمالِ عزّ و وقار

دعائیہ اشعار پڑھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ قصیدہ کے اس جز میں روایت پسندی صرف اس حد تک ہے کہ قصیدہ کا آخری جز دعائیہ ہے لیکن دعا کا انداز مولانا کا اپنا ہے۔ اس میں آسمان اور زمین کی گردش کا نیا نظریہ ہے۔ آسمان کو زمین پر برتری حاصل نہیں ہے۔ انسان کے لیے زمین پیاری چیز ہے۔ وہ ابد تک انسان کی رفیقہ رہے گی۔ آسمان اپنی تمام جگمگاتی کائنات کے ساتھ زمین کا خادم ہے اور زمین پر انسان کا پورا تسلّط ہے۔ اس مٹّی سے انسان کا قریبی رشتہ ہے۔ انسان کے کردار کی چمک سے یہ جہانِ آب و گِل منوّر ہے اور مولانا نے مُسلمانوں میں اپنی زمین سے یگانگی، شیفتگی اور خلوص و وفا کے ساتھ ساتھ کردار کی وہ تابناکی پیدا کرنے کی دعا مانگی ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔

(۲) مولانا کا ایک قصیدہ "نوائے زمستان" دسمبر ۱۹۱۰ء کی تصنیف ہے۔

یہ ایک سو ترپن (۱۵۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصیدہ نگاری کے لوازم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس قصیدے کا اصل موضوع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرنا ہے۔

اس قصیدہ کے عنوان اور تشبیب دونوں میں بڑی مناسبت ہے اور خصوصاً تشبیب نہایت قابلِ تحسین ہے۔ "شکایتِ زمانہ اور ذکرِ بہار" تشبیب کے رسمی موضوعات رہے ہیں مولانا کی انفرادیت نے اسے قبول نہیں کیا انھوں نے تشبیب میں سورج کی گردش کا بیان کر کے ایک الگ راہ پیدا کی ہے لیکن تشبیب کی فضا میں حسنِ بہار کی لہک مہک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

سوار جہاں گرد خورشید رخشاں — گیا تاجدی جب بہ تقدیرِ یزداں
تو ماہِ دسمبر کی پچیسویں کو — ہوا جانبِ استوا گرمِ جولاں
مگر استوا پر نہ ٹھہرے گا ہرگز — کرے گا سفر تا گزر گاہِ سرطاں
نہیں خطِ سرطاں بھی جائے توقف — وہاں سے بھی پلٹے گا افتاں و خیزاں
رہے گی اسی طرح اس کی تگ و دو — کہ ہے گردشِ گوئے محکومِ چوگاں
کبھی بقعۂ نور ارضِ جنوبی — کبھی سرزمینِ شمالی درخشاں
اگر ایک جانب خزاں کا عمل ہے — تو ہے دوسری سمت فصلِ بہاراں
اگر صبح دم شرق ہے اس کا منظر — تو ہے شام کو غرب اس کا شبستاں
کہیں دن ہے مستورِ ظلماتِ شب میں — کہیں رات دن کی تجلّی میں پنہاں
کسی منطقے میں ہے گرمی کی شدّت — کسی جا ہے آغازِ فصلِ زمستاں

اس کے بعد گریز کے اشعار ہیں جن میں حمدیہ اشعار کے بعد مسلمانوں کے یہاں پیشۂ گداگری کا ماتم کیا ہے۔

گدایانِ مبرم کو گر آج دو گے — تو پاؤ گے کل صبح پھر ان کو نالاں
نہ دیتے تو کچھ یہ بھی کھاتے کماتے — یہ دینا ہے مستلزمِ قتلِ انساں
جو منگتا گدا ہیں، تو داتا گداگر — گداگر کے معنی انھیں پر ہیں چسپاں

مولانا اسمٰعیل میرٹھی، سرسیّد کی علمی تحریک سے متاثر تھے انھوں نے سرسیّد کی عقلیت پسندی کو بھی ادب میں پسند کیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مولانا کی وابستگی زندگی بھر رہی۔ اس کی مالی اعانت بھی کرتے رہے اور موقع موقع پر اپنی شاعری کے ذریعہ یونیورسٹی کی اہمیت کو واضح کرتے رہے۔ اس قصیدے میں ذہنی لگاؤ کے ساتھ یونیورسٹی کی مالی امداد کے لیے بھی اپیل ملتی ہے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

کرو ورسٹی اپنی پہلے مکمل — اسی پر ہے موقوف کل جبرِ نقصاں
بہم تربیت ہو دلی اور دماغی — رہیں ہم قدم علمِ ادیان و ابداں
اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو — تو ہے ورسٹی چشمۂ آبِ حیواں

خزینہ، دفینہ نہیں ہے تو کیا غم — نہ ہونا، نہ ہونا، نہ ہونا ہراساں
زراہِ خلوص ایک کوڑی بھی دو گے — تو رکھے گی وہ قدرِ لعل بدخشاں
کرو جمع جو جو تو ہو جائیں سو سو — بنے قطرہ قطرہ سے دریائے عمّاں
ہزاروں سے بڑھ کر ہو لاکھوں یہ نوبت — ہو لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کی میزاں
کمربستہ ہو کر کرے کام بھی کچھ — سُنے جو کوئی یہ نوائے زمستاں

اس قصیدے میں دعا کا جز شامل نہیں ہے مولانا کا ذہن قصیدے کے رسمی ارکان کا پابند نظر نہیں آتا۔

✓ (۳) "خدائی لشکر" مولانا کا ایک اور مشہور قصیدہ ہے۔ یہ ۵ر اگست ۱۹۱۱ء کی تصنیف ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ کی فرمایش پر ایک ہی نشست میں کہا گیا ہے۔ عنوان بھی جدّت لیے ہوئے ہے مولانا نے طلبہ کو خدائی لشکر قرار دیا ہے۔ اس میں انسان کی پیدایش تربیت کے سامان اور مدارجِ بچے کی شخصیت کی نشوونما اور تعلیم کے ارتقائی منازل کو نظم کیا ہے۔ آخر میں طلبہ کو فیضی اور ابوالفضل جیسی ہمہ گیر

شخصیات کا حامل بننے کی تلقین کی ہے۔ یہ قصیدہ بھی دراصل مقتضب ہی کہا جائے گا۔

طلسماتِ جہاں اور فریبِ خیال دو مختصر قصیدے ہیں۔ ان میں مولانا نے معرفت کے رموز و اسرار کا بیان کیا ہے۔ یہ دونوں قصیدے مولانا نے اپنے برادرِ طریقت پیر غلام محمد وکیل رئیس لدھیانہ کی خدمت میں بطور نذر پیش کیے تھے۔ "طلسماتِ جہاں" کی تاریخ تصنیف ۷ ار جون ۱۸۸۱ء ہے۔ اس میں صرف چودہ (۱۴) شعر شامل ہیں۔ آخر شعر یہ ہے۔

آج نذرانہ بہ تعجیل کیا ہے تیار منتظر ریل کے ہیں پیرِ معلّی القاب

"فریبِ خیال" کی تاریخ مرقوم نہیں۔ اس میں تینئیس (۲۳) اشعار شامل ہیں آخری شعر میں مزاحیہ رنگ ہے جو آپس کے تعلقاتِ یگانگی کا مظہر ہے۔

اس خرافات کو کریں منظور پیرِ لدھیانوی گرو گھنٹال

---

(۴) جاڑا اور گرمی: مولانا نے یہ قصیدہ ۱۸۸۸ء میں مرتب کیا اس میں چونسٹھ (۶۴) شعر ہیں۔ یہ قصیدہ مولانا کے مذکورہ قصیدوں سے مختلف ہے۔ اس قصیدے میں تشبیب، گریز، مدح، دعا، کسی بات کی پابندی نہیں ہے بلکہ "جاڑا اور گرمی" کو تجسیم کی شکل دے کر ان کے دلائلِ برتری کو مکالمہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

(۵) خشک سالی: اس قصیدے میں ستائیس (۲۷) شعر شامل ہیں۔ ۱۸۷۷ء کی تصنیف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب "روم و روس" کی جنگ ہو رہی تھی۔ ادھر ہندستان میں بارش نہ ہونے سے قحط کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ موضوع کے اعتبار سے اس قصیدے کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں براہِ راست تخاطب کا انداز ہے۔ لوازمِ قصیدہ نگاری سے انحراف ملتا ہے۔ زبان بدلی ہوئی ہے۔ حرف و صوت کا جو آہنگ اس

قصیدے میں پایا جاتا ہے وہ اس قصیدے کی بڑی خوبی ہے۔

(۶) اختلاف رائے: اس قصیدے میں پچیس (۲۵) اشعار ہیں۔ یہ قصیدہ بروز سہ شنبہ یکم شوال ۱۲۹۷ھ ہجری مطابق ۷ر ستمبر ۱۸۸۰ء بوقت شب بر بالاخانہ منشی نجم الدین لکھا گیا تھا۔ اس قصیدے میں عید کے چاند پر اختلاف رائے کا اظہار ملتا ہے۔

اب کے رویت میں آگیا ہے خلل — رمضان ایک اور عید ڈبل
یعنی انتیس، تیس، اٹھائیس — کیا تواریخ میں پڑا ہے بل
آج چکھی کسی نے افطاری — کوئی روزہ ہی کو گیا ہے نگل

جا پڑا دیوبند میں پہلے — چاند کا بھی گیا تھا پاؤں پھسل
ایک دن تک وہیں رہا ناچار — سب کی آنکھوں سے ہوگیا اوجھل

گوالٹاوہ میں چھپ گیا فتویٰ — علما کا نہیں ہے اس پہ عمل
بست و ہفتم کو چاند دیکھ لیا — خود غلط تھی شہادتِ اوّل
دیکھ کر اختلاف دنیا کا — یاد آئی ہے مجھکو ایک مثل
کون سی ہے مجھے بتا تو سہی — اونٹ رے اونٹ تیری سیدھی کل

(۷) عالم شہود: اس قصیدے میں تیس (۳۰) شعر ہیں۔ ۱۲۹۷ ہجری مطابق ۲۲ر جولائی ۱۸۸۰ء موافق ساون سمت ۱۹۳۷ کو مرتب کیا گیا ہے۔

یہ قصیدہ مولانا کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ شبِ برات کے موقع پر تصنیف کیا گیا ہے لیکن مولانا نے "شبِ برات" میں بھی وحدت الشہود کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔

صاحبِ نظر کو فرقِ شب و روز کچھ نہیں — ہر روز، روزِ عید ہے، ہر شب، شب برات
جو کچھ کہ ہے خیال میں خواب و خیال ہے — لے کر ازل سے تا بہ ابد کل معاملات

سرکار کے بنائے ہوئے ہیں یہ سب عدد اور عالمِ شہود ہے گویا شبِ برات
بارود ایک سی ہے مگر وزن ہیں جدا ہیں مختلف ظہور میں آثار اور صفات
سہرہ ہو، پھلجڑی ہو، پٹاخہ ہو، یا انار سب میں بھری ہوئی ہے وہی ایک پاک ذات

ہے اصلِ نور و نار فقط ذات بے نشان دھوکا نگاہ کا ہے قیودِ تعینات

کعبہ ہو، ہردوار ہو، یا دیرِ سومنات شانیں جدا جدا ہیں تجلّی تو ایک ہے

(۸) اعترافِ عنایت: یہ قصیدہ شیخ یعقوب علی کی فرمایش پر ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس قصیدے میں ستائیس (۲۷) شعروں کے بعد "مطلع ثانی" کہا گیا ہے جس میں اٹھائیس (۲۸) شعر درج ہیں۔ کلیاتِ مولانا اسمٰعیل میں صرف یہی ایک قصیدہ ایسا ملتا ہے جس میں لوازمِ قصیدہ کی مروّجہ پابندی ملتی ہے۔ گریز، مدح اور دعا، خاتمہ سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ اس قصیدے میں انھوں نے اپنے "محبوبِ حقیقی" کو ممدوح قرار دیا ہے۔

(۹) خزینۂ علم: یہ قصیدہ ۱۸۷۰ء میں مولانا نے اپنے دوست ڈپٹی نجم الدین کی فرمایش پر لکھا تھا۔ اس میں چوالیس ۴۴ شعر ہیں۔ جہل و علم کا بیان ہے۔ آثار و مظاہر کی روشنی میں خدا کی ذات کو "نورِ آگہی" تسلیم کیا گیا ہے۔ اس قصیدے میں مشکل پسندی ہے مولانا کے تمام قصائد میں یہ قصیدہ قدیم قصیدہ نگاروں کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔

مدحیہ قصائد

مولانا نے آٹھ قصیدے مدحیہ طور پر کہے ہیں۔

۱۔ احساساتِ قلبی: ۱۸۶۹ء بمقام سہارنپور (یو۔پی) ۱۰ شعر
۲۔ درِّ بے بہا: ۱۹۱۷ء در مدح نظام دکن ۱۶ شعر

۳ - تہنیت جشنِ جوبلی حضور ملکہ وکٹوریہ قیصرِ ہند دام اقبالہا ۶۸ شعر

۴ - تہنیت سال گرہ حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند دام اقبالہا ۱۳ شعر

۵ - نویدِ مقدم شاہی : مرتبہ ۶ر جنوری ۱۹۱۱ء بروز جمعہ
۴ر محرم الحرام ۱۳۰۰ ہجری ۵۳ شعر

۶ - جشن تاج پوشی، اعلیٰ حضرت جارج پنجم شاہ قیصر
کہ بدارالخلافہ دہلی انعقاد یافتہ
۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء بروز جمعہ ۷۹ شعر

۷ - تہنیت سالگرہ ملکہ وکٹوریہ ۱۸۹۲ء میں بتقریب
تہنیت سالگرہ حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند
سید اقبال احمد نے پڑھا تھا۔ ۸ شعر

۸ - جشنِ سالگرہ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی ۱۰ شعر

مولانا نے "احساساتِ قلبی" میں ضلع سہارنپور کے کسی رئیس کی مدح لکھی ہے۔ قصیدے میں بھی وہ نام نہیں چھپا ہے۔ ممدوح کے اوصاف کو قدما کے انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ آخر شعر سے باقی قصیدہ کی فضا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

طریقِ داد میں پیدا ہے عدلِ فاروقی
امورِ دین میں ظاہر حیائے عثمانی

"دُرِ بے بہا" اصلاً اس قصیدے کی تشبیب ہے جس کو مولانا لکھنا چاہتے تھے۔ اس میں ہندستان کے دریا، پہاڑ، میدان، سمندر، مرغ زار، ریگ زار، برسات، جاڑا، گرمی، اور فطری مناظر کا بیان بڑی سچائی اور والہانہ کیفیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تشبیب کا یہ عالم ہے تو قصیدہ کیا ہوتا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اے ملکِ ہند سچ مچ تو لعلِ بے بہا ہے   جنت نشان تیرا صحرائے دل کشا ہے

آن وادا پہ تیری مفتوں ہے رُبعِ مسکوں
تو ہے عروسِ گیتی یا جانِ ایشیا ہے

رُخ سے تیرے عیاں ہے نقش و نگارِ فطرت
رعنائیوں کا خلعت تجھ کو عطا ہوا ہے

پربت ترا ہمالہ دیوِ بلند بالا
حدِ شمال جس سے بامِ فلک نما ہے

پٹکا تری کمر میں باندھا ہے بندھیا نے
وادی زیر و بالا گویا جُدا جُدا ہے

آبِ اٹک سے لیکر تا سرزمینِ مشرق
سیراب ندیوں سے میدان پُرفضا ہے

اک سطحِ مرتفع ہے وہ خطۂ جنوبی
جس سرزمین پہ بہتا دریائے نربدا ہے

دو پہلوؤں میں اس کے ہیں دو پہاڑ قائم
بحرِ محیطِ جن کے قدموں سے آلگا ہے

قطعات

کلیاتِ اسمٰعیل میں ہمیں صنفِ سخن کی تخصیص میں دقّت پیش آتی ہے۔ مثلاً ص ۲۲۵ - ۲۲۶ پر کس کے لیے ہے" اور" محبت" کو قصاید کے تحت رکھا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں قطعات میں شامل ہونی چاہییں اسی لیے ہم نے قصاید میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح صفحہ ۲۲۷ تا ۲۳۰ "خواب راحت" ہے اس میں چون (۵۴) شعر ہیں۔ قطعات کے ذیل میں اس کو چھاپا گیا ہے۔ اس کا بیان اور فضا نظم کی ہے۔

کلیات میں صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۸ ہمیں نو (۹) قطعے نظر پڑے وہ نظموں کے سلسلے میں چھپے ہیں۔ قطعات کے تحت درج نہیں ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم ایک اصول سامنے رکھ کر قطعات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ شاعرانہ قطعات (۲) موضوعاتی قطعات (۳) تاریخی قطعات چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

شاعرانہ قطعات (دو شعری)

چغل خوری

چغلی ہے بُرا کام بچو اس سے ہمیشہ — جو لوگ ہیں بے شرم اُنھیں کا ہے یہ پیشہ
یہ لت ہے بُری اس سے نہیں ہاتھ کچھ آتا — اکثر تو چغل خور ہی ذلّت ہے اٹھاتا

اس قطعے میں پہلے شعر کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہیں اور دوسرے شعر کے مصرعے ہم قافیہ ہیں مگر پہلے اور دوسرے شعر کے مصرعوں میں قافیہ مختلف ہے۔ معنی کے اعتبار سے چغل خوری کو "لت" قرار دیا ہے یہ نفسیاتی نکتہ ہے۔

آزادی غنیمت ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر — تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو — بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

اس قطعہ میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور دوسرے شعر میں بھی دو مصرعے ہم قافیہ مگر دوسرے شعر میں "ہو" ردیف بھی شامل ہے۔ آزادئ ذہن کو ان مادّی نعمتوں پر ترجیح دی ہے جن میں خودداری باقی نہ رہے اور خطرہ لاحق ہو۔

طلب خیر میں قناعت سے حرص بہتر ہے

جو طلبِ خیر میں قانع ہوا — اپنی ترقّی کا وہ مانع ہوا
ایسی قناعت سے طمع خوب ہے — حرص ہی اس راہ میں محبوب ہے

پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ "ہوا" ردیف ہے مگر دوسرے شعر میں قافیہ بدلا ہوا ہے اگرچہ دونوں مصرعوں میں ہم قافیہ

الفاظ ہیں مگر "ہے" ردیف پہلے شعر کی ردیف سے مختلف ہے۔ علم اخلاق میں 'حرص' بُری شے ہے اور 'قناعت' انسانی وصف ہے لیکن طلبِ خیر میں حرص کو قناعت پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ یہاں جذبۂ حرص سے ہی مستقبل میں فیض جاری رہ سکے گا۔ ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ بذاتِ خود اشیاء کی صفات کو اچھا، بُرا سمجھنا فضول ہے ان کی اچھائی بُرائی دراصل ان کے استعمال اور موقع و محل کی پابند ہیں۔

ہمّت

گھوڑ دوڑ میں کودائی کی بازی تھی ایک دن — تازی پے، کوئی ترکی پے اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا اِدھر — جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

اس قطعے کے دونوں شعروں میں ردیف 'تھا' کی پابندی ہے اور اشعار ہم قافیہ ہیں۔ پہلے اور تیسرے مصرع میں قافیہ نہیں ہے۔ تمثیل کے انداز میں ایک نفسیاتی نکتہ کو پیش کیا ہے۔ بعض لوگوں کی طبیعت میں جھجھک شامل ہوتی ہے یہ کمزوری، عمل کی راہ میں دشواری پیدا کرتی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے نہیں دیتی۔ "ہمت" کا جوہر حصولِ مقصد کا واحد ذریعہ ہے۔

ہر کام میں کمال اچھا ہے

کوئی پیشہ ہو زراعت یا تجارت یا کہ علم — چاہیے انسان کو پیدا کرے اس میں کمال
کاملوں کی عمر بڑھ جاتی ہے خود کر لو حساب — باہنر کا ایک دن اور بے ہنر کا ایک سال

دونوں شعر ہم قافیہ ہیں۔ پہلا اور تیسرا مصرع قافیہ کا پابند نہیں ہے۔ اس میں تلقین کی گئی ہے کہ ہاتھ کا کام اور دماغ کی محنت دونوں میں انسانی عظمت ہے لیکن اپنے کام میں انسان کو کمال حاصل کرنا چاہیے اس سے کارناموں میں ابدی رنگ پیدا ہوتا ہے۔

قول و فعل میں مطابقت چاہیے

دیرینہ رسم و راہ سے قطعِ نظر کرو | برتاؤ آج کل کے زمانے کے اور ہیں
دل شرق میں پڑا ہے، یہ کہتے ہیں غرب کی | کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں

'زمانے' اور 'دکھانے' قوافی ہیں۔ 'کے' اور 'ہیں' ردیف۔ پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیہ نہیں ہے۔ ابن الوقت انسان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے وہ اصول کا پابند نہیں ہوتا اس کا سماج میں اعتبار نہیں رہتا۔ اس قطعے میں "کھانے کے دانت اور دکھانے کے دانت اور" محاورہ کو خوبی سے نظم کیا ہے جس نے شعر میں منطقی استدلال کے ساتھ تاثیر پیدا کردی ہے۔

قطعات شاعرانہ (سہ شعری)

نقاد

وہ دانا کہ جن کا ہوا ہے گزر | نشیب و فرازِ تواریخ پر
نہیں جنسِ مشکوک کے مشتری | روایت درایت کے ہیں جوہری
کسوٹی پہ کستے ہیں دیتے ہیں آنچ | ہر اک چاشنی کی مقرر ہے جانچ

اس قطعے میں ہر شعر کا قافیہ جداگانہ ملتا ہے اور ہر شعر کے دونوں مصاریع ہم قافیہ ہیں۔ اہلِ نظر ہر چیز کی پرکھ اصولی بنیاد پر کرتے ہیں۔ جذبات کے تحت ان کے فیصلے نہیں ہوا کرتے۔

محنت سے راحت ہے

جو تو نے غفلت میں وقت کھویا نہ کھیت جوتا نہ بیج بویا
تو ایسی ڈوبی ہوئی اسامی سے کوئی حاصل بٹائے گا کیا

رہے گا یہ کھیت ہاتھ اس کے جو ہل سے کشتی لڑے گا دن بھر
جو ہار بیٹھے گا اپنی ہمت تو وہ زمیں کو اُٹھائے گا کیا

خوراک و پوشاک کے ذخیرے دبے پڑے ہیں زمیں کے اندر
جو کر کے محنت نہ کھود لے گا تو خاک پہنے گا کھائے گا کیا

شعروں کے مصاریع دوم میں قافیہ کی پابندی ہے اور 'کیا' ردیف ہے۔ زراعت کی راہ سے انسان کو عمل کی تلقین کی ہے۔ نیز یہ ظاہر کیا ہے کہ محنت کا پھل متوقع طور پر انسان کو ملتا ہے لیکن محنت کے ذریعے دوسرے بھی فوائد حاصل ہوتے ہیں جن کا انسان کو پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ پھر تہذیب و تمدن کا دار و مدار محنت کش انسان پر ہے۔

انتقام علاجِ خطا ہے

جو انتقام نہ لینے سے ہو خطا افزوں　　تو یہ تمہاری خطا ہے، جو انتقام نہ لو
وہ کام جس سے کہ اوروں کو فائدہ پہنچے　　تم اس کو کرنے سے زنہار ہاتھ تھام نہ لو

جو انتقام سے منظور ہو خوشی اپنی
تو ایسے کام کا تم بھول کے بھی نام نہ لو

تینوں شعروں کے مصاریع دوم ہم قافیہ ہیں۔ 'نہ لو' ردیف ہے۔ اس قطعے میں سماجی خدمت کی تعلیم کو نظم کیا گیا ہے کہ ہر کام سماج کی بہبود کے لیے ہونا چاہیے۔ محض اپنے نفس کی خوشی کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہیے۔

پیش کش

سنگ ریزوں کا ہے لے جانا وہاں شرمندگی
تودہ، تودہ ہو جہاں گنجینۂ لعل و گہر

ہے تسلی یوں کہ پتھر ہو، گہر ہو، لعل ہو
مہرِ عالم تاب کے یہ سب ہیں منظورِ نظر

گرچہ اس قابل نہیں لیکن برسمِ پیش کش
جلدِ کلیات ہے نذرِ جنابِ پورٹر

ان اشعار کے مصاریعِ دوم میں ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ اس قطعے میں خیال کی باریکی قابلِ توجہ ہے۔ پتھر پر ایک خاص مدت تک سورج کی شعاعوں کے اثرات اس کو ہیرا بنا دیتے ہیں، پھر عمومی طور پر سورج کی کرنیں پتھر، موتی، لعل ہیرا، کنکری سب پر جگمگاتی ہیں۔

قطعات شاعرانہ (چہار شعری)

غصّہ کا ضبط

دل میں جب کوند جائے برقِ غضب — اور طبیعت ہو انتقام طلب
اس خطرناک راہ میں جو مرد — کر سکے آتشِ غضب کو سرد
ڈانٹ کر دیوِ نفس کو لے تھام — اور نہ لائے زباں پہ سخت کلام
مشورت عقل کی سُنے اس دم — ہے وہی اپنے وقت کا رستم

ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں مگر تمام اشعار مختلف قافیے کے ہیں۔ اس میں انسان کو سفلی جذبات پر قابو پانے کی تلقین ہے۔ 'غصّہ' کمزوری کی علامت ہے۔ غصّے کو برداشت کرنا بہادری ہے اور عقل کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیے۔

ادب

ادب ہی سے انسان انسان ہے — نہ سیکھے ادب جو، وہ حیوان ہے
جہاں میں ہو پیارا نہ کیونکر ادب — کہ ہے آدمیت کا زیور ادب

نہ ہو جس کو اچھے بُرے کی تمیز　　نہ وہ گھر میں پیارا، نہ باہر عزیز
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب　　یہ سچ بات ہے، بے ادب بے نصیب

پہلے شعر میں "ہے" ردیف ہے۔ باقی اشعار میں ردیف کی پابندی نہیں ہے۔ ہر شعر کا قافیہ مختلف ہے لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ مولانا کا یہ قطعہ بہت مقبول اور لوگوں کی نوکِ زباں پر ہے۔ اس میں تجربہ کی چمک اور سچائی ہے۔

ان قطعات سے مختلف ایک قطعہ "کس کے لیے ہے" ملاحظہ فرمائیے۔

تا کوئی فرخندہ پے دھوئے قدم　　ہیں اسی دھن میں رواں گنگ و جمن
تا کرے گلگشت کوئی خوش نظر　　منتظر ہے رونقِ باغ و چمن
تا معطر ہو کوئی عالی دماغ　　دوڑتی ہے نکہتِ مشکِ ختن
چاہتی ہے لذتِ قند و نبات　　ہو کوئی طوطی منش، شکر شکن
تا کسی نازک گلے کا ہار ہو　　قعرِ دریا سے چلا درِ عدن
گر تصور میں نہ ہو اک جامہ زیب　　کب کرے تیار، کاریگر چکن

مل گئی گنگا میں گنگا بن گئی
جب الٰہ آباد میں پہنچی جمن

مولانا کے قطعات میں نفسِ مضمون اور طرزِ بیان کے لحاظ سے درجِ ذیل کو قطعات میں شمار کیا جانا چاہیے۔

خوابِ راحت　　(۵۴ شعر) مرتبہ یکم اگست ۱۸۸۷ء
بانگِ درا　　(۱۷ شعر) عید الفطر ۱۳۳۹ ہجری روز دوشنبہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۱۱ء
تماشائے خیالی　　(۱۱ شعر) پیر جی غلام محمد وکیل و رئیس لدھیانہ برادرِ طریقت کے واسطے بطور نذرانہ ۱۸۸۳ء
ساون کی جھڑی　　(۶ شعر)
کاشتکاری　　(۱۹ شعر)

بخیلی اور فضولی (۶ شعر)
ایک گدھا شیر بنا تھا (۱۰ شعر)
قرض (۱۲ شعر) ۱۸۹۳ء
سر سیّد احمد خاں (۲۸ شعر) ۱۸۸۰ء

موضوعاتی قطعات

مولانا کے قطعات کی تعداد کافی ہے۔ بہت سے قطعات میں کسی خاص موقع کا بیان ہے یا بعض غیر رسمی موضوعات شامل ہیں۔ اس مقام پر ہم موضوعات کی فہرس لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب موضوعاتی قطعات میں شامل ہیں۔

مُسلمانوں کی تعلیم، سادات کی امداد، نام نہاد رہنمایانِ قوم، مراسم بیہودہ (شبِ برات)، شکر نعمت (رمضان)، طوافِ بیت اللہ، علم و حکمت جہل و افلاس، (عیدِ قرباں میں غریب کا حال) فیض عام اسکول میرٹھ اور مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے مالی امداد، یادِ رفتگان، کوسِ رحیل، فراق دائمی (مرگ حالی کا ناتمام نوحہ) اخبار زمیندار کی ضبطی، نجم الاخبار، جنگِ یوروپ ۱۹۱۴ء۔ کلیاتِ اسمٰعیل میں آٹھ تاریخی قطعات بھی درج ہیں۔

رباعیات

رباعی اہلِ عجم کی ایجاد ہے۔ ابو شکور بلخی متوفی ۳۴۳ ہجری کی رباعی کو قدیم نمونہ شمار کیا گیا ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی نگاروں میں عمر خیام، سرمد، ابو سعید، ابوالخیر، سحابی، نجفی، اور نظامی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رباعی کے مختلف نام

عہدِ قدیم سے آج تک اس صنفِ سخن کے مختلف نام رہے ہیں۔

مثلاً ترانہ، دوبیتی، چہار مصرعی، جُفتی، اور خصی۔ اس کا ابتدائی نام ترانہ ہے اور آج "رباعی"۔

اُردو رباعی

محمد قلی قطب شاہ کو اردو رباعی کا پہلا شاعر سمجھنا چاہیے۔ قطب شاہ کے کلیات میں خمریہ، نعتیہ، مدحیہ اور عشقیہ ہر رنگ کی رباعیاں موجود ہیں۔

شمالی ہندوستان میں درد، سودا، میر اور میر حسن نے رباعیاں کہی ہیں جن کی اردو ادب میں اہمیت ہے۔

رباعی کی ایک دلچسپ قسم رباعی مُستزاد بھی تھی۔ درد کی ایک مُستزاد رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

اے درد شبِ قدر ہے ہر زلفِ سیاہ — گر دل سے ہو راہ
ہر خط میں لکھی ہوئی ہیں آیات الٰہ — ٹک کر تو نگاہ
جوں آئینہ حیران ہوں میں سر تا پا — ہے عشق گواہ
آتا ہے نظر حسن میں جلوہ کیا کیا — اللہ اللہ

انشا، جرات اور نظیر اکبر آبادی کی رباعیاں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ میر انیس کے یہاں پانسو سے زیادہ اور دبیر کے یہاں دو سو کے قریب رباعیاں ہیں غالب نے پندرہ سولہ اور ذوق نے سولہ سترہ رباعیاں کہی ہیں۔ مومن نے اس صنفِ سخن کی طرف خصوصی توجّہ کی ہے۔ ان کے یہاں تقریباً ایک سو چالیس رباعیاں ہیں۔ رباعی کی اصل قدر و منزلت کا زمانہ اصلاً حالی، اکبر اور اسمٰعیل کا دور ہے۔ حالی کے دیوان مطبوعہ ۱۸۹۳ء (مطبع انصاری دہلی) میں تقریباً ایک سو رباعیاں شامل ہیں۔ جن میں سات رباعیاں "رباعیات قدیم" کے عنوان کے تحت ہیں۔ مولانا اسمٰعیل نے اسّی (۸۰) رباعیات کہی ہیں۔ جن کی بحروں میں وسعت اور موضوعات میں تنوّع ہے۔

مولانا نے ایک رباعی میں قوم کے متضاد کردار کی آئینہ داری کی ہے اس میں لطیف مزاح کی کیفیت پیدا کر کے قوم کے احساس وشعور کو جگایا ہے۔ اس کا عنوان ہے "جھوٹی نفرت"

لاکھوں چیزیں بنا کے بھیجیں انگریز | سب کرتے ہیں دندانِ ہوس اُن پہ تیز
چڑتے ہیں مگر علوم انگریزی سے | گُڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز

مولانا کی باقی رباعیوں کے دو مخصوص دائرے ہیں۔

(۱) مسئلۂ وحدت الوجود (۲) اخلاق و کردار

ہمہ اوست کے نظریے اور اس کی مختلف منزلوں کے متعلق مولانا نے اکیاون (۵۱) رباعیاں کہی ہیں۔ ان میں قرآنی تلمیحات، اشارات متصوفانہ اصطلاحات، حدیث وفقہ کے نکات بزرگانِ دین کی رشد و ہدایت اور صوفی شعرا کے خیالات کا ذخیرہ شامل ہے۔ لغت، زبان اور بیان تمام چیزیں موضوعات کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔

قرب

مکشوف ہوا کہ دید حیرانی ہے | معلوم ہوا کہ علم نادانی ہے
ڈالا ہے تلاشِ قرب نے دوری میں | مشکل ہے یہی بڑی کہ آسانی ہے

بے نشانی

بندہ ہوں تو اِک خدا بناؤں اپنا | خالق ہوں تو اک جہاں دکھاؤں اپنا
ہے بندگی وہم، اور خدائی پندار | میں وہ ہوں کہ خود پتا نہ پاؤں اپنا

عبودیت حجابِ ربوبیت

ڈھونڈا کرے کوئی لاکھ کیا ملتا ہے | دن کا کہیں رات کو پتا ملتا ہے
جب تک کہ ہے بندگی، خدائی کا حجاب | بندہ کو بھلا کہیں خدا ملتا ہے

تصوف

ساقی وُہی، میکش وُہی، مینا بھی وُہی
گویا وُہی، شنوا وُہی، بینا بھی وُہی
آدم وُہی، بندہ وُہی، مولا بھی وُہی
ہے بھی وُہی، تھا بھی وُہی، ہوگا بھی وُہی

لاموجود الا اللہ

ساقی و جام و شراب و پیمانہ کیا
شمع و گل و عندلیب و پروانہ کیا
نیک و بد و خانقاہ و میخانہ کیا
ہے راہِ یگانگی میں بیگانہ کیا

ہر شان میں حق متجلّی ہے

ہے شکر درست اور شکایت زیبا
ہے کفر درست اور ہدایت زیبا
گیسوئے سیاہ اور جبینِ روشن
دونوں کی بہار ہے نہایت زیبا

علم حجاب الاکبر ہے

معلوم کا نام ہے، نشاں ہے نہ اثر
گنجایشِ علم ہے، بیاں ہے، نہ خبر
علم اور معلوم میں دوئی کی بو ہے
اس واسطے علم ہے حجاب الاکبر

خلقت نور محمد باعثِ تخلیقِ کائنات ہے

احمد کا مقام ہے مقامِ محمود
ہے مرجعِ حمد اور شایان درود
لولاک لما خلقت الافلاک ہے ہیچ
شاہد ہے محمد اور عالم مشہود

انسان مظہر الٰہی ہے

کرتا ہوں میں سدا اپنی شانیں تبدیل
طوفان میں تھا نوح، تو آتش میں خلیل
فی الحال ہوں ظاہر میں اگر اسمٰعیل
ہوں عالمِ باطن میں وہی ربِّ جلیل

مقصودِ عالم انسان ہے

یہ مسئلۂ دقیق سُنیے ہم سے | آدم ہے مرادِ ہستیٔ عالم سے
ہم اصل ہیں اور یہ ہمارا سایہ | عالم کا وجود ہے ہمارے دم سے

اس قِسم کی رباعیوں کے ساتھ مولانا نے انسان میں اعلیٰ صفات پیدا کرنے، انسانی عزم و عمل کی قدرت اور معاشرے میں حُسن و خیر پھیلانے کی خاطر اصلاحی و تعمیری رباعیاں کہی ہیں۔ ان میں اقوال، تجربات اور تعلیمات کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔

نیچر انسان کی محکوم ہے

فطرت کے مطابق اگر انسان لے کام | حیوان تو حیوان، جمادات ہوں رام
مٹی، پانی، ہوا، حرارت اور بجلی | دانشمندوں کے ہیں مطیعِ احکام

اصلاحِ قوم دشوار ہے

پانی میں آگ کا لگانا دشوار | بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار سہی مگر نہ اتنا جتنا | بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

مولانا نے بعض رباعیاں فارسی فقروں کی مدد سے کہی ہیں یا یہ سمجھیے کہ فارسی کے مقبول فقروں کو اپنی رباعیوں میں اس طرح نظم کیا ہے کہ وہ ان کا ایک حصّہ بن گئے ہیں۔ مثلاً:

اسلاف پر فخرِ بے جا

اسلاف کا حصّہ تھا اگر نام و نمود | پڑھتے پھر و اب اُن کے مزاروں پہ درود
کچھ ہاتھ میں نقد رائج الوقت بھی ہے | یا اتنی ہی پونجی "پدرم سلطان بود"

بدنام کنندہ نکونامے چند

جو صاحبِ مکرمت تھے اور دانش مند وہ لوگ تو ہو گئے زمین کے پیوند
پوچھو نہ انھیں جو رہ گئے ہیں باقی "بدنام کنندہ نکونامے چند"

حاصلِ کتاب تحصیلِ علم ہے

چوپائے کی طرح تو کتابوں سے نہ لد حاصل ہے کتاب کا فقط علم وخرد
کیڑوں نے ہزار ہا کتابیں کھالیں پائی نہ مگر کبھی فضلیت کی سند

اس رباعی میں بھی اصلاً "چارپائے بروکتابے چند" کا خیال مولانا کے سامنے رہا ہے۔ یہاں انھوں نے "کتاب کا کیڑا" کی تفسیر اور شامل کردی ہے۔

مولانا کی ایک رباعی "فاعلِ حقیقی حق ہے" معنوی اعتبار سے تصوّف کے ذیل میں شمار کی جائے گی لیکن عربی کے ایک معروف ٹکڑے کے استعمال کی وجہ سے اور انسانی سرشت کا اس میں عکس ہے اس لیے اس مقام پر لکھنا ضروری سمجھا۔

شیطان کرتا ہے کب کسی کو گمراہ اس راز سے ہے خدائے غالب آگاہ
ہے کام کسی کا اور کسی پر الزام لاحول ولا قوۃ الا باللہ

یہ رباعی نہایت مقبول اور زبان زدِ عام وخاص ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کی اس رباعی میں یہ عربی ٹکڑا دیکھ کر ہی بعض شعرا کو یہ دھوکا ہوا ہو کہ رباعی کا وزن "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" ہے۔ رباعی کی مخصوص بحروں میں سے ایک بحر اس وزن پر کہی ہے۔ مولانا نے اپنی رباعیوں کے مصرعِ چہارم میں محاوروں اور ضرب الامثال کو استعمال کرکے ذہانت اور جامعیت کا ثبوت دیا ہے۔ رباعی میں پیش کردہ خیال تیسرے

مصرع سے گزر کر چوتھے مصرع میں حُسن، دلپذیری، زور اور تاثیر کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔

انسانی اخلاق و کردار سے متعلق مولانا کی چھبّیس (۲۶) رباعیاں کلیات میں درج ہیں۔

رباعی کی ہیئت

مولانا کی رباعیوں کے ہیئتی پہلو پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے رباعی کی ہیئت کے سلسلے میں قدیم و جدید کسی ایک انداز کو اختیار نہیں کیا ہے۔ انھوں نے اس میں تنوّع کو پیشِ نظر رکھا ہے چنانچہ ان کے یہاں تین طرح کی رباعیاں ملتی ہے۔

(۱) مردّف رباعیاں (۲) چہار قوافی رباعیاں (۳) سہ قوافی رباعیاں

مردّف رباعیاں یعنی وہ رباعیاں جن میں ردیف کی پابندی ہے۔ اس قسم کی رباعیوں کی تعداد پینتیس (۳۵) ہے

چہار قوافی رباعیاں یعنی جن کے چاروں مصرعوں میں ہم قافیہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان رباعیوں کی تعداد کم ہے۔ اس قسم کی آٹھ (۸) رباعیاں ملتی ہیں۔

سہ قوافی رباعیاں یعنی جن رباعیوں کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہیں، تیسرے مصرعوں میں قافیہ کی پابندی نہیں ہے بیشتر تعداد میں اس قسم کی رباعیاں شامل ہیں۔

"کلیاتِ اسمٰعیل" میں رباعی کے نام سے ایک قطعہ درج ہوگیا ہے یہ رباعی کی مروّجہ بحور میں نہیں ہے۔ مولانا کا علم و فضل اور عروض و بیان کی لیاقت اظہر من الشمس ہے۔ یہ گمان ان کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے سہو کیا۔ کلیات کی ترتیب کے وقت غالباً کسی نے

اس کو شامل کر دیا۔ اور پروف ریڈر نے توجہ نہیں کی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

کاٹھ کی ہنڈیا چڑھی کب بار بار　　کھو دیا جھو نے اپنا اعتبار
بات جو جھوٹی زبان پر لائے گا　　سچ بھی اس کا جھوٹ سمجھا جائے گا

یہ بحرِ رمل مسدس مقصور (محذوف) میں ہے اس لیے رباعی نہیں ہے اس کو قطعات میں شامل کرنا چاہیے تھا۔

مثنویات

مثنوی اردو کی ایک مقبول صنفِ سخن ہے۔ مثنوی منسوب بمثنیٰ ہے جو اثنین اثنین بمعنی دو دو کا اسم معدول ہے۔ الف بقاعدہ الحاق یائے نسبت کی حالت میں واؤ سے بدل گیا۔ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کا نام مثنوی ہے۔

اہلِ فارس مثنوی کے موجد و مخترع ہیں۔ مثنوی میں ہر قسم کے احساس اور ادراک کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ رزمیہ، تصوّف، فلسفہ، اخلاقیات، قصص، موسم، حسن و عشق کے افسانے غرض یہ کہ جس قسم کا مضمون چاہیں مثنوی میں بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن تسلسل لازمی شرط ہے۔ ردیف کی پابندی ضروری نہیں لیکن ردیف کا استعمال قابلِ اعتراض بھی نہیں ہے۔ مثنوی کے لیے سات وزن مقرر ہیں۔

فارسی میں مثنوی کی صنفِ سخن کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے

"عرب شاہنامہ کو قرآن العجم کہتے ہیں اور مثنوی، معنوی کی نسبت ہست قرآن در زبان پہلوی کہا گیا ہے۔" (۱)

(۱) مقدمہ مع دیوان حالی، ۱۸۹۳ء دہلی، ص ۱۹۳

مثنوی اردو میں فارسی سے آئی، بہمنی دور میں مثنویوں کی ابتدا ہوئی نظامی کو پہلا مثنوی نگار بتایا جاتا ہے۔ اور مثنوی "کدم راو پدم راو" اس سے منسوب ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ ۸۶۵ ہجری اور ۸۶۷ ہجری کے درمیان سمجھا گیا ہے۔

بہمنی دور کے بعد مثنوی کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اور عادل شاہی دور میں بھی مثنوی خوب لکھی گئیں۔ شمالی ہندستان کے شاعروں نے بھی مثنوی کو اپنایا۔ صحت کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ شمالی ہندستان میں پہلی مثنوی کس نے لکھی لیکن تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ محمد افضل کو اس سلسلے میں افضلیت کا فخر حاصل ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فرمایا ہے۔

"شمالی ہندستان میں اردو مثنوی کا اوّلین نمونہ محمد افضل کی "بکٹ کہانی" کو قرار دیا جاتا ہے" (۱)

شمالی ہند کی مثنویوں میں زیادہ وسعت ملتی ہے۔ تنوّع بھی ہے حسن و عشق کی گلکاریوں کے ساتھ ہولی، دیوالی، برسات، حقّہ، گرمی، تصوّف، مناظرِ فطرت، سب کی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا ہے۔ شمالی ہندستان کے قابلِ ذکر مثنوی نگار یہ ہیں۔

۱۔ میر حسن	مصنّف	سحر البیان
۲۔ مرزا شوق لکھنوی	"	زہرِ عشق، بہارِ عشق، فریب عشق
۳۔ دیا شنکر نسیم	"	گلزارِ نسیم

اردو مثنوی کا ایک اہم موڑ جدید نظم سے وابستہ ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ "جدید نظم" کے لیے منظّم طور پر جو کوشش کی وہ مثنوی کے فروغ کے لیے ایک نیک فال تھی مولانا محمد حسین آزاد

---

(۱) ہندستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ۱۹۶۲ء دہلی، ص ۹

نے شبِ قدر، ابرِ کرم، خوابِ امن، وداعِ انصاف، صبحِ امید، گنجِ قناعت، دادِ انصاف وغیرہ مثنویاں تصنیف کیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے ان کی ہم نوائی کی اور مشاعرۂ پنجاب کے لیے مثنویاں لکھیں مثلاً: برکھا رت، چپ کی داد وغیرہ۔

اس مقام پر مثنوی اور نظم جدید میں حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں مستقل تصنیف کو بھی مثنوی کا نام دیا گیا اور آزاد، حالی کی جدید نظمیں بھی مثنوی کی صنف میں لکھی گئیں۔ آزاد و حالی کے ساتھ مولانا محمد اسمعیل میرٹھی کا نام بھی آتا ہے۔ انھوں نے "جدید نظم" کی طرف خصوصی توجہ کی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کا نام مثنوی قرار پایا یا آزاد، حالی اور اسمعیل کے دواوین میں مختصر نظموں کو بھی مثنویات لکھا گیا ہے۔ اس طرح قدیم مثنوی نگار شعرا اور سرسید تحریک کے شعرا میں مثنوی کے بارے میں یہ فرق نظر آتا ہے کہ قدما کے نزدیک مستقل تصنیف کا نام "مثنوی" تھا جیسا کہ ایران میں رواج تھا مگر جدید دور میں مختصر نظم بھی بڑی حد تک مثنوی کے ذیل میں آگئی۔ حالی نے مثنوی کی تشریح میں چند نکات پیش کیے ہیں۔ مثنوی کی تعریف ان سے قبل متعین کی جا چکی تھی اور مثنوی کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ظاہر ہے حالی نے مثنوی کے متعلق مقدمہ میں جو کچھ کہا تھا وہ جدید دور کے نئے تقاضوں کا آئینہ دار تھا۔ انھوں نے زور دیا کہ

(۱) مثنوی میں ربطِ کلام کا لحاظ رکھنا خاص کر جب کہ اس میں تاریخ یا قصہ بیان کیا جائے نہایت ضروری ہے۔

(۲) جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔

(۳) مبالغہ کی غایت یہ ہونی چاہیے کہ جو مطلب بیان کرنا منظور

ہے مبالغہ کے سبب اس کا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو۔ نہ یہ کہ اس کا رہا سہا یقین بھی جاتا رہے۔

(۴) مقتضائے حال کے موافق کلام ایراد کیا جائے۔

(۵) جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچرل اور عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ فی الوقع ہوا کرتی ہے۔

(۶) قصّے میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے۔

(۷) اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ قصّے کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہو۔

(۸) جس طرح ان اہم اور ضروری باتوں کو جن پر قصّے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے اسی طرح ان ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں رمز و کنایہ میں بیان کرنا ضرور ہے۔

حالی کے یہ نکات، آزاد، حالی اور اسمٰعیل کی مثنویوں میں بڑی حد تک معیار کا کام دیتے ہیں۔ مثنویوں میں نیچرل شاعری کی سطح پر آزاد حالی اور اسمٰعیل تینوں برابر کی صف میں نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نوخیز ذہنوں کو اسمٰعیل میرٹھی نے زیادہ متاثر کیا اور صحیح ذوق پیدا کرنے میں ان کے کلام نے مدد دی۔ اقبال، چکبست، سرور جہاں آبادی وغیرہ کے یہاں نیچرل شاعری کے عناصر اِسی راہ سے داخل ہوئے۔

کلیات اسمٰعیل میں مثنویات کی تعداد اکھتر (۷۱) بتائی گئی ہے لیکن

---

(۱) مقدمہ مع دیوان حالی، ۱۸۹۳ء، دہلی
صفحات ۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۸، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸،

ان میں نہایت مختصر نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں لہٰذا اصل مثنویات کی تعداد تیئیس ۲۳ ہے۔

مولانا اسمٰعیل کی یہ تیئیس مثنویاں معنوی اعتبار سے دو قسم کی ہیں۔

(۱) نیچرل (۲) طریقت وشریعت سے متعلق۔

نیچرل شاعری کے ذیل میں آنے والی مثنویوں کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) آبِ زلال (۲) داناؤں کی نصیحت دل سے سنو (۳) ترکِ تکبّر
(۴) بارش کا پہلا قطرہ (۵) بادِ مراد (۶) مناقشہ ہوا و آفتاب
(۷) مکالمۂ سیف وقلم (۸) کوہِ ہمالہ (۹) کچھوا اور خرگوش
(۱۰) دو مکھیاں (۱۱) عجیب چڑیا (۱۲) کوّا
(۱۳) دال کی فریاد (۱۴) دال اور چپاتی

طریقت وشریعت سے متعلق مثنویوں کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) صنائع الٰہی (۲) خدا کی صفت (۳) حمدِ باری تعالیٰ
(۴) مناجات (۵) رحمۃ للعالمین (۶) مثنوی فی العقائد
(۷) شمعِ ہستی (۸) شمعِ ہدایت (۹) نذرِ عقیدت

مولانا اسمٰعیل کا دل غوث علی شاہ کے ساتھ تھا اور ذہن سر سیّد کا ہم نوا تھا۔ "مثنوی آبِ زلال" خصوصی طور پر اس سلسلہ میں سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں پچپن (۵۵) اشعار شامل ہیں۔

مثنوی آبِ زلال اردو کی نایاب مثنوی کہلانے کی مستحق ہے۔ اسمٰعیل کے معاصرین میں اس کا جواب نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کے بعد بھی اس انداز کی مثنوی کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس مثنوی میں فکر، مشاہدہ اور سائنسی نقطۂ نظر نے فن میں رچ بس کر ایک نادر روپ اختیار کر لیا ہے۔ مولانا اسمٰعیل نے اس مثنوی میں پانی کو دس شکلوں میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ خلقت

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز
زرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز

دکھاؤ کچھ طبیعت کی روانی
جو دانا ہو، تو سمجھو کیا ہے پانی

یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے
گرہ کھل جائے تو فوراً ہوا ہے

۲۔ خاصیت و تاثیر

مزاج اس کو دیا ہے نرم کیسا
جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا

نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت
طبیعت میں رسائی ہے نہایت

نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ
ہر اک سانچے میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ

نہ ہو صدمہ سے ہرگز ریزہ ریزہ
نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ

نہ اس کو تیر سے تلوار سے خوف
نہ اس کو توپ کی بھرمار سے خوف

تواضع سے سدا پستی میں بہنا
جفا سہنا، مگر ہموار رہنا

(۳) عمل وردّ عمل

لگے گرمی تو اُڑ جائے ہوا پر
پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھر

ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے
کبھی اوپر سے بادل بن کے برسے

ہوا پر چڑھ کے پہنچے سینکڑوں کوس
کبھی اولا، کبھی پالا، کبھی اوس

کہر ہے، بھاپ ہے، پانی ہے یا برف
کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف

(۴) فیضانِ فطرت

اسی کے دم سے دنیا میں تری ہے
اسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے

پھلوں میں، پھول میں ہر پنکھڑی میں
ہر اک ٹہنی میں، ہر بوٹی جڑی میں

ہر اک ریشے میں ہے اس کی رسائی — غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی
پھلوں کا ہے اسی سے تازہ چہرہ — اسی کے سر پہ ہے پھولوں کا سہرہ

(۵) ممدِ حیات

اسی کو پی کے جیتے ہیں سب انساں — اسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں
یہی معدہ کو پہنچاتا رسد ہے — یہی تحلیل میں کرتا مدد ہے

(۶) تعمیر و تجارت

عمارت کا بسایا اس نے کھیڑا — تجارت کا کیا ہے پار بیڑا

(۷) زراعت و صنعت

زراعت اس کی موروثی اسامی — صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی
کہیں ساگر، کہیں کھاڑی، کہیں جھیل — کہیں جمنا، کہیں گنگا، کہیں نیل

(۸) کمسٹریٹ

کہیں نالہ، کہیں ندی، کہیں سیل — ہے یہ دنیا کی کمسٹریٹ کا جرنیل

(۹) کرہ ارض کرہ آبی

یہی پہلے زمیں پر موجزن تھا — نہ میداں تھا، نہ پربت تھا، نہ بن تھا
زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر — جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر
نہ افریقہ، نہ امریکہ، نہ یورپ — رہی تھی ایشیا، اوشینیا چھپ

(۱۰) تنازع للبقا

مگر دنیا میں یکسانی کہاں ہے — جواب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے

رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا — اسے خشکی نے پستی میں ڈھکیلا

تری کا جب کہ دامن ہو گیا چاک — تو خشکی نے اڑائی جا بجا خاک
پہاڑ ابھرے، ہوئے میدان پیدا — ہوئے میداں میں نخلستان پیدا
تری کا گو ابھی پلہ ہے بھاری — لڑائی ہے مگر دونوں میں جاری
کیا کرتے ہیں دونوں کاٹ اور چھانٹ — چلی جاتی ہے باہم لاگ اور ڈانٹ

مگر اب دن بدن چڑھتی ہے خشکی — تری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی
کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ — بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

مولانا اسمٰعیل نے اس مثنوی میں یہ دس شکلیں کسی عنوان کے تحت جداگانہ طور پر بیان نہیں کی ہیں۔ بلکہ شعری تسلسل اور معنوی ربط کے ساتھ انھیں بیان کیا ہے۔ انھوں نے "پانی" جیسی پیش پا افتادہ چیز کا بیان قدیم فلسفہ کو بنیاد بنا کر شروع کیا ہے۔ پانی عناصر اربعہ میں شامل ہے۔ مولانا نے فکر و مشاہدہ اور جدید سائنسی نقطۂ نظر کی مدد سے پانی کی لازوال عملی قدرت کو ثبوت میں پیش کر کے اس کو فلسفہ کی جدید اصطلاح "جہد للبقا" سے ملا دیا ہے۔ اور اس طرح انسانی کردار کی روشنی کے لیے ذہنی بالیدگی کا سامان فراہم کیا ہے۔ مثلاً نرم مزاجی، طبیعت کی رسائی، ماحول سے مطابقت، صدمہ سے ریزہ ریزہ نہ ہونا، تواضع کے ساتھ عمل کی کارفرمائی، جفا سہنا مگر ہموار رہنا، اس مصرع میں ایک نفسیاتی اشارہ بھی ہے۔ یعنی متوازن دل و دماغ ہی انسان کو محبوب اور مقبول بناتا ہے۔

اس مثنوی میں مولانا نے نیزہ، تلوار، توپ، برتن، پستی وغیرہ علامات کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان میں انسانی زندگی کے

نشیب و فراز، ماحول کی ناسازگاری، حادثات اور خارجی عوامل کی سختی و درشتی کی تفسیریں پنہاں ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو مسخّرِ کائنات ہونے کا احساس دلایا ہے آگے چل کر پروازِ شوق کا ولولہ پیدا کیا ہے پھر، جنگل میدان، پہاڑ اور گلستان میں پانی کی مدد سے انسانی ہاتھ کی صنعتوں اور مشاطگی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اس پس منظر میں انسان کو یہ بھی یاد رکھنے کی تلقین کی ہے کہ پانی کا عنصر کائنات کی شادابی اور زندگی کے ہر شعبہ کی بہار کے لیے ایک ذریعہ نہیں بلکہ ذی روح مخلوق کی تازگی، جان فروزی اور بقا کے لیے ایک ضامن عنصر ہے۔ اس اہمیت کو واضح کرنے اور پانی کو نعمت غیر مترقبہ باور کرانے کے بعد مولانا نے کرّہ ارض کی طبیعی کیفیت کی مختصر تاریخ پیش کی ہے۔ "تری اور خشکی" کی کش مکش دکھا کر خشکی کی جیت کا اظہار کیا ہے۔ مگر تری کا تسلط ختم نہیں ہوا ہے۔ یعنی ہماری زمین کے سنورنے کا عمل جاری رہے گا۔ زندگی ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

لغت، زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی قابلِ تحسین ہے۔ اس میں روزمرہ، محاورہ اور خصوصاً ٹھیٹ الفاظ کو رواج دینے کا ڈھنگ قابلِ توجہ ہے مثلاً ٹھیٹ الفاظ کی فہرس پر غور کیجیے۔

پھندا، دھندا، کھٹ پٹ، جھٹ پٹ، بھرمار، سڑتا، بگڑتا، بھینچو، دباؤ، ٹٹولو، چھیڑو، اُچھالو، گھنگولو، رگڑو، گھسو، پیسو، جھکولے دو، مسل ڈالو، ٹاپو، ڈبکی لگاؤ، کاٹ چھانٹ، لاگ ڈانٹ مٹا یا وغیرہ ان الفاظ کا استعمال مولانا نے اس خوبی سے کیا ہے کہ ان کی اجنبیت دور ہوگئی اور مصرعوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی جگہ ان سے زیادہ مناسب الفاظ ممکن ہی نہ تھے۔

داناؤں کی نصیحت دل سے سُنو

سولہ اشعار میں ایک تخئیلی کہانی سنائی گئی ہے۔

ناگاہ چمکا جو کرمِ شب تاب — اخگر اسے جان کر لیا داب
ناچے، کودے، خوشی سے باہم — تنکے پتّے کیے فراہم
رکھ کر اسے خار و خس کے اندر — پھونکیں لگے مارنے، وہ بندر

اس عملِ بے ثمر پر پڑوسی متنبہ کرتے ہیں مگر بے سود

اس کام سے کیجیے کنارہ — جگنو کو نہ جانیے شرارہ
سمجھائے سے وہ مگر نہ سمجھے — جب تک نہ ہوئی سحر نہ سمجھے

جب صبح ہوئی تو شک ہوا دور — شرمندہ ہوئے بہت وہ مغرور

ہمارے قصّوں اور منظوم کہانیوں میں جانوروں کے ذریعہ انسان کو ہدایت پہنچانے کا رواج رہا ہے۔ اس مثنوی سے اصلاحی مقصد پورا کرنے کا کام لیا گیا ہے۔

بارش کا پہلا قطرہ

اس میں چھبّیس (۲۶) شعر شامل ہیں۔ اصل مقصد قوم کو ترقی و بہبود کی راہ دکھانا ہے۔ قومی کردار میں حوصلہ مندی اور اتّحاد کا رنگ بھرنا ہے۔ مولانا نے عوامل و محرکات کی تعبیر بڑی جامعیت، سادگی اور خوبصورتی سے ایک ہی شعر میں کر دی ہے۔

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی — پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

اس مثنوی میں مولانا نے انفرادی ذہن کی انتشاری کیفیت کا نقشا تخئیل کے سہارے پیش کیا ہے۔ تذبذب کا عالم ملاحظہ ہو:

ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کرونگا ستیا ناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹی، پتھر، تمام ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

اس کیفیت کے ساتھ قوم کے خوابوں کی کثرتِ تعبیر کو ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔

کھچڑی سی گھٹائیں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اب "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کی تفسیر دیکھیے۔

ایک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت
پھڑکی اس کی رگِ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مُردہ زمین میں جان

قطرہ کی گفتگو طویل ہے۔ اس کے بعد اس کا عملی اقدام سامنے آتا ہے

یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ
دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

اس مقام پر مولانا نے جو اشعار نظم کیے ہیں اس سے قاری کے سامنے ایک طرف بارش کا سماں بندھ جاتا ہے اور دوسری طرف اس فطری پس منظر میں مولانا کا جو مقصد ہے وہ آگے بڑھتا ہے۔

دیکھی جرأت جو اس سخی کی
دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا
قطرہ، قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش ہونے لگی موسلا دھار
پانی پانی ہوا بیاباں
سیراب ہوئے چمن، خیاباں

اس سلسلے میں مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

جرأت قطرہ کر گئی کام | باقی ہے جہاں میں آج تک نام
اے صاحبو قوم کی خبر لو | قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

اس مثنوی میں مستقبل کو سنوارنے کا پیرایہ نہایت جدّت لیے ہوئے ہے۔ زبان پاکیزہ، سادہ اور دل میں اترنے والی ہے۔ مثنوی میں ادبیات کے دوسرے مصرعوں میں نہایت زور ہے اور یہ خوبی مثنوی کو اور زیادہ قدر کی چیز بنا دیتی ہے۔

مثنوی بادِ مراد

یہ مثنوی اپنی تکنیک کے اعتبار سے دوسری مثنویوں سے مختلف ہے۔ اس میں مولانا نے چودہ (۱۴) اشعار کہنے کے بعد غزل کے انداز میں شعر کہے ہیں اور غزل کی صورت کو قائم کیا ہے یعنی مثنوی کے ہر بیت کی طرح مصرعے ہم قافیہ نہیں ہیں بلکہ نوا، صبا، ہوا وغیرہ قوافی کا اہتمام کیا ہے اور "ہے" ردیف کی پابندی روا رکھی ہے۔ اس کے بعد پھر مثنوی کے لوازم کو برتا ہے۔ اُنتالیس (۳۹) شعر اس طور پر مزید شامل کیے گئے ہیں۔ بحر کے ترنّم کا اور الفاظ و معانی کی خوشگوار فضا کا پورا پورا استعمال ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

چل اے بادِ بہاری سمتِ گلزار | تمنّائی ہے تیرا ہر گل و خار
نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سنسان | گیاہِ مردہ میں تو ڈال دے جان
نہیں گلشن میں پتّے کا بھی کھڑکا | ذرا شاخیں ہلا، طائر کو پھڑکا
لہک تیزی سے اے بادِ بہاری | کہ ہو جائے چمن پر وجد طاری
جو تو لہکے، تو سبزہ لہلہائے | چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے

لچک جائے کمر نازک شجر کی　　زمیں پر جھک پڑے ڈالی ثمر کی

اس سلسلے کے اشعار اور بھی ہیں۔ اس کے بعد غزل کا ماحول دیکھیے۔

چمن ہے، ابر ہے، ٹھنڈی ہوا ہے　　ہجومِ طائرانِ خوش نوا ہے
کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے　　کبھی آہستہ رو موجِ صبا ہے
غبار و گرد سے جو اَٹ گئی تھی　　صبا نے غسل کا ساماں کیا ہے
ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں　　کہ خوبانِ چمن کا سر ہلا ہے
چمن کا پتّا پتّا ہے نوا سنج　　صبا کی آمد آمد جا بجا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک گئی ہیں　　زمیں پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے
کھلی ہر پنکھڑی گلہائے تر کی　　صبا نے کان میں کیا کہہ دیا ہے
بکھیری نسترن پر زلفِ سنبل　　صبا شوخی میں فتنہ ہے، بلا ہے
گیاہِ سبزہ کا طرّہ پریشاں　　صبا تیرے ہی چھیڑے سے ہوا ہے

نہیں ہے مجھ کو دعویٰ شاعری کا
تو پھر مقطع سے بھی کیا مدّعا ہے

ان اشعار کی تشبیہات، استعارات، تراکیب مصرعوں کی ساخت انتخابِ الفاظ اور معنوی نزاکت ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ ہم میر حسن کی سحرالبیان کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔

ایک موقع پر "بادِ مراد" کی خصوصیات اس کی قدرت و لطافت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی معنویت اور اظہار کا عالم دیکھیے۔

محیطِ ارض ہے تو اے سبک پا　　تری موجیں رواں ہیں مثلِ دریا
لطیف و نازک و بے رنگ ہے تو　　اصولِ نغمہ و آہنگ ہے تو
رواں ہے تیری موجوں میں ہر آواز　　تو ہی کانوں میں ہے ہنگامہ پرواز
جہاں میں تو رسولِ ہر ندا ہے　　مذاقِ سامعہ تجھ پر فدا ہے
نہ پہنچے تو اگر تا پردۂ گوش　　سب آوازیں رہیں پردہ میں روپوش

اس مثنوی میں بحر و بر، موسم، پانی کا بھاپ بننا، شبنم کے موتی وغیرہ مختلف اشیاء کائنات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں "مساوات" کا روشن پہلو اُجاگر کیا ہے اور یہی ان کا مقصود ہے۔ اس کے اظہار پر نظم ختم ہوتی ہے۔ مساوات کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔

خوشامد تیری خصلت میں نہیں ہے — تری تیزی برابر ہر کہیں ہے
اُجاڑا گر کسی مفلس کا چھپّر — اکھاڑا خیمہ و خرگاہِ لشکر
نہ در گزرے غریبوں کے مکاں سے — نہ جھجکے طرّۂ تاجِ شہاں سے
نہیں کچھ تجھکو خوفِ شانِ سلطاں — اُڑایا پردۂ ایوانِ سلطاں،

سماج میں اس طبقاتی مساوات کا منظر پیش کرنے کے بعد مولانا کی نگاہ نے حسن و جمال کے جو مشاہدات کیے ہیں وہ تجربے ذہن میں ابھرتے ہیں اور تخئیل و محاکات مل کر ایک شعر میں حسن و شوخی کا رنگ بھر دیتے ہیں۔

کسی کا طرّۂ طرّار چھیڑا — کسی کا برقعِ زرتار چھیڑا

مثنوی میں شاعر کو جو پیغام دینا تھا وہ دیا جا چکا، لیکن مثنوی کو ان مقصدی اشعار پر ختم نہیں کیا تا کہ نظم کی حیثیت محض پند گوئی کی نہ ہو جائے مولانا نے آخری شعر کا تعلق براہِ راست اپنے نفسِ مضمون "بادِ مراد" سے قائم رکھا ہے اور اسی سے تخاطب کیا ہے۔

غرض دلچسپ تیری ہر ادا ہے — تری شوخی و چالاکی بجا ہے

مناقشۂ ہوا و آفتاب

یہ مثنوی تیس (۳۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں دو عناصر کی بحث اور قدرت عمل کا اظہار ہے۔ ایک مسافر کا لبادہ اُتارنے کے لیے سورج اور ہوا میں شرط ہوئی۔ ہوا نے اپنا عمل شروع کیا،

مولانا نے اس کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں تخئیلی محاکات بھی ہے اور جوش کا عنصر بھی۔

پھر تو آندھی بن کے چل نکلی ہوا — ایسی بپھری کر دیا طوفاں بپا
اونچے اونچے پیڑ تھرّانے لگے — جھوک سے جھونکوں کی چرّانے لگے
نونہالوں کی کمر بل کھا گئی — پھول پتّوں پر قیامت آگئی
کانپ اٹھے اس دشت کے کل وحش وطیر — مانگتے تھے اپنے اپنے دم کی خیر
ہو گیا دامانِ صحرا گرد برد — گھر گیا آفت میں وہ صحرا نورد

ہوا کے بعد سورج نکلنے کا سماں، اس کی کرنوں کا فضا میں پھیلنا، دھیمے دھیمے چمک کا بڑھنا، گرمی کا اثر، پھر چڑھتے سورج کا عالم، غرض اس منظر کو انھوں نے نرم لہجہ اور وقار کے انداز میں پیش کیا ہے۔ مسافر نے لبادہ اتار کر الگ رکھ دیا اور ایک جگہ گھاس پر سایہ میں بیٹھ گیا۔ سورج کی جیت ہو گئی۔

اس کہانی سے انھوں نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے۔ دراصل بات کہی ہے نفسیات کی۔ یعنی جذباتی عمل، ہنگامہ کوشی اور جوش وزور سے دنیا میں کامیابی نہیں ہوتی بلکہ متانت، وقار اور عقل کی رہبری سے کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ اسی نکتہ کو آخری دو اشعار میں پیش کیا ہے۔ ان اشعار میں نہ صرف نفسیاتی، اخلاقی نکات مرکوز ہیں بلکہ عظیم شخصیتوں کی زندگی کے انمول تجربوں کی چمک دمک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

تندی و تیزی کے گرویدہ ہیں سب — کامیابی کا مگر ہے اور ڈھب
اس کا گر ہے نرمی و آہستگی — سرکشی کی رگ اسی سے ہے دبی

مکالمۂ سیف و قلم

اس مثنوی میں ایک سو آٹھ (۱۰۸) شعر ہیں۔ قلم کی زبان سے

مولانا نے تلوار کی تباہ کاری اور بے رحمی کا منظر دکھایا ہے جو دل دوز اور موثر ہے۔ ہر چند اس منظر کا تعلق مشاہدہ سے یا براہ راست کسی واقعہ سے نہیں ہے لیکن انسانی تجربوں کا ایک بیان ہے جس کی سچائی سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ قلم نے تلوار کی ساخت کا مفصل بیان کیا ہے لیکن یہ شعر نہایت جامع ہے۔

آتشِ سوزاں کا پیا تو نے دود اس لیے جاں سوز ہے تیرا وجود

اس مثنوی میں تاریخِ عالم کے اوراق شامل کر لیے گئے ہیں۔ ہر چند ایسا کسی ترتیب کے تحت نہیں ہے مگر مشاہیرِ عالم اور نامور تاجداروں کا ذکر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بھارت، ایران، عرب، خراسان، روم، یونان، روس، شام، فرانس وغیرہ ممالک کی داستانِ پارینہ کے خونچکاں واقعات کی طرف اشارے ہیں۔ معرکۂ کربلا کے سلسلے میں ایک شعر ندرت اور رسائی فکر کا بہتر نمونہ کہا جائے گا۔

طرفہ ستم گار ہے عالم میں تو عید مناتی ہے محرّم میں تو

اس مثنوی کو تاریخی ناموران جنگ اور ملکوں کے ناموں نے بوجھل بنا دیا ہے۔ اصلاً مثنوی ایک تاریخی فہرس بن گئی ہے۔ شاعری نہیں رہی دوسرے یہ چیز کھٹکتی ہے "مکالمۂ سیف و قلم" میں سب کچھ قلم کی مرتبہ "فردِ جرم" ہے۔

تلوار کا جواب جو فریقِ مخالف کو اعتراض کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس کی کل کائنات صرف ایک شعر ہے۔

تیری طرح کا ہے کو میں باتیں گھڑوں لڑنے پہ آؤں تو میں سنمکھ لڑوں

اور باقی نو (۹) شعر تلوار نے الزامات کی صفائی میں دیے ہیں۔ اس صورت میں مثنوی کو متناسب و متوازن کہنا ناممکن ہو گیا ہے اور مکالمہ کا حق ادا نہیں ہوا۔

اس کے علاوہ مولانا کی اس مثنوی میں معنوی ربط میں انتشار نظر آتا ہے۔

پود بڑھاتی ہوں وہ نعم البدل
رفق ومُدارا کے لگیں جس میں پھل

اور یہاں مثنوی کا اختتام ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے اس موقع پر قاری کے ذہن کو کچھ کڑیاں گم نظر آئیں گی۔ تلوار کے جواب میں جو منطق ہے اسے پیش کرتے وقت غالباً مولانا کے ذہن میں یہ فارسی شعر رہا ہوگا

بر بنائے کہ آں ......

یعنی تخریب میں بھی تعمیر کی صورت مضمر ہے۔

ہمالہ

یہ مثنوی اپنے عنوان کے لحاظ سے اردو کی تمام مثنویوں سے اہم اور اچھوتی ہے نیچرل شاعری کے ساتھ ساتھ یہ موضوع وطن پرستی کے جذبہ کا بھی عکاس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی نظم 'ہمالہ' خاصی مشہور ہے۔ انھوں نے ہمالہ کی بلندی کو یوں ظاہر کیا ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

ظاہر ہے اس شعر میں اصلیت سے زیادہ شاعرانہ تخیل کا عمل ہے۔ مولانا نے سادگی اور سچائی کے ساتھ بے ساختہ انداز میں کہا ہے۔

ہے ہمالہ پہاڑ سر جیون — جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن

ہمالہ کی بلندی کے اظہار کے لیے فطری منظر سے تشبیہہ حاصل کی ہے اور ایسی غیر مرئی شے سے مشابہت دی ہے جس کے نام سے کہانیوں کے ذریعے بچے بھی مانوس ہیں۔

سامنے اِک سیاہ دَل بادل — دیو کی طرح سے کھڑا ہے اٹل

مولانا نے ہمالہ پہاڑ اور اس کی ترائی کا جو نقشا کھینچا ہے اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے ان سب چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے

سیکڑوں قسم کے ہیں پھول کھلے پیڑ باہم کھڑے ہوئے ہیں ملے
کہیں بن مالٹا، کہیں بیلا کہیں اخروٹ اور کہیں کیلا
سال کا کیا ہی خوب جنگل ہے سورماؤں کا بن کے دنگل ہے
سرو شمشاد ہیں، قطار، قطار ریچھ پھرتے ہیں بن کے چوکیدار
ہیں چٹانوں پہ کودتے لنگور ایک ہی جست میں وہ پہنچے دور
ہیں ترائی میں ہاتھیوں کے غول کوئی پائل ہے اور کوئی نجھول
شیر خونخوار شاہ ہے یاں کا پاڑھے چیتے کو خوف ہے جاں کا
بارہ سنگھے غریب پر ہے لتاڑ سینگ ہیں اس کے جھاڑ اور جھنکاڑ

آخر میں شاعر نے ہمالہ کی چوٹی پر چڑھنے کی تمنا کی ہے۔ تاکہ وہاں سے ہندستان کی میدانی فضا، گنگ وجمن کے حُسن اور شام کی رنگین چادر کے پس منظر میں شمال کی طرف سونے کی فصیل کو دیکھ سکتا۔ اور پھر:

پھر وطن میں جب آن کر رہتا دوستوں سے یہ ماجرا کہتا

اس شعر سے وطن اور اس کے مناظر سے قلبی لگاؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے خصوصاً دوستوں سے ماجرا بیان کرنے کی آرزو میں شاعر کے دل میں وطن کی حسین یاد کا شدید جذبہ متلاطم ہے۔

کچھوا اور خرگوش

اس مثنوی میں اڑتیس (۳۸) شعر ہیں۔ یہ مثنوی صوری ومعنوی حسن کا بہتر نمونہ ہے۔ آمد کا یہ عالم ہے کہ مصرعے سانچے میں ڈھلے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ روز مرہ اور محاورے کا اتنا کثرت سے اور اتنا برمحل و برجستہ استعمال غالباً مولانا کی دوسری مثنویوں میں کم ہی مل سکے گا۔ مکالمہ میں بڑی جان ہے۔ خرگوش کی رفتار کو ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

جس طرح جائے توپ کا گولا　　　یا گرے آسمان سے اولا

مولانا نے کچھوے کی چال کا تذکرہ بے نظیر انداز میں کیا ہے۔

اور کچھوا غریب آہستہ　　　چلا سینے کو خاک پر گھستا
سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے　　　یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے

کہانی میں غفلت کی مذمت کی گئی ہے اور صبر و محنت کو کامیابی کی کلید قرار دیا گیا ہے۔

دو مکھیاں

اس میں صرف گیارہ شعر ہیں۔ کچھوے اور خرگوش کی منظوم کہانی میں دو مختلف جانوروں کی خصلت اور دائرۂ عمل کا بیان تھا مگر اس میں دو ہم جنس مخلوق کے افراد میں نیت اور عمل کا تضاد دکھایا ہے۔ ایک مکھی حریص ہے اور اس کا کام نا عاقبت اندیشی کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسری مکھی پر ہوسنا کی غالب نہیں ہے۔ اس لیے اس میں دور بینی کا مادّہ ہے اور اس کا عمل کامیابی پر ختم ہوتا ہے۔ زندگی خطرہ سے محفوظ اور اس کے لمحات حیات میں آسودگی کی جھلک ہے۔ جانوروں کی کہانیوں کے ذریعے انسان کو عبرت کا سبق دیا ہے۔ یعنی حریص انسان سوچ سمجھ سے کام نہیں کرتا۔ اس میں عجلت کا مادّہ ہوتا ہے اور انجام سامنے آنے پر پشیمانی ہوتی ہے لیکن دور اندیش انسان غور و فکر اور تامل کے ساتھ عملی قدم اٹھاتا ہے اس میں دیر لگ سکتی ہے مگر انجام خوشگوار ہوتا ہے۔

حریص مکھی شیرینی دیکھ کر دوڑ پڑتی ہے اور انجام :

گری شیرہ پہ حرص کے مارے | پانو اور پر تھڑ گئے سارے
آنکھ اس کی ہیئے کی پھوٹ گئی | اکھڑے بازو تو ٹانگ ٹوٹ گئی

لیکن چالاک اور دور اندیش مکھی ایک ساتھ شیرینی پر نہیں گرتی :

اس پہ غالب نہیں ہوس ناکی | اڑتی پھرتی ہے وہ بہ چالاکی
کہیں مصری کی جب ڈلی پائی | تو بہ آہستگی اتر آئی
گرچہ اس کام میں لگی کچھ دیر | چاٹ کر ہو گئی مگر وہ سیر
چاٹ کے کھا کے اڑ گئی پھر پھر | دور بینی کا اس کو یاد ہے گر

اس میں دونوں قسم کی مکھیوں کی صورتِ پرواز اور عمل کا نقشا وہی ہے جو ہمارا روز کا مشاہدہ ہے۔ روزمرہ اور محاوروں کا بہتر استعمال ہے فرہنگ کا انتخاب مکھیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

عجیب چڑیا

اس میں انیس (۱۹) شعر ہیں۔ سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ہر شعر کے بعد دلچسپی بڑھتی ہے اور اگلے شعر کا مضمون جاننے کے لیے قاری میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔

مولانا نے ایک بے جان چیز کو ذی روح بنا کر پیش کیا ہے۔ پھر اس میں پہیلی کا انداز ہے۔ اس لیے دلچسپی اور تجسس کے ساتھ فکر انگیزی کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ اس مثنوی کے متعلق جزئیات کا موثر انداز میں بیان کرنا قابلِ تحسین ہے۔ مولانا نے جزئیات کے اظہار کے لیے جو پیکر تراشے ہیں وہ ان کی خوش مذاقی اور قدرتِ کلام کی دلیل ہے تشبیہات کے لیے مانوس ذخیرہ سے الفاظ تلاش کیے ہیں۔ اس مثنوی میں مولانا نے "گھڑی" کو "چڑیا" سے تشبیہ دی ہے۔ اور کمال یہ ہے

کر چڑیا کے تمام اعضا کے اوصاف کا اطلاق گھڑی پر کر دیا ہے پھر جزئیات میں چڑیا کی پوری زندگی کی تفصیل کو گھڑی میں سمو کر دکھا دیا ہے مولانا کے خیال کی رسائی کا عالم وہاں اور بھی محبوب بن جاتا ہے جہاں انھوں نے چڑیا کے انڈوں، انڈوں کو سینے اور بچّوں کے نکلنے کا بیان کیا ہے۔ مولانا نے ہر سیکنڈ کو ایک دانہ بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں گیا" وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

جو دانہ گرا سو ہو گیا گم　　ڈھونڈا کرو پھر نہ پاؤ گے تم
دانہ کی بتاؤں کیا میں قیمت　　دانا سمجھیں اسے غنیمت

دال کی فریاد ✓

یہ مثنوی انتیس (۲۹) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی مولانا کی تمام مثنویوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ اس کا موضوع نہایت سامنے کا یعنی" دال" ہے جس کی طرف دوسرے شعرا نے اس انداز سے توجّہ ہی نہیں کی ہے۔ ہماری نظر سے کوئی اردو مثنوی اس انداز کی نہیں گزری۔ بعض حیثیتوں سے اس کو ایک انفرادی مقام ملنا چاہیے۔ قاری کو غور کرنے پر اس میں پانچ خصوصیات نظر آئیں گی۔

(۱) فطری منظر نگاری (۲) کسان کا فصل کے ساتھ عمل اور اس پر دال کا ردِّ عمل (۳) سلب آزادی کا تصوّر اور قدیم ہندستان میں منڈی کا مقام (۴) گھریلو معاشرت اور سالن کی تیاری کا محاکاتی پہلو (۵) آزادی کے نقطۂ نظر کا فرق اور نفسیات کے تحت انسان کا ذہنی رجحان۔

دال چپاتی

اس مثنوی میں تیئیس (۲۳) شعر ہیں۔ مثنوی کا موضوع بہت عام ہے۔

اس میں "دال اور چپاتی" کی جھڑپ کا قصہ درج کیا گیا ہے۔ دال کو اپنی برتری کا احساس ہے اور اس نے اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلیلیں پیش کی ہیں۔ چپاتی کو نہ صرف دال کے دعوے سے انحراف ہے بلکہ اس کو اپنی فضیلت کا احساس ہے اور چپاتی نے دال کو کبھی اپنا شریک و سہیم تصوّر نہیں کیا بلکہ دال کو محض طفیلی سمجھا ہے۔ چپاتی نے صرف دال ہی نہیں بلکہ چٹنی، اچار، کوفتہ، قورما، کباب وغیرہ سب کو اپنا خدمت گزار بیان کیا ہے۔

مولانا نے نہایت سادگی سے روزمرہ اور محاوروں کا استعمال کرتے ہوئے مکالمہ مرتب کیا ہے۔ اپنے تخیّل کی مدد سے دال اور چپاتی دونوں کو دلیلیں فراہم کی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس مثنوی کا مقصد ذہنی تفریح ہے۔ دلچسپی ہے۔ غور کیجیے تو ایک ہی اخلاقی پہلو نکلتا ہے کہ دنیا میں ایک دوسرے کے تعاون سے کسی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے تعاون سے ہی زندگی کی بقا اور شہرت ہے۔ احساسِ خودی یا انا کی موجودگی میں بھرپور شخصیت یا ایک مکمل نقش کی تعمیر ممکن نہیں۔

طریقت وشریعت

اس سلسلے میں مولانا نے درجِ ذیل مثنویاں کہی ہیں۔

(۱) صنائع الٰہی (۲) خدا کی صنعت (۳) حمدِ باری تعالیٰ
(۴) مناجات (۵) رحمۃ اللعالمین (۶) مثنوی فی العقائد
(۷) شمعِ ہستی (۸) شمعِ ہدایت (۹) نذرِ عقیدت

ان تمام مثنویوں میں مولانا نے اپنے عقائد وجذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں وحدت الوجود یا وحدت الشہود کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

فرق ہے تو اظہار کا اور بحر کا۔ اس لیے مختصر طور پر ان مثنویوں پر گفتگو کی جائے گی۔

صنائع الٰہی

اس مثنوی میں اُنسٹھ (۵۹) شعر ہیں۔ جذبہ کی شدّت کا احساس شروع ہی سے ہوجاتا ہے۔ روانی اور بے ساختگی دل کو متوجّہ کرتی ہے۔

اس مثنوی کا مرکزی خیال مولانا نے ایک شعر میں پیش کردیا ہے۔

حقیقت میں ہے یاں دو رنگی کہاں جہاں ذرّہ ہے اور ذرّہ جہاں

خدا کی صنعت

اس میں چالیس (۴۰) شعر ہیں۔ انسان اور کائنات کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔ فطرت کے خارجی منظر کی عکاسی سادگی لیکن دل کش انداز میں کی گئی ہے۔

حمدِ باری تعالیٰ

اس میں اُنتالیس (۳۹) شعر ہیں۔ اس کا لب و لہجہ پہلی دو مثنویوں سے مختلف ہے۔ اس کو مشکل مثنوی کہا جائے گا۔ مشکل اس لیے کہ اس میں تصوّف کی اصطلاحوں کا استعمال زیادہ ہے۔ آہنگ بھی متصوّفانہ ہے الفاظ کا انتخاب معبودِ حقیقی کی صفات کے پیشِ نظر کیا گیا ہے قرآنی تلمیحات اور حدیثوں کے اشارے ملتے ہیں۔ بعض مصرعوں میں قرآنی آیتوں کے ٹکڑے جذب ہیں۔ تراکیب میں ثقالت ہے۔ اوّل و آخر، ظاہر و باطن، وحدت و کثرت، تصوّر، قرب، دوری، موجود و مقصود وغیرہ الفاظ کا استعمال عام طور سے کیا گیا ہے۔

مناجات

یہ مثنوی مولوی کریم بخش ڈپٹی کلکٹر کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ یہ مثنوی خاصی طویل ہے اس میں ایک سو چوراسی (۱۸۴) شعر ہیں۔ اس میں شاعر نے ایک سالک کی حیثیت اختیار کر کے تصوف کی مختلف منازل کا بیان کیا ہے۔ نظریات کا اظہار خشک انداز سے نہیں ہوا بلکہ نہایت وجد آفریں طریقہ سے کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

مرے دل سے رنگِ دوئی دور کر — مرے دل کو وحدت سے معمور کر
نہ لیلیٰ رہے اور نہ مجنوں رہے — فقط عشق کا ایک مضموں رہے
رہے عشق میں رات دن سوز و ساز — کروں شوق کی میں حکایت دراز
دیارِ محبت سے چل اے نسیم — سنگھا دے گلِ معرفت کی شمیم
گلستاں نہیں پنکھڑی ہی سہی — ہمیشہ نہیں دو گھڑی ہی سہی
سنا دے طیورِ صفا کی چہک — گلِ معرفت کی اڑا لا مہک
نکالوں کلیجے سے ہجراں کا خار — ملوں مُنہ پہ گلگونۂ وصلِ یار

مثنوی کے آخر حصّے میں "انسان اور خدا" میں کوئی فرق نہیں رہتا یہاں تصوّف کا نظریہ مولانا کے عقیدہ کا جز ہے اور فنّی خوش اسلوبی کے ساتھ عجب انداز میں پیش کیا ہے۔

میں ظاہر میں کرتا ہوں اس کو خطاب — پسِ پردہ دیتا ہوں خود ہی جواب
ہے یہ بھی مری کبریائی کی شان — یہاں بندگی واں خدائی کی شان
وہ بندہ ہے اور میں خداوندگار — میں سبّوح و قدّوس وہ خاکسار
محبّت سے کھیلا ہے میں نے یہ کھیل — دیا قعرِ اسفل میں اس کو ڈھکیل
کرے ہجر میں تا رہِ جستجو — مری جستجو میں پھرے کو بکو
کبھی راہِ خشکی کو وہ طے کرے — تری کا کبھی وہ سپاٹا بھرے

کبھی جنگلوں میں کبھی کوہ میں — پھرے ہر طرف وہ مری ٹوہ میں
جو بھٹکا تو کس نے بھلایا اسے — جو آیا تو کس نے بلایا اسے
ہے القصہ فعل اس کا میرا ہی کام — بس آگے خبر کچھ نہیں والسلام

رحمۃ للعالمین ✓

اس کی تاریخ تصنیف ۸۰ - ۱۸۷۰ء کے درمیان ہے۔ کُلیات کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں ہو سکی تھی۔ یہ مثنوی ستاون (۵۷) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں کائنات کی تخلیق کا سبب "ظہورِ رسول" کو قرار دیا ہے۔ اس مثنوی کا آہنگ "حمدِ باری تعالیٰ" سے ملتا جلتا ہے۔ شروع کے کچھ شعروں میں عربی الفاظ کا استعمال ہے۔ بیان میں اشکال نظر آتا ہے لیکن خارجی منظر کی تصویر کشی کے موقع پر مولانا کا اصلی رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

مثنوی فی العقائد

✓ اس مثنوی میں اٹھائیس (۲۸) شعر ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں میرٹھ میں کہی گئی۔ اس میں "توحید و رسالت" کا بیان ہے۔ مثنوی کے مطالعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ پوری مثنوی کا مضمون آیت قرآنی کا ترجمہ ہے۔ لیکن مولانا نے اس موضوع پر اردو الفاظ کا جو پیکر تیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی اوصاف میں جن کا تصور عربی لغت سے ہی واضح ہونا یقینی سمجھا جاتا ہے۔ محض ایک **دعوا** ہے۔ مولانا نے اردو فرہنگ کو وہ وسعت، معنویت اور جان عطا کر دی ہے کہ تمام صفاتِ ربانی کو اردو الفاظ بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً

اس کا ساجھی نہیں شریک نہیں — اور کو مانیے تو ٹھیک نہیں

جانتا ہے وہ اَن ہوئی باتیں
دیکھتا ہے ڈھکی چھپی گھاتیں

ہے وہ بے آنکھ دیکھتا سب کو
ہے وہ بے کان سنتا مطلب کو

اپنی مرضی سے کام کرتا ہے
بے زبان وہ کلام کرتا ہے

اونگھتا ہے کبھی نہ سوتا ہے
سب ارادہ سے اس کے ہوتا ہے

شمعِ ہستی

اس مثنوی میں چوّن (۵۴) شعر ہیں۔ سادہ، رواں اور برجستہ۔ اور اس میں مولانا کا وہ انداز ملتا ہے جو صرف انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔

مثنوی میں "زندگی" نے اپنی آپ بیتی میں مذہبِ اسلام کی روایت کے مطابق جنّت اور اس کی نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جنّت میں اپنے قیام، فرشتوں کی تقدیس و عبادت، اور اپنی عظمت کی داستان بیان کی ہے۔ اس کے بعد زمین پر اترنے کا ماجرا، کائنات کی تخلیق اور مظاہر و آثار میں زندگی کی لہر دوڑنے کی سرگذشت کا بیان کرتے ہوئے انسان کے اشرف المخلوقات اور مسخرِ کائنات ہونے کا اشارہ کیا ہے۔

القصّہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم
ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم

شمعِ ہدایت

یہ مثنوی پچیس (۲۵) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں جذبۂ عقیدت کا اظہار ہے "توحید رسالت" اصل موضوع ہے۔ انسان کی ذات کو اہم قرار دیا ہے۔ بندگی اصلِ مقصود ہے۔

نذرِ عقیدت

اس مثنوی میں پچھتر (۷۵) شعر ہیں۔ یہ مثنوی مولانا میرٹھی نے

اپنے مرشد سید غوث علی شاہ کی توصیف میں ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی۔

لب پہ آیا نامِ شہہ غوث علی — بے تکلف کھل گئی دل کی کلی
پھر صبا سبزہ کو لہرانے لگی — باغِ معنیٰ میں بہار آنے لگی

اس تصور کی برکت کا ذکر ہے اور اس سے جو کیفیت ذہن پر طاری ہوتی ہے اس کا بھی والہانہ انداز میں بیان ملتا ہے۔ مثلاً اس سلسلے کے تین شعر

پھر وہی ساغر، وہی بزمِ سرور — پھر لگا بہنے وہی دریائے نور
پھر وہی ساقی، وہی دیرینہ خم — کفر و ایماں کا ہوا سر رشتہ گم
ہو گئے مل جل کے سب پھر ایک شے — دورِ ساغر، دستِ ساقی مست مے

اس کے بعد شیخ کی مدح شروع کی ہے اور پہلے ہی شعر کا یہ انداز ہے۔

اے تجلیٔ اخیرِ ذوالجلال — تھا کمالِ بندگی تیرا کمال

چند اشعار مدحیہ کے بعد یہ شعر قابل توجہ ہے۔

ہے تری آواز، آوازِ خدا — اور خاموشی تری رازِ خدا

اپنے شیخ کی خاص صفت "فقر" بتایا ہے اس لیے "فقر" کی بھی تفسیر کی ہے۔

فقر کو ہے کفر سے نسبت قوی — ہے مگر وہ کفر، کفرِ معنوی
فقر محتاجِ خدا ہر گز نہیں — فقر عینِ ذاتِ حق ہے بالیقیں

آخر میں شیخ کی مجلس کا تذکرہ بڑے خلوص اور کیفیت کے ساتھ کیا ہے۔

تیری مجلس، مجلسِ اللہ تھی — دونوں عالم کی جہاں، گم راہ تھی
اس کے ہوتے ہستیٔ عالم کہاں — دن نکل آیا تو پھر شبنم کہاں

نظم جدید

اردو نظم کی تاریخ کو تقریباً ۱۶۰۰ء سے شروع سمجھنا چاہیے محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں نظموں کا قابلِ لحاظ سرمایہ ملتا ہے۔ موضوعات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ مثلاً بسنت، عید، برسات، پیاریوں کے حسن و جمال کا تذکرہ، حُسنِ تعمیرات، معرکہ فتوحات وغیرہ۔

شمالی ہند میں نواب صدرالدین محمد خاں، فائز دہلوی اور شاہ ظہورالدین حاتم کو نظم نگار شعرا تسلیم کیا گیا ہے۔ سودا و میر کے یہاں بھی نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن اردو نظم کا معمارِ اوّل نظیر اکبر آبادی کو کہا جائے گا۔ ان کی زبان سادہ اور عام گفتگو کا انداز لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اس دور میں جب کہ غزل کو علمِ مجلسی کا اہم عنصر تصور کیا جاتا تھا۔ غزل سے انحراف کر کے نظم نگاری پر توجہ کی۔ ان کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ ان کے یہاں نظم کے نئے سانچے نہ سہی مگر پابند بندوں میں تجربات کی تبدیلیاں صاف نظر آتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی معلّم تھے۔ معلّم کو اپنی زندگی میں سماج کے مختلف طبقات سے آئے ہوئے طلبہ کے ذہن، سیرت، نفسیات عادات اور کردار کے مطالعے کا موقع مستقل طور پر میسّر آتا ہے۔ نظیر جس دور میں سانس لے رہے تھے اس میں استاد شاگرد کا رشتہ بڑا مضبوط اور قریب کا تھا معلّم کا اور سرپرست کا تعلق یگانگی، وضعداری حُسنِ سلوک اور عزت کا تھا۔ معلّم کو گھرانے کا ایک باعزّت فرد تسلیم کیا

جاتا تھا اور سماج میں معلم کی حیثیت ایک ممتاز و معزز فرد کی تھی۔ معلم کو گھر کی خوشی، غم، سماجی تقریبات، تیوہار، ذاتی معاملات، سب میں شریک کیا جاتا تھا۔ اس حیثیت سے نظیر اکبر آبادی کو سماجی شعور کی دولت نصیب ہوئی۔ ان کی زندگی میں ان گنت تجربے شامل ہوئے۔ اس لیے نظیر کے یہاں موضوعات میں مقامیت بھی ہے اور وسعت بھی مثلاً۔ مفلسی، تیراکی کا میلا، تل کے لڈو، کورے برتن، کنہیا جی کا جنم، برسات، ہولی، عید، جوانی، جاڑا، اُمس، آگرہ کی تباہی، روضۂ تاج گنج وغیرہ ظاہر ہے یہ تنوع، یہ رنگارنگی کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ صحیح معنوں میں اردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔

اردو شاعری کی یہ بدنصیبی ہے کہ نظیر کی روایت کو ان کے فوراً بعد آگے نہیں بڑھا گیا۔ خال خال شاعروں کے یہاں نظموں کا وجود ملتا ہے اور کچھ مدت کے لیے یہ سلسلہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ مرزا غالب کے یہاں چکنی ڈلی، بیسنی روٹی، اور آم وغیرہ نظمیں ملتی ہیں لیکن ان چند نظموں کی بنا پر ہم غالب کا شمار نظم نگار شعرا میں نہیں کر سکتے۔ اگرچہ غالب کے یہاں نئی روشنی کے خیر مقدم کا جذبہ ملتا ہے لیکن دراصل محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے اردو شاعری کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ انگریزوں کی سرپرستی نے اس زمانہ میں اہم رول ادا کیا۔ سررشتۂ تعلیم نے انگریزی نظموں کے اردو منظوم ترجمے کرائے حسبِ ذیل موضوعات پر مشتمل پندرہ (۱۵) نظموں کا اردو منظوم ترجمہ غلام مولیٰ قلق نے کیا تھا۔

(۱) اوصاف اخلاقِ شتر (۲) بیانِ کرمک (۳) حکایتِ پسر ناخدا
(۴) بیانِ جنت (۵) میرا باپ کشتی بان ہے (۶) بیانِ ہندوستان
(۷) داستانِ اندھے لڑکے کی (۸) داستان شاہ کینیوٹ

(۹) قصہ ولیم ٹیل ساکن سوئزرلینڈ (۱۰) خواہشِ طفل (۱۱) عرضی موشِ محبوس (۱۲) لڑکپن کی پہلی مصیبت (۱۳) در بیانِ تمیزِ حق و باطل (۱۴) ذکر ابابیل بدیسی کا (۱۵) سادگیٔ طبیعت کی خواہش - یہ تمام نظمیں "جواہر منظوم" میں شامل ہیں - جس کا دوسرا اڈیشن ۱۸۶۷ء میں چھپا تھا - ٹائٹل پر چاروں طرف بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں - رنگ پیلا ہے - سرورق پر یہ عبارت درج ہے -

جواہر منظوم

یعنی

ترجمہ منظوم اردو منتخبات نظم انگریزی حصہ اول

جو مدارس سرکاری میں پڑھائی جاتی ہے - حسب الارشاد

فیض بنیاد نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی -

یہ ترجمہ منظوم اصلاح کے لیے مرزا غالب کے پاس بھیجا گیا تھا - دیباچہ میں اس کا تفصیلی ذکر ہے - اس کتاب کی تاریخی اوّلیت اور افادیت ظاہر کرنے کو اس مختصر دیباچہ کی عبارت یہاں پیش کی جاتی ہے -

دیباچہ

ترجمہ جو طبع ہوا ہے اس کو منشی غلام مولیٰ سابق ملازم سررشتۂ تعلیم نے حسب الحکم صاحب انسپکٹر بہادر قسمت اوّل میرٹھ کے منتخبات نظم انگریزی حصہ اوّل سے نظم میں بزبان اردو ترجمہ کیا تھا اور بعد اس کے یہ ترجمہ واسطے اصلاح کے دہلی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے پاس جو شاعر نامی گرامی ہیں بھیجا گیا - اور بعدہٗ واسطے ملاحظہ اور منظوری صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی

کے پیش ہوا چنانچہ دفتر میں صاحب ممدوح کے دیکھا گیا اور جا بجا جو غلطی ترجمہ وغیرہ پائی گئی وہ درست کردی گئی اور پھر از سر نو حیطہ تحریر میں آکر لفظاً لفظاً خود بلاحظہ صاحب محتشم الیہ سے گزرا اور پھر اس میں کچھ کچھ تغیّر و تبدّل ہو کر جہاں جہاں حواشی مناسب معلوم ہوئے نسخہ مذکور پر منجانب صاحب ممدوح ثبت ہوئے۔ واقعی اس دقّت اور خونِ جگر کھانے کی وہی لوگ کیفیت اچھّی جانیں گے کہ جو نظم انگریزی سے زبان اردو بامحاورہ میں منظوم کرتے ہیں لیکن امید کہ جو جانکاہی اور دماغ سوزی اس پر ہوئی ہے وہ بھی رائگان نہ جاوے گی۔

(۱) اور جو لوگ طالب علم کہ انگریزی دان ہیں اور ان کو استعداد فارسی و اردو میں بھی اچھی طرح حاصل ہے مناسب ہے کہ وے اچھے اچھے مضامین نظم انگریزی کو بزبان اردو نظم کرنے میں طبع آزمائی کریں تاکہ ان کے ہم وطنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہو۔ واضح ہو کہ تحریر نظم انگریزی نظم اردو سے بہت مختلف ہے۔ اور اس وجہ سے ایک زبان کی عبارت منظوم کو دوسری زبان میں نظم کرنا خیلے دشوار ہے کیوں کہ نظم فارسی میں وہ اشکال تشابیہہ و استعارات ہوا کرتے ہیں کہ جن کا ترجمہ ہونا نظم انگریزی میں کہ جس کی عمدگی تحریر سادگیٔ عبارت اور راستیٔ مضامین و خیالات پر زیادہ ترموقوف ہے، بہت مشکل ہے علی العموم تمام انشادوں میں مناسب ہے کہ زیادہ تر معانی پر بہ نسبت الفاظ کے کہ جن سے وہ معانی ادا ہوتے ہیں لحاظ کیا جاوے۔" فقط

اس دیباچہ کو بغور مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

اس دور کی بعض عظیم ادبی شخصیات کو انگریزی نظم کی خوبیاں محسوس ہوگئی تھیں اور اُنھوں نے ان خوبیوں کو ایک طرف اردو داں پبلک تک پھیلانا اور دوسری طرف اردو شعراء کو انگریزی انداز کی نظم نگاری کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری بات ہے کہ ہندستانی بچے کے ذہن کو انگریزی نظم کی خوبیوں سے متاثر کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس نظم نگاری کی خوبیوں کے اظہار و ابلاغ کا علاقہ خصوصی طور پر دہلی، میرٹھ، علی گڑھ، پانی پت، وغیرہ کو سمجھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں وہ اہم شخصیات جن کا تعلق ذہنی اور عملی طور پر نظم نگاری سے وابستہ رہا۔ مرزا غالب، سرسید، قلق میرٹھی اور محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔

مرزا غالب اور غلام مولا قلق کا دیباچہ میں مذکور ہوا۔ محمد اسماعیل میرٹھی کا تعلق "جواہر منظوم" سے بالواسطہ ہے۔ مولانا نے ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں انسپکٹر کے دفتر میں ملازمت شروع کی۔ وہاں قلق میرٹھی ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ اسماعیل ۱۸۶۷ء تک اس دفتر میں رہے اور اُنھیں انگریزی نظموں کے مترجم مسوّدے کو دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ "جواہر منظوم" کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام ہوا۔ اس بیچ میں ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء تک مولانا اسماعیل سہارنپور میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے ہیں۔ مگر اُن کا تبادلہ پھر میرٹھ کو ہوگیا۔ "جواہر منظوم" کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۷ء میں نکلا۔ مولوی محمد اسماعیل شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے اپنے اُستاد کی ان نظموں پر اصلاحیں دیکھی ہوں گی۔ پھر نظم کا چرچا، اس کی قدر و قیمت اور وطن میں اس کی اشاعت کا اہتمام، اس پر حکومتِ وقت کی قدر دانی یہ تمام اسباب و علل ایسے ہیں جن سے مولانا اسماعیل کا ذہن متاثر ہوا ہوگا۔

اور وہ خود اس قسم کے عمل تخلیق پر متوجہ ہوئے ہوں گے۔

انگریزی نظم کی خصوصیات کو سر سید سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور اس سے متاثر ہو کر "اردو نظم نگاری" کو رواج دینے کی تمنا سب سے پہلے ان کے دل میں پیدا ہوئی اس کا اظہار بھی ان صفحات میں اپنے موقع پر ہوگا۔

"دیباچۂ جواہر منظوم" کے اس مذکورہ نقش کے علاوہ چند باتیں نہایت قابلِ غور ہیں۔ ان کا تعلق انگریزی نظم کی خصوصیات سے بھی ہے اور "اردو نظم نگاری" کے رواج و اشاعت سے بھی۔ مثلاً:۔

"۱۔ واضح ہو کہ تحریر نظم انگریزی کی نظم اردو سے بہت مختلف ہے اور اسی وجہ سے ایک زبان کی عبارت منظوم کو دوسری زبان میں نظم کرنا خیلےؔ دشوار ہے۔"

"۲۔ نظم انگریزی میں عمدگیٔ تحریر، سادگیٔ عبارت اور راستیٔ مضامین و خیالات پر زیادہ تر موقوف ہے۔"

"۳ علی العموم تمام اُستادوں میں مناسب ہے کہ زیادہ تر معانی پر بہ نسبت الفاظ کے کہ جن سے وہ معانی ادا ہوتے ہیں لحاظ کیا جاوے۔"

"۴۔ اور جو لوگ طالب علم کہ انگریزی داں ہیں اور ان کو استعداد فارسی و اردو میں اچھی طرح حاصل ہے مناسب ہے کہ وہ اچھے اچھے مضامین نظم انگریزی کو بہ زبانِ اردو نظم کرنے میں طبع آزمائی کریں تاکہ ان کے ہم وطنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہو۔"

ان اشارات کا مجموعی تاثر قاری کے ذہن میں رہے تو دو باتیں نہایت نتیجہ خیز اور بھی ملیں گی۔

۱۔ اردو نظم کا وجود تھا اسی لیے نظم انگریزی اور نظم اردو کا موازنہ کیا گیا ہے یعنی (واضح ہو کہ تحریر نظم انگریزی کی نظم اردو سے بہت مختلف ہے")

یہ اختلاف پیکر و معانی دونوں کا ہے جن کا اوپر مذکور ہوا۔

۲۔ انگریزی نظموں کو اردو کا منظوم پیرہن دینے کی اپیل کی ہے اور اس عمل کو ہم وطنوں کے لیے افادیت کی چیز قرار دیا ہے۔

ان داخلی شہادتوں کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ انگریزی نظم کی خوبیوں کا پہلا احساس یو۔پی کے شعرا کو ہوا۔ اردو نظم میں ان خوبیوں کو سمونے اور انھیں پھیلانے کا کام پہلے یو۔پی میں شروع ہوا۔ اس عمل میں برطانوی حکومت کے لیفٹیننٹ گورنر اور سررشتۂ تعلیم کے اعلا حکام کا ذہنی اور عملی تعاون برابر شریک تھا۔ صوبۂ پنجاب میں یہ احساس و تاثر بعد میں پیدا ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ یو۔پی کی نظیر سامنے تھی۔ اس نے پنجاب کو آئینہ دکھایا۔

اس خیال کے قائم کرنے میں دو باتوں سے ہمیں مدد ملتی ہے۔

۱۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اردو ریڈروں کا جو سلسلہ مرتب کیا تھا اس میں تمام حصہ نثر پر مشتمل تھا۔ نظم کا حصہ نہیں ہے۔

۲۔ پنجاب میں اردو کی جو درسی کتابیں رائج تھیں یا مشاعرۂ پنجاب سے پہلے کمیٹی نے جن کتابوں کی منظوری دی تھی ان میں بھی نثری حصہ شامل تھا۔ نظم کا تصور تک نہ تھا۔ چنانچہ سکریٹری گورنمنٹ کی ایک تحریر کا ترجمہ اس کوتاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تحریر اصلاً نواب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی رائے کا اظہار ہے۔ ترجمہ درج ذیل ہے۔

"جناب لیفٹیننٹ بہادر ایک اور امر کی نسبت ہدایت فرماتے ہیں جس کا کمیٹی نے کچھ ذکر نہیں کیا اور جو ممدوح کے نزدیک اس ملک کے سر رشتۂ تعلیم کے افسروں کے لیے قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ اردو کی درسی کتابیں بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ ان میں اردو نظم بالکل نہیں۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ عمدہ نظم تعلیم کا وسیلہ ہے۔" (۱)

غرض "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ گورنر کی اس خواہش کا احترام پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائڈ (جو اس زمانے میں میجر تھے) نے پوری طور پر کیا۔ نصابی کتابوں کے لیے اردو نظم کا مواد فراہم کرنے کو اور عمدہ نظم کے رواج سے تعلیم کو بہتر و موثر بنانے کے لیے ایک مہم کی بات سوچی۔ اس مہم کو چلانے اور کامیاب کرنے کے لیے مولانا محمد حسین آزاد سے بہتر شخص کوئی نہ تھا۔ وہ لاہور میں سر رشتۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ چنانچہ "اردو نظم" کی تحریک شروع کر دی گئی۔ نظم کا مشاعرہ یا مناظمہ منعقد کیا گیا۔ مصرعِ طرح کی بجائے نظم کا موضوع دیا گیا۔ پہلے اجلاس میں مولانا آزاد کی مثنوی کے بعد کرنل ہالرائڈ نے انگریزی میں تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں نظم کے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔

"یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو جو چند عوارض کی باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اس واسطے جملہ رؤسا اور اہلِ علم لوگوں سے جو شعر و سخن اور تصانیف سے حظ اٹھاتے ہیں درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ کریں۔" (۲)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظم کی طرف عملی طور پر توجہ پہلے یوپی میں کی گئی۔ اس کے چھ سات برس بعد پنجاب میں اردو کی نظم کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور وہاں بھی گورنر کی ترغیب سے کام شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد حسین کی صلاحیت، شہرت اور اجتہادی شان نے اس سرکاری آغازِ کار کو "جدید نظم" میں تبدیل کر دیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے مناظمہ

(۱، ۲) محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف، ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۹۶۵ء کراچی صفحہ ۲۳۶،

کے لیے چار مشہور مثنویاں لکھیں۔

(۱) برکھا رُت (۲) نشاطِ اُمید (۳) حبّ وطن (۴) مناظرۂ رحم و انصاف

لیکن ان دو مشہور شاعروں کے علاوہ کسی مستند و معروف شاعر کا نام اس قسم کی نظمیں لکھنے والوں کی فہرست پر نظر نہیں آتا۔ مثلاً ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو دوسرا مناظمہ ہوا اس میں حسب ذیل شعراء نے شرکت کی۔

شاہ انور حسین ہُما، مرزا اشرف بیگ اشرف، رئیس دہلوی، منشی الٰہی بخش رفیق، مولانا آزاد، مولوی محمد متقرّب علی، مولوی امّوجان ولی شاگردِ غالب مولوی نادر بخش، مولوی عطاءاللہ اور مولوی علاءالدین محمد کاشمیری۔

ان شاعروں کے نام سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں ملک کے مقبول و معروف شاعروں کا نام نہیں ہے۔ اس لیے مناظمہ کی کامیابی اور تحریک کا اثر قطعی مشتبہ ہے۔ یہ کاروباری مناظمہ کوئی مستقل حیثیت بھی اختیار نہ کر سکا۔ اور جب تک کام چلا وہ بھی خاطر خواہ نہ تھا۔ اس ناکامی اور دُشواری کا خود مولانا محمد حسین آزاد کو شدید احساس تھا اور جب عالم یہ ہوگیا "کوئی تدبیر بن نہیں آتی"، تو مولانا محمد حسین آزاد نے اس دور کے اس مجدّد سے معاملہ کو رجوع کیا۔ جس کی طرف تمام ادیب، شاعر اور تعلیم یافتہ طبقہ آنکھیں لگائے ہوئے تھا۔ یعنی سرسید نے ۱۹؍ اکتوبر ۱۸۷۴ء کے ایک خط میں آزاد کو لکھا۔

"حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہیں ہوا۔ شعر و سخن پر ردّ و قدح دوسری چیز ہے۔ اِلّا آپس کا نفاق دوسری چیز ہے۔

میری نہایت قدیم تمنّا اس مجلسِ مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدّت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خوابِ امن"، پہنچی۔ بہت دل

خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔
اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔" (۱)

اس خط سے صاف پتا چلتا ہے کہ "مشاعرہ پنجاب" کا اثر محدود تھا۔ اس کی حیثیت مقامی تھی۔ حالی لاہور بک ڈپو میں ملازم تھے۔ اس لیے ان کا نام شامل ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس دور کے ممتاز و معروف شعرا میں سے کسی کا نام نہیں ملتا۔ بس اتنا ہوا کہ بعض جریدوں میں اس کا کلام یا روداد شائع ہو گئی

سر سید کے خط میں ایک اور پتے کی بات مل جاتی ہے یعنی مولانا محمد حسین آزاد خود نیچرل شاعری کے متعلق پوری واقفیت نہ رکھتے تھے اور انھوں نے جو مثالی مثنویاں لکھیں ان میں نیچرل شاعری کا حق ادا نہ کر سکے۔ حالی کو خود اعتراف تھا کہ وہ مغربی ادب سے شناسا نہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ نظم جدید کے موجد و مخترع آزاد اور حالی کو بنا دینا محض اتنا ہے کہ:

"بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے"

ورنہ تاریخی حقایق کی روشنی میں دیکھا جائے تو نیچرل شاعری کے عارف سر سیّد ہیں اور عملی طور پر نظم کے محرک قلق اور اسماعیل میرٹھی ہیں جن کی تصانیف بھی ادبیت کا درجہ رکھتی ہیں اور جن کی مزید بحث آگے آئے گی۔

بہر حال مشاعرہ پنجاب کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ آزاد اور حالی کے ذہنوں کی روشنی نے بہت سے شعرا کو بصیرت عطا کی۔ اصل اہمیت اس ذہنی انقلاب اور نئے ماحول کی ہے جس نے اس دور کے ذہین انسانوں کو متاثر کیا یہاں

---

(۱) بحوالہ "اسلم فرخی"، ص ۲۷۹

پہلے اُنھیں اثرات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

مغربی تہذیب کے اثرات

پرانی تہذیب کے نقوش دھندلے پڑ رہے تھے اور نیا تمدّن اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس کا اثر ہندستانی کلچر اور زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہا تھا اردو ادب بھی متاثر ہوا۔ لیکن اس کا احساس چند ذہین اور باشعور فنکاروں کو ہو سکا۔ شاعروں میں مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سرِ فہرس نظر آتے ہیں جنھوں نے نہ صرف تبدیلی کو محسوس کیا بلکہ اس کا اظہار صاف طور پر خود بھی کیا۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد نے کہا تھا۔

"مگر اسی عالم حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تہذیب) کی سواری شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔" (۱)

خواجہ الطاف حسین حالی نے تہذیب کی طرف مخصوص اشارات نہیں کیے بلکہ ان کے ذہن نے مغربی ادب میں نئے جلوؤں کی تابناکی کو پایا ہے۔ ادب کی شاہراہ میں اُنھیں سر سیّد نے عملی قدم اُٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔ مسدس حالی کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک وسیع میدان نظر آیا۔ جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں

---

(۱) آزاد، محمد حسین۔ نیرنگ خیال، لاہور، ۱۹۰۷ء، ص ۲ (دیباچہ)

اور اس میدان کی سیر کریں۔.....

ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار راستہ میں رہ نورد ہے۔"

...... بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار راستہ پر پڑ لیے۔

نئے زمانے کا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے جی سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔" (۱)

مذکورہ بالا عبارت کے مطالعہ سے ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ حالی نے "مشاعرۂ پنجاب" کے لیے جو نظمیں لکھی تھیں اور مشاعروں میں سنائی تھیں ان میں شعوری کوشش کو دخل نہ تھا بلکہ مولوی محمد حسین آزاد کی تنظیمی کوشش میں تعاون کا اظہار تھا اور کرنل ہالرائڈ کی تجویز سے اتفاق و تائید کا ایک مظاہرہ۔

دیباچہ میں "بیس برس کے تھکے ہارے" کا ٹکڑا اس امر کا شاہد ہے کہ نظم کی طرف توجہ اور شعوری کوشش سرسید کے ایما و اثر سے کی اور مسدس حالی اس کی اصل ابتدا ہے۔ مشاعرۂ پنجاب کی نظموں کو محض شرکت مشاعرہ کی تقریب سمجھا جائے گا۔

نظم نگاری کے سلسلہ میں یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی تحریک مولوی محمد حسین آزاد کے ذہن کی پیداوار نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ اُنھوں نے اردو ادب میں نظمِ جدید کی پذیرائی کا پرچار پوری کوشش سے کیا اور ایک تحریک کی صورت میں ملک کے شعرا سے اپیل کی اور اُنھیں "نظمِ جدید" کی طرف متوجہ کیا۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

"تمھارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز

---

(۱) حالی، الطاف حسین، مسدس حالی لکھنؤ، ۱۹۱۹ء ص ۴۳-۷۴ (دیباچہ)

کے موجد ہے مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔"

ہاں صندوقچوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔" (۱)

اپنے خیال کی مزید وضاحت اُنھوں نے یوں کی ہے۔

"کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں۔ اتنی ہی قدرت نظم پر ہو جائے جس کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔" (۲)

"نظم اردو کے عنوان سے غلام حیدر نثار نے جو مولانا کے ایک شاگرد تھے مشاعرہ پنجاب پر ان سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

نظم اردو

"۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں عمدہ یادگار سمجھا جائے گا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعرائے آتش بیان کی طبع روشن تھی دوسرا پرزہ اُمرائے زندہ دل کی گرم طبیعت ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدے کو ولادت دی اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اس حالت میں بڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے اُستادوں نے نکالے تھے۔ موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح اُنھیں لیتے تھے۔ الفاظ ادل بدل کرتے تھے اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائریکٹر بہادر

(۱-۲) آزاد، محمد حسین نیرنگ خیال حصۂ اوّل لاہور، ۱۹۰۷ء ص ۱۰۴

نے سالِ مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ اُنھوں نے اس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہلِ علم، اہلِ ذوق جمع ہوئے نثر اور نظم پڑھی گئی اور سب نے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا کہ شعرا ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ گیارہ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر چودہ برس کے عرصے میں اتنا اثر ہوا تو اب ہندستان کے مشہور شہروں میں ویسی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی اور لوگ طلبگار ہیں چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے اس کے حرفوں کو مٹنے دینا نہیں چاہیے اس لیے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے۔ تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے۔،، (۱)

راقم بندہ غلام حیدر نثار شاگرد حضرت آزاد

مشاعرۂ پنجاب کی حیثیت ایک تاریخی یادگار مشاعرہ کی ہے۔ جس کے ذریعے اردو نظم کو فروغ ملا اور اس کی ترویج کا سامان ہوا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس راہ میں پیش رو کی حیثیت اختیار کر کے اردو شعری ادب کو مفید اور پسندیدہ بنایا اُنھوں نے کہا تھا۔

"(۲) میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں جنھیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوں اور ایک مثنوی جورات کی حالت

---

(۱) نثار، غلام حیدر، نیرنگ خیال حصہ اول لاہور ۱۹۰۷ء ص ۱۵۵

(۲) آزاد محمد حسین، نیرنگ خیال حصہ اول لاہور ۱۹۰۷ء ص ۱۰۸

پر لکھی ہے اس وقت گوش گزار کرتا ہوں۔"

شام کی آمد اور رات کی کیفیت:

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو — عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

اس نظم میں ایک سو پندرہ (۱۱۵) اشعار شامل ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس نظم کو مثنوی کہا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خیال نیا ہے۔ لیکن ہیئت میں کوئی نیا تجربہ داخل نہیں ہے۔ مثنوی کی بحر کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اردو اصنافِ سخن میں پہلے سے داخل ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت تسلسل ہے اور اس انداز سے یہ صنف انگریزی نظموں سے کسی قدر مطابقت پیدا کر لیتی ہے۔ بہر حال مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی اس مثنوی یا نظم میں عموماً قافیہ اور ردیف کی پابندی کی ہے۔ لیکن صفحہ ۱۰۹ پر ایک بند میں یہ اشعار ملتے ہیں جن میں صرف قافیہ ہے ردیف کی پابندی نہیں ہے۔ مثلاً:

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی — ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی

دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر ختم — کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

لیکن اسی بند کے آخری تین اشعار میں قافیہ اور ردیف دونوں کی پابندی ہے۔

روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں — اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسے تو رخ ترا دنیا بہار ہے — شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر

پورا ہے تیرا حکم پہ آدھے جہان پر

اس سے آگے دیکھیے تو صفحہ ایک سو گیارہ (۱۱۱) پر ایک بند کے پہلے دو شعروں میں، قافیہ ردیف کی پابندی ہے مگر تیسرے اور چوتھے شعر میں صرف قافیہ نظم ہوا ہے مثلاً شعر نمبر ۳

کیجے ذرا خیال کہ ملائے نکتہ داں — بیٹھا ہے سر جھکائے بیاۓ چراغ داں

شعر نمبر ۴

کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی   مضموں جو ہم وگر ہیں الجھتے کبھی کبھی

اس کے بعد اشعار ۵، ۶، ۷، میں پھر قافیہ ردیف کی پابندی ہے۔ اس نظم میں صفحہ ۱۱۳ پر یہ شعر ملتا ہے۔

کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر   اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

یہاں آزاد نے گھوٹ کا قافیہ پھوٹ نظم کیا ہے یہ سہو بھی ہو سکتا ہے یا ممکن ہے اس دور میں اس انداز کے قوافی جائز سمجھے جاتے ہوں یا پھر ایک صوتی فضا قائم رکھی ہے اور اصول قافیہ میں لچک پیدا کرنے کو یہ طریقہ برتا گیا ہے۔

بہر حال اس داغ بیل سے اردو کی عمارت بلند ہونے کا عمل ہمارے سامنے آتا ہے اس کی افادیت اور مقبولیت کے ثبوت میں "مسدس حالی" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے ایک طرف شعرا کو اور اہل نظر کو بیحد متاثر کیا دوسری طرف قوم کے ذہن کی تربیت کی اور نئی نسل کے ذہنوں کو "پاکیزہ مواد" عطا کیا۔ "مد وجزر اسلام" کے دوسرے دیباچہ میں (۱۳۰۳) ہجری، ۱۸۸۶ء، صفحہ ۶، ۷، حالی نے لکھا ہے۔

"بعض قومی مدرسوں میں اس کا قومی انتخاب پڑھایا جاتا ہے مولود شریف کی محفلوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اس کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ شمالی مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر لیا گیا ہے۔"

جدید نظم کے سلسلہ میں جہاں تک ہیئت کی تبدیلی کا سوال ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کی کوششوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ پتا چلتا ہے کہ آزاد نے مثنوی کو اور حالی نے مسدس کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور ان دونوں اصنافِ سخن میں تسلسلِ بیان کا عنصر مشترک ہے۔ اظہار خیال کے لیے ان کی بحروں میں وسعت بھی ہے۔ غزل کی تنگ دامانی نہیں ہے۔ ریزہ خیالی اور انتشار سے بچنے کا ایک مناسب اور پسندیدہ راستہ ہے۔ حالی کے یہاں مواد کی نوعیت میں جدیدیت کا اظہار نہیں ہے بلکہ ملنبدی کی عکاسی ہے آزاد کی نظموں کا مواد نیاپن لیے ہوئے ہے اور فطری منظر نگاری بہتر ہے۔ لیکن حالی کے مواد اور اسلوب میں خلوص اور صداقت کی چمک دمک ہے اور انھوں نے مسدس کی ہیئت کے ساتھ اپنے مواد و اسلوب کی دردمندی اور سچائی پر بھروسا کیا ہے۔ چنانچہ اس کا اظہار انکساری کے انداز میں یوں کیا ہے:

"نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے مگر الحمدللہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اُمید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا۔ (۱)

معاصرین میں مولانا شبلی نعمانی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مشاعرۂ پنجاب سے ان کا تعلق نہیں ہے مگر وہ سرسیدؔ کی پیدا کردہ علمی، شعری فضا سے متاثر ہیں۔ "مجموعہ شبلی نظم اردو"، کو محمد قربان علی بسمل دہلوی نے اپنے مطبعِ شاہجہانی سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ نظم سے چند باتیں پیش کرنی ضروری ہیں۔

۱) پہلی نظم "مساواتِ اسلام" ہے۔ جس میں مطلع نہیں کہا گیا ہے۔ بلکہ پہلا شعر یوں درج ہے۔

---

(۱) حالی، الطاف حسین ضمیمہ مسدس حالی، بارششم، لکھنؤ ۱۹۱۹ء ص ۷-۸

بدر میں معرکہ آرا جب ہوا لشکرِ کفر ؛؛ عتبہ ابن ربیعہ تھا امیر العسکر

اس پوری نظم میں مصاریع ثانی میں پسر، باہر، سفر، جگر وغیرہ قوافی کا التزام ملتا ہے ردیف کی پابندی نہیں ہے۔

دوسری نظم "خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ درج ہے۔ اس نظم کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس نظم میں بھی مطلع نہیں بلکہ اس شعر سے آغاز ہوتا ہے۔

عام الرّمادہ کہتے ہیں جس کو عرب میں لوگ　　عہدِ خلافتِ عمری کا وہ سال تھا

اس نظم میں محال، خیال، احتمال وغیرہ قوافی کی صرف مصاریع ثانی میں پابندی ہے اور "تھا" ردیف کی مستقل طور پر پابندی ہے

تیسری نظم "عدلِ فاروقی کا ایک واقعہ" ہے۔ اس نظم میں بھی مطلع نہیں ہے۔

ایک دن حضرتِ فاروق نے منبر پہ کہا ؛؛ میں تمھیں حکم جو کچھ دوں تو کرو گے منظور

مذکور نظم میں فتور، حضور، مستور وغیرہ قوافی مصاریع دوم میں نظم کیے گئے ہیں۔

"شغلِ تکفیر"، میں خبردار، اظہار، دیندار وغیرہ قوافی ہیں اور ردیف کے "دو کلمے ہیں" نہیں ہیں"

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" اس میں ردیف دو کلمی ہے۔ قوافی دشوار تیار، ہشیار وغیرہ۔ ردیف " بھی نہیں"

اس مجموعہ نظم کی تمام نظمیں بغیر مطلع کے ہیں ایک نظم " بربادیٔ خانماں" ہیئت کے اعتبار سے دوسری نظموں سے مختلف ہے۔ جس کا پہلا بند یہ ہے۔

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا　　وہ جو مجموعہ ہر خوبیٔ انسانی تھا

وہ جو گھر بھر کے لیے رحمتِ یزدانی تھا　　قوتِ دستِ ودلِ شبلیٔ نعمانی تھا

بل اُسی کا یہ میرے خامۂ پُر زور میں تھا

جوش اُسی کا تھا جو میرے سرِ پُر شور میں تھا

لیکن بند نمبر ۳، ۴، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ کے

چاروں مصاریع میں قوافی کی پابندی ہے اور تمام بندوں کے آخری اشعار میں قافیہ اور ردیف دونوں کی پابندی ہے ۔ یہی ایک نظم ایسی ہے جس کے آخری بند میں تخلص بھی نظم کیا گیا ہے۔

اے خدا شبلیؔ دلخستہ باایں موئے سفید لیکے آیا ہے تری درگہہ عالی میں اُمید
مرنے والے کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید خوش و خرّم رہے چھوٹا مرا بھائی یہ جنید

کیا لکھوں قصّۂ غم تابِ رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامۂ پُرزور میں دم بھی تو نہیں

یہ نظم غالباً اپنے بھائی اسحاق کی وفات پر لکھی ہے :

جدید نظم کے ان تین فنکاروں کی تخلیقات سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) حالیؔ اور شبلیؔ کے موضوعات مشرقی اقدار کے نمائندہ اور مسلم کلچر کے عکاس ہیں اور آزادؔ کے موضوعات مغربی تمدّن کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۲) حالیؔ اور شبلیؔ کا ذہن سر سیّد کی شخصیت اور علی گڑھ تحریک سے وابستگی کا نتیجہ ہے اور محمد حسین آزادؔ کے ذہن کی ساخت میں کرنل ہالرائڈ اور مغربی شعرا کا اندازِ فکر کارفرما ہے۔

(۳) ہیئت کے نقطۂ نظر سے آزادؔ نے مثنوی کو منتخب کیا جس میں تسلسل خیال باقی رہتا ہے اور یہ صنف اس طرح انگریزی شاعری سے نزدیکی پیدا کرتی ہے حالیؔ نے مسدّس کی ہیئت کو اختیار کیا اور اس کو عام کیا۔ اس میں بھی مثنوی کا فیض جاری ہے یعنی تسلسل کی صفت قائم رہتی ہے۔

(۴) شبلیؔ کی نظموں میں روایتی شاعری کے بندھن سے شاعر نے نجات حاصل کی ہے۔ اس لیے کہ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ کی پابندی مسلّط رہتی ہے اور مسدّس میں عموماً قافیہ اور ردیف دونوں کی حکمرانی ہے۔ شبلیؔ کی نظموں میں مطلع کا اہتمام ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ہر نظم کے مصاریع دوم میں

قافیہ ور دیف اور بیشتر صرف قافیہ کی مدد لی گئی ہے اس طرح ہر نظم کے مصاریع اولی، قافیہ اور ردیف کی جکڑ بندی سے آزاد ہیں روایتی شاعری سے یہ انحراف اردو نظم کی یہ جدیدیت کا ایک نمایاں نشان ہے اور اس حیثیت سے شبلی کو آزاد اور حالی پر ایک حد تک فوقیت حاصل ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی آزاد حالی اور شبلی کو جدید اردو نظم کے معماروں میں یکساں طور پر شمار کرنا چاہیے۔

یہ درست ہے کہ ۱۸۷۴ء میں لاہور میں نئے طرز کے مشاعروں یا مناظموں کی بنیاد پڑی لیکن حالی کا خیال ہے کہ:

"یہ سب برکت سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار اور ۱۸۷۰ء میں سرسید کے جاری کردہ اخبار "تہذیب الاخلاق" کی تھی جس کے ذریعے سے ادب میں انقلاب کا پیغام دیا گیا۔" (۱)

اپنی بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے حالی نے لکھا ہے۔

"تہذیب الاخلاق کے مقاصد میں شعر و ادب میں انقلاب پیدا کرنا، جھوٹی اور بناوٹی تحریروں کا اثر دلوں سے دور کرنا۔ اور شاعری کی مروجہ خرابیوں اور خیال بندیوں کے ناقص طریقوں سے بچنے کی طرف مائل کرنا، تاکہ نیک جذباتِ انسانی ظاہر کیے جا سکیں اور فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا صحیح مقام اپنے ادب میں پیدا کیا جا سکے اور ممالکِ غیر کے معاصرانہ ادبی رجحانات سے فائدہ اُٹھایا جا سکے"۔ (۲)

---

(۱) حالی، الطاف حسین، دیباچہ مجموعہ نظم حالی، علی گڑھ ۱۹۱۸ء ص (۱)

(۲) حالی، الطاف حسین، "تہذیب الاخلاق" جلد نمبر ۳ نمبر ا علی گڑھ یکم محرم ۱۲۸۹ھ

اسماعیل میرٹھی کی جدید شاعری اور اس کے عناصر

کسی شاعر کے کلام کی پرکھ اور اس کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین کے بارے میں معاصرین کی رائے نہایت اعتبار اور اہمیت رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں معمارِ اعظم کا درجہ رکھتے ہیں وہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے ہم عصر تھے۔ مولانا کے کلیات کا پہلا ایڈیشن ان کی زندگی ہی میں ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس سلسلے میں اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"میں نے دیوان کے اکثر حصے دیکھے اور بہت پسند آئے۔ مولوی صاحب کا کلام ہم لوگوں کی تعریف سے مستغنی ہے۔"

(۲۱ر جنوری ۱۹۱۱ء)

ہفت رنگ

مولانا اسماعیل کی جدید شاعری ہفت رنگ کی شان رکھتی ہے۔ یعنی ان کی شاعری تاریخی، قومی یا سماجی، اخلاقی، علمی، نیچرل، تصوّف اور دیہی زندگی کے عناصر سے مرکّب ہے۔ ان میں جدید علمی، نیچرل اور دیہی زندگی کے تین الگ الگ اور ایسے آئینے ہیں جن کے جلووں کی تابناکی ان کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا گیا تھا۔ مثلاً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۲ر جون ۱۹۱۱ء میں ہمیں یہ تحریر ملتی ہے۔

"مصنف نے اپنی نظموں میں جابجا جدید علمی خیالات کو بہت عمدگی

کے ساتھ باندھا ہے۔"

اودھ اخبار لکھنؤ ۶ر فروری ۱۹۱۱ء میں یہ اعتراف کیا گیا ہے۔

"کلیات اسماعیل"، مولانا کے ہر صنف کے نیچرل، اخلاقی اور پند آموز کلام سے مالامال ہے۔"

برہان دہلی فروری ۱۹۴۰ء میں کہا گیا ہے۔

"وہ نثر سے زیادہ نظم میں ایک مخصوص طرز کے موجد تھے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو نظم میں نیچرل شاعری کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔"

علامہ نیاز فتحپوری نے رسالہ نگار ستمبر ۱۹۳۹ء میں اظہارِ خیال کیا ہے:

"ان کی نظمیں دبستانی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اردو کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے گئے۔"

مولانا اسماعیل میرٹھی کے کلام میں ایک وصف کی طرف کم حضرات کی نگاہ پہنچی۔ جس طرح پریم چند نے شہروں سے نکل کر دیہات کی زندگی کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ مولانا اسماعیل نے اپنی شاعری میں دیہی زندگی کے عنصر کو شامل کیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اسماعیل میرٹھی کی اس خصوصیت کا یوں ذکر کیا ہے۔

"اسماعیل اردو کا رجحان دیہی شاعری کی طرف پھیرنا چاہتے تھے کئی عمدہ نظمیں اس سلسلہ میں کہی ہیں۔ مثلاً، برسات، گرمی کا موسم، صبح کی آمد۔" (۱)

مولانا اسماعیل میرٹھی کے اندر اردو نظم گو شاعر کی تلاش سے پہلے ہمیں

---

(۱) اعجاز حسین۔ نئے ادبی رجحانات، الہ آباد، ۱۹۴۲ء ص ۵۷

ان محرکات و عوامل پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے جس نے شاعر کو "غزل" کی محفل سے "نظم" کی وسیع دنیا میں پہنچا دیا۔

اسماعیل میرٹھی اردو انحطاطی دور کے بلند و برتر شاعر ہیں۔ یعنی انیسویں صدی کی وہ اکائی جس کو قدیم اردو کا بھرپور اور ریختہ کا ارتقائی عالم کہہ لیجیے۔

آزادیٔ ہند کی پہلی ناکام تحریک سے پندرہ سولہ برس قبل اور انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد سے تقریباً چالیس برس پہلے کا دور اصلاً انتشار کا دور تھا۔ مغل حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ برٹش سامراج ہندستان کی سرزمین پر اپنے قدم گاڑ چکا تھا۔ راجہ اور نواب الگ الگ اپنا اقتدار جما رہے تھے۔ مگر برطانوی سنگینوں کی چھاؤں تلے ایک طرف عام اضمحلال تھا اور دوسری طرف مغربی تعلیم و تمدّن کے اثرات سے ذہنوں میں سیاسی بیداری کی روشنی آنے لگی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک اصل میں قومی افتخار کی محرّک ثابت ہوئی۔ جاگیرداروں اور نئے نوابوں اور رجواڑوں کے دربار میں رومانی تصوّریت کی روح کارفرما تھی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کے دلدادہ تھے۔ لیکن تجارت بڑھ رہی تھی۔ اونچے درمیانی طبقے اور متوسط طبقے میں مغربی ادب اور سیاست راہ پا رہی تھی۔ پھر بھی اس بظاہر عظمت کے باوجود مولانا کا دور اصلاً بے اطمینانی کا دور تھا ایک عبوری دَور تھا۔

مذہب میں ایک مسلمہ کٹر نظریات کے خلاف طوفان اُٹھ چکا تھا۔ سرسیّد اور ان کے رفقا کی جانب سے منظّم محاربہ جاری تھا۔ ادھر شاہ ولی اللہ کی تحریک اور دیوبند تحریک ذہنوں کو متاثر کر چکی تھیں۔ اردو میں قرآن کا ترجمہ ہوا نئے خیالات شہر اور بڑے قصبوں میں پہنچ رہے تھے۔ جنھوں نے ایک اصلاحی تحریک کا روپ لے لیا تھا۔ بغاوت صرف مذہب یا سامراج کے خلاف نہ تھی بلکہ جاگیرداری نظام کے خلاف بھی تھی۔

مزدور طبقے میں بھی بے چینی کے آثار تھے اور آزادی کی علامات جھلک

رہی تھیں، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا تھا۔ اقتصادی بے اطمینانی کے بعد ایک علانیہ بغاوت کا ذہن بنتا جارہا تھا جو جاگیرداری نظام کی جڑوں اور سامراج کی بنیادوں کو خالی کر رہا تھا۔

مولانا میرٹھی کا دور اگرچہ سامراجی دور تھا مگر نشاۃ ثانیہ اور اصلاح اور آزادی کے نقوش اُبھرنے لگے تھے۔ مولانا اسمٰعیل کا ذہن نبات خود دورِ قدیم کی عکاسی کرتا ہے وہ دورِ مستقبل کا پیغمبر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی پیدائش پرورش اور تعلیم و تربیت الخطاطی دور میں ہوئی اور اسی ماحول میں ان کی ذہنی اور جسمانی نشو ونما کی تکمیل ہوئی اور یہ وہ دنیا تھی جس میں خود فراموشی ایک حادی وضع تھی اور غالب انداز تھا۔ لیکن مذہب، سماج اور تعلیم میں سرسید، راجہ رام موہن رائے اور صوفیوں نے اصلاحات کا فرض ادا کیا تھا اور انسان دوستی کا اثر پھیل رہا تھا جس کے پیدا کردہ حُسن کے بغیر احساس، زندگی میں خوشی اور آزاد سیکولر اسپرٹ جو اردو ادب میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو اس سے متاثر ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔

مختصر یہ کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک ہمارا ادب ایک مخصوص دور کا نمائندہ ہے۔ جس کے سیاسی اور سماجی رجحانات نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر چند اس میں سیاسی بے مایگی کا عنصر غالب ہے۔ لیکن نتیجہ کے طور پر اس دور میں خالص حب الوطنی اور معاشرتی اصلاح کی آوازیں سنائی پڑتی ہیں۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی عقلیت اور اصلیت کے امتزاج سے شعر کی تخلیق کی۔ نیچرل شاعری کو جنم دیا۔ اجتماعی احساس کو مواد بنا کر اردو کا علمی میدان بڑھایا۔ اپنی آواز میں اخلاقی اور اصلاحی عنصر پیدا کیا۔ شاعری میں گم شدہ ماضی کی یاد، اتحادِ ملکی، قومی بہبود اور حب الوطنی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مختصر طور پر کہا جائے گا کہ ان کی نظموں میں ہفت رنگ کی کیفیت ملتی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی نظم نگاری کو تین شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) طبع زاد نظمیں (۲) انگریزی سے ماخوذ نظمیں (۳) انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے۔

مولانا اسماعیل کی پینتالیس (۴۵) نظموں کا ایک مجموعہ ۱۸۸۰ء میں "ریزۂ جواہر" کے نام سے چھپا تھا۔ اس کتاب میں چھے نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی شامل تھیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں اور تاریخ تخلیق بھی درج کی جاتی ہے۔

۱۔ کیڑا ۱۸۶۷ء
۲۔ ایک قانع مفلس ۱۸۶۷ء
۳۔ موت کی گھڑی ۱۸۶۷ء
۴۔ فادر ولیم ۱۸۶۷ء
۵۔ حُبِّ وطن ۱۸۶۸ء
۶۔ انسان کی خام خیالی ۱۸۶۸ء

کیڑا : اس نظم میں پندرہ شعر ہیں۔ نیچرل شاعری سے تعلق رکھنے والی معنی کے اعتبار سے اخلاقی درس کی نمائندہ ہے۔ اس میں مور کی خوبصورتی اور کیڑے کی زندگی کے حسن کا موازنہ کر کے انسان کو ہمدردی کا سبق دیا ہے۔ نیز یہ کہ انسان کی طرح کیڑوں کی زندگی میں بھی حسن ہے اور وہ قابلِ قدر ہے۔

مولانا اسماعیل کے مشاہدے، فن، تخیل اور اظہار کی خوبیاں اس نظم میں شامل ہیں۔ شاعر نے ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ نظم پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

ایک قانع مفلس

اس نظم میں سولہ (۱۶) شعر ہیں۔ مرکزی خیال یہ ہے کہ سرمایہ دار کو سچی خوشی میسّر نہیں آتی اور مفلس کو اس کی قناعت بہترین دولت ہے۔ وہ قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس نظم کو پند آموز بنانے کے لیے دو کردار

نظم ہوئے ہیں۔ ایک کردار شاعر کی ذات ہے اور مولانا نے زر دار کا کردار مقامیت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ یعنی اس کا نام کلن تجویز کیا ہے

موت کی گھڑی

اس میں انیس (۱۹) شعر ہیں۔ یہ نظم مولانا کی دوسری نظموں سے الگ نظر آتی ہے۔ اس کے مصرعے کچھ ڈھیلے ڈھالے اور تکلف و آورد کے غماز ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ شان نظر نہیں آتی جو مولانا کی خصوصیت ہے۔

فادر ولیم

یہ نظم چوبیس (۲۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک نوجوان اور ایک بزرگ کی گفتگو "زندگی اور موت" پر سوال وجواب کی صورت میں نظم کی گئی ہے۔

حُبّ وطن

اس نظم میں اٹھارہ (۱۸) اشعار ہیں۔ حُبّ وطن کا اعجاز ایک تمثیل کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ملک اسپین میں ایک طوطی کو کسی نے خرید لیا اور ملک ملاّ میں اسے لاکر ایک قفس میں رکھا۔ طوطی اس ماحول سے بیزار رہی اُسے وطن کی یاد ستاتی رہی۔ اس کا چہچہانا چھوٹ گیا اور پروں کا رنگ بدل گیا۔ آخر کار ایک دن اسپین سے ایک شخص آیا۔ اس نے طوطی سے اسپین کی زبان میں سلام کیا۔ ہم وطن کی صورت، وطن کی زبان، لب ولہجہ سے طوطی میں نئی روح بیدار ہو گئی۔ وہ چہچہانے لگی اور وطن کی محبت میں پھڑک پھڑک کر جان دے دی۔

انسان کی خام خیالی

اس نظم میں ۲۱ شعر ہیں۔ اس میں "سچی خوشی" کا معیار پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں دوسری مخلوقات کا ذکر کر کے ثابت کیا ہے کہ انسان

کے علاوہ سب فطری طور پر زندگی گزارتے ہیں۔

طبع زاد نظمیں

اخلاق

مولانا کی بیشتر نظموں سے "مثنویات" کے تحت بحث کی جا چکی ہے۔ مولانا کی اخلاقی نظمیں بھی خاصی اہم ہیں۔ ان کا مقصد پند آموزی ہے۔ لیکن پیرایۂ بیان ندرت لیے ہوئے ہے۔ یہ نظمیں اخلاقی نقطۂ نظر کے باوجود کسی زاہد خشک کا فرمان نہیں ہیں۔ دوزخ کے عذاب سے ڈرکر یا زندگی میں زہر ناکی گھُل جانے کا خطرہ پیش کر کے اخلاقِ انسانی کی درستی کا فریضہ ادا نہیں کیا ہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اخلاقی اقدار میں شاعر کا جذبۂ عقیدت شامل ہے۔ وہ اپنے مشرب کے عقائد اور کردار کی پسندیدگی کا اظہار کرنے میں مخلص ہیں۔ مولانا نے اخلاقی تعلیم کو زندگی کے مشاہدے اور تجربے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مولانا نظام الدین بدایونی نے کہا تھا۔

"کتاب (کلیات) کے اخلاقی مضامین اس کو مہذب اور نفاست پسند طبیعتوں کے مطالعہ کے قابل بناتے ہیں۔" (۱)

اس ضمن میں ان کی نظم "نورِ عرفاں" قابلِ ذکر ہے۔ اس میں عبد و معبود کا رشتہ یاد دلا کر افرادِ قوم کو غمِ روزگار سے نجات دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

(۱) نظامی بدایونی، اخبار "ذوالقرنین"، بدایوں ۱۴؍فروری ۱۹۱۱ء

حیا

مولانا اسماعیل نے "حیا" کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ انسانی کردار کا یہ قابلِ قدر وصف ہے۔ وہ اس کو پاسبان آبرو اور نیکیوں کی قوت قرار دیتے ہیں۔ عصمت و پاکدامنی اسی کرداری صفت پر ناز کر سکتی ہے۔

انسان کے اندر بہیمانہ جوش و جذبہ کے زور کو اعتدال پر لانے والی چیز "حیا" ہے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا کے نزدیک تہذیب و تمدّن کا نکھار "حیا" سے وابستہ ہے۔

مولانا اسماعیل کی اخلاقی نظموں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے کردار و عمل کے ذریعہ اخلاق کی اصلاح کا کام کیا ہے۔ کہیں بےجان چیزوں کی تمثیل کا سہارا لیا ہے۔ کہیں جانوروں کے عادات و اوصاف کے ذریعے انسان کو متوجہ کیا ہے۔ کبھی حکائی رنگ آمیزی سے انسان کو متاثر کیا ہے۔ اُنھوں نے ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں بعض خیر و شر کے کردار اپنے عمل کے لحاظ سے زندگی کو شاداب یا ویران بناتے ہیں۔ بعض نظموں میں ہمارے ارد گرد کی زندگی کی یاد دہانی کرائی ہے اور نظیروں کے ذریعے ہمارے عمل میں حرکت اور نیکی کا عنصر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

چھوٹے سے کام کا بڑا نتیجہ

ایک معنی خیز نظم ہے۔ ایک بچہ کھیل کی خاطر تالاب میں کنکر پھینک دیتا ہے۔ یہ دلچسپی کا کھیل اس کے ذہن میں تحیّر پیدا کر دیتا ہے۔ لہر اُٹھتی ہے اور دائرہ بنا دیتی ہے۔ دائرہ سطح آب پر پھیل کر پورے تالاب کے پانی

پر محیط ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اس تحیّر زا نظارہ میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں تجسّس پیدا ہوتا ہے اور تسلی بخش جواب کے لیے اپنی ماں سے استفسار کرتا ہے یہ بچّے کی زندگی کا پہلا اور نیا تجربہ ہے۔

جو نہ دیکھی، نہ سُنی کبھی اب سے پہلے ؛ شاید آئی ہے نظر مجھ کو ہی سب سے پہلے
اک ذرا سی حرکت اور یہ تاثیر عجیب ؛ دائرہ بڑھ کے پہنچتا ہے کنارے کے قریب
لبکہ جی جان سے اس شعبدہ پر تھا شیدا ؛ وسعتِ دائرہ کی اپنے عمل سے پیدا

اس حیرت اور بچّے کے نئے تجربے سے ماں نے تعلیم کا کام لیا اور جواباً کہا۔

یونہی ہر کام کا ہو جاتا ہے انجام بڑا ؛ گو کہ آغاز میں ہوتا نہیں وہ کام بڑا
کبھی ادنیٰ حرکت زلزلہ بن جاتی ہے ؛ کبھی ناچیز سی ایک بات غضب ڈھاتی ہے

یہی اندازِ نکوکاری و بدکاری ہے
اوّلاً خاص تھی اب عام میں وہ جاری ہے

ہماری کہانیوں اور نظموں میں جانوروں کے اوصاف سے یا جانوروں کی زبان سے انسان کو زندگی کے رموز سمجھانے اور اعلا اوصاف اپنی ذات میں پیدا کرنے کا طریق بہت قدیم ہے۔ اردو زبان و ادب میں روز مرّہ محاورات، تشبیہات و استعارات اور علامات متعیّن کرنے میں جانوروں کی زندگی خصوصاً ان کے خیر و شر کے اوصاف سے بہت مدد لی گئی ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ چند اشارات کافی ہیں۔ مثلاً، شیر کی بہادری، گیدڑ کی بزدلی، لومڑی کی چالاکی، گھوڑے کی وفاداری، طوطے کی بے مروّتی، اونٹ کا حلم، بلبل کی فریاد یا ہزار داستانی وغیرہ چنانچہ مولانا نے بھی ان روایات سے کام لیا ہے۔ ان کی دو نظمیں یعنی اونٹ اور شیر اسی قسم کی ہیں۔

قرض

مولانا نے سماج میں بہتر معاشرت کا رنگ بھرنے کے لیے

ہماری اقتصادی زندگی پر بھی نظر کی ہے۔ قرض ایک لعنت ہے۔ ایک تو یہ کہ قرض لینے سے خودداری، عزتِ نفس، آزادی وغیرہ خوبیاں رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہیں۔ انسان میں کمتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تملق و خوشامد کذب اور مطلب پرستی کے گھٹیا جذبات نشوونما پاتے ہیں۔ سیرت کی تباہی کے ساتھ اقتصادی بدحالی بڑھتی ہے۔ مستقبل تاریک ہوتا ہے اور اخلاقی زوال انسان کو سماج میں ناقابلِ توجہ بنا دیتا ہے۔

نیچرل نظمیں

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری میں نیچرل نظموں کی ایک مخصوص اہمیت ہے۔ مثنویات میں ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

مولانا کی نظموں میں نیچرل شاعری کے تحت جتنی نظمیں ہیں ان میں مقامی رنگ ہے۔ علامات، تشبیہات، استعارات، اور الفاظ کی فضا وہی ہے جہاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"ایک گنوار اور قوس قزح"، اس نظم میں مولانا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فطرت کے حسن سے لطف اندوزی کے لیے شعور اور حس کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ بے پڑھے لکھے لوگوں میں مظاہرِ فطرت کے بارے میں توہمات داخل ہو گئے ہیں۔ اور یہ توہمات اساطیر کی راہ سے داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً دھنک کے سلسلے میں ایک افسانہ تراشا گیا تھا کہ اس میں ایک سونے کا پیالہ ہے اور یہ کہانی گاؤں میں پھیل گئی۔ چنانچہ ایک گلّہ کا نگہبان دہقان "قوس قزح" کو دیکھ کر اس میں پیالۂ زر کا جویا ہوتا ہے۔ اور ذہن اس طرف رجوع ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فکرِ معاش سے بے پروا ہونے کا خیال کرنے لگا۔

سوچا لو جام اور بنو جم   چھوڑو بُز و گوسفند کا غم

اس خیال نے اس کو عمل پر اُکسایا۔

بیہودہ گنوار اس گمان پر | سیدھا گیا تیر سا کمان پر
دن گھٹنے لگا، قدم بڑھایا | اُمید کہ اب خزانہ پایا
جتنی کوشش زیادہ تر کی | اتنی ہی کمان پرے کو سرکی
پنہاں ہوئی قوس آخر کار | اور ظلمتِ شب ہوئی نمودار

ناکام پھرا وہ سادہ دہقان
حسرت زدہ، غم زدہ، پریشان

شفق

شفق پر بہت سی نظمیں شعرا کے یہاں ملیں گی۔ لیکن مولانا کے مشاہدے اور احساس کے ساتھ ان کا اسلوب بیان ان کی نظم کو ایک نئی چیز بنا دیتا ہے۔ مولانا نے صرف تاثرات پیش نہیں کیے ہیں بلکہ نظم میں ان کا سائنسی نقطۂ نظر بھی جھلکتا ہے۔ اور یہ بڑی اہم بات ہے کہ شاعر کسی موضوع کی طرف کس نقطۂ نظر سے متوجہ ہوا ہے پوری نظم پڑھ کر قاری کو محسوس ہوگا کہ شام کے وقت ہماری آنکھیں فضا میں جس سُرخی کی گھلاوٹ کو دیکھتی ہیں اور ہم بیساختہ اس منظر کی داد دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنے الفاظ سے وہ رنگ بھرے ہیں اور معنی کا وہ حسن عطا کیا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے ذہن پر شام کی لہلہاہٹ چھا جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے۔

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار | ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ | جنھیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے | ہر اک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ | سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ

ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی — بنفشی و نارنجی و چمپئی
یہ کیا بھید ہے کیا کرامات ہے — ہر اک رنگ میں ایک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ — بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیل گوں اس میں سرخی کی لاگ — ہرے بن میں گویا لگادی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھٹے لال بانات کے

نظم میں سائنسی شعور کی جھلک ہے۔ آخری اشعار میں محاکاتی انداز اپنے عروج پر ملتا ہے۔ دھوپ کے مختلف رنگوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

مولانا کی فطری نظموں میں صرف نیچر کی بہار اور رنگینی کا سماں ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے کسی تجربے یا اپنے مخصوص رجحان کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:

"رات" پیش پا افتادہ موضوع ہے اس میں انھوں نے انسان کے مختلف طبقوں کی راحت، کاروبار اور درختوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک شعر بھی سرمایہ دار طبقہ کی شب گزاری کے لطف و عیش کے متعلق نہیں کہا۔

برسات

یہ مختصر نظم ہے۔ مولانا نے آسمان پر گھٹا چھانے اور پھیلنے کا سماں اور فضا میں بارش سے پہلے جو ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سب کو دو شعر میں پیش کر دیا ہے۔

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا — ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی — ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی

بارش ہونے پر جہاں آب وگل کا رنگ نکھرتا ہے اس کا بیان دیکھیے :

ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے   ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ہے
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا   کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا   وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھُدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

دیہی نظمیں

مولانا کی شاعری کا یہ رجحان کہ اُنھوں نے زندگی کو اپنے مشاہدے اور احساس کا مرکز بنایا ان کو اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ مولانا کے یہاں کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی آبادیوں، ان کی سادگی، رونق راحت کا ذکر، شام کو چراغوں کی روشنی، صبح کو پرندوں کی آوازیں، جھونپڑی کچے مکان، چراگاہوں میں چرتے ہوئے مویشی اور کتے وغیرہ کا احوال ملتا ہے۔

"گرمی کا موسم"

مولانا کی ایک نظم ہے۔ بظاہر اس کو نیچرل شاعری کے ضمن میں آنا چاہیے لیکن گرمی کے موسم سے جس طبقے نے اثر قبول کیا ہے وہ دیہات میں بسنے والا ہے۔ شہروں میں موسم کی تبدیلی خارجی صورت میں نظر آتی ہے۔ لیکن پورے ماحول اور انسانی جسم و ذہن پر موسم کا اثر صاف طور سے دیہات سے متعلق ہو جاتا ہے۔

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ   بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا   ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایا

چلی لو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ
زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے
در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے
پرندے اُڑ کے ہیں پانی پہ گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے
درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمین کا فرش ہے، چھت آسماں کی
نہ پنکھا ہے نہ ٹٹی ہے نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ
امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

؎

مولانا کی شاعری میں مزدور اور کسان دونوں طبقوں کی زندگی ملے گی۔ اُس دور میں ان طبقوں کو قابلِ توجہ سمجھنا شعور کی بیداری کا بیّن ثبوت ہے۔ اُنھیں مزدوروں کی زندگی جو جھونپڑی میں گزر رہی تھی اس کی تمام تلخ کامیوں کا احساس تھا۔ ان کے علم و مشاہدے نے یہ آگہی دی تھی کہ ہندستان ایک زراعتی ملک ہے۔ کسان ہی زمین کا مالک ہے۔ اس کی محنت پر تہذیب و تمدّن کی رونق اور ارتقا کا دار و مدار ہے وہ کسان کو 'اَن داتا' سمجھتے تھے۔

کاشتکاری: اپنی اس نظم میں کسان کی زندگی دکھائی ہے کسان کو طریقہ زراعت سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس کی پیداوار اور پیداوار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ کسان کے ساتھ بیل کا ذکر لازمی ہے بیل کے اندر جفاکشی، سرگرم عمل، ناشتہ نہاری سے بے نیاز، رات کو جہاں چاہا آرام کر لیا۔ دن میں تکان دور کرنے کو زمین پر کہیں بیٹھ گیا۔ صبر و محنت، خوشی سے زندگی گزارنا۔ یہ سب باتیں پیش کر کے انسان کو

سبق دیا ہے۔ کاشتکاری کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اگر پوری نظم کہی جائے تب بھی وہ مولانا کے اس شعر کی جامعیت کا جواب نہیں ہو سکتی۔

گنج زر خاک سے اُگلوایا کیمیا شغلِ کاشتکاری ہے

عمل کا جذبہ پیدا کرنے کو اس سے بہترین دلیل ذہن کو مطمئن کرنے والی اور کیا ہوگی۔

نہیں حاصل پہ دسترس نہ سہی بیج بونا تو اختیاری ہے

کسان کو بیک وقت دو باتوں کی تلقین ہے ایک مادیت سے متعلق کام میں تندہی اور ریاض دوسری طرف اخلاقی فرض کی بجا آوری۔ کسان کی کاہلی نہ صرف پیداوار کو کم کر دے گی جس سے کسان کی اقتصادی زبوں حالی یقینی ہے اور پورے ملک پر اور قوم پر پیداوار کی کمی اثر انداز ہوگی۔ اس کے علاوہ پیداوار کی کمی، کاہلی کے سبب سے ہونا اصلاً کسان کا ذاتی فعل نہیں رہا بلکہ جماعت کا فرد ہو کر اس نے فرض سے کوتاہی برتی اور یہ فرض کی غفلت اصلاً سماجی گناہ کی حد میں آجاتی ہے۔

مولانا نے کسان اور بیل کی عملی زندگی کا بیان کر کے انسان کو مخاطب کیا ہے۔ آخری دو شعر اس نظم کا مرکزی خیال پیش کرتے ہیں۔

دیکھ چوپائے سے نہ بازی ہار تیری ہمت اگر کراری ہے

کچھ نہ کچھ کام کر اگر تجھ کو آدمیت کی پاسداری ہے

ہماری گائے

زبان کی سادگی اور موضوع کے عام ہونے سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اس نظم کو بچوں کے ادب میں شمار کرنا چاہیے۔ لیکن اس مقام پر اگر ہم ذہن کو بلند کر کے سوچیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا کے یہاں یہ موضوعِ عام کی

زد میں نہیں ہے بلکہ اس میں ایک تخصیص ہے۔ تخصیص کے یہ معنی نہیں کہ موضوع عام زندگی سے الگ ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ مولانا کے کسی معاصر نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اس لیے یہ موضوع مولانا کا خاص موضوع ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسرے انداز میں سوچیے تو دیہی زندگی میں مزدور، کسان، دستکار گھر بلو دھندے چلانے والے، سب کے لیے گائے نہایت اہم ہے۔ اس کے بچھڑے ہی کسان کی اصل دولت ہیں۔ جن کے باعث وہ پورے ملک کو غذا فراہم کرتا ہے۔ گائے کے دودھ سے بچے جوان بوڑھے سب فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی گائے قابل احترام ہے۔ اس سماج کے محنت کش طبقے متوسط طبقے اور زمیندار طبقے میں بھی 'گائے' کو پالنے کا عام چلن تھا۔

اگر آج کے حالات میں گائے پر لکھا جائے تو وہ قومی یک جہتی کا نشان ہوگا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے اس دور میں گائے پر توجہ کی اس طرح قومی اتحاد جذبہ خیر سگالی اور اقتصادیات کے لیے اپنے فکر و فن سے بڑا کام لیا۔

اس نظم میں دیہی زندگی سے علامات لے کر خیال کا تسلسل بڑی عمدگی سے قائم رکھا ہے۔ خیال کا ارتقا بند رتج اور ذہن کو متاثر کرنے والا ہے پوری نظم پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ مولانا نے گائے کی پرورش، دودھ، غذا روزانہ کا معمول بچے کو چاٹ کر اظہار محبت وغیرہ جملہ اعمال و اوصاف کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔ گویا اس پر نظم کہنے کے لیے مولانا نے مستقل طور پر ایک مدّت معیّنہ تک تفصیلات کا جائزہ لیا ہے۔

گائے کی معصومیت اور سراپا کا حسن ایک ہی شعر میں نظم کر دیا ہے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

گائے کو دی کیا اچھی صورت خوبی کی ہے گویا مورت

اب پوری نظم پیش کی جاتی ہے تاکہ قارئین کو جزئیات کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکے۔

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں — جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اُس نے سبزہ بنایا — سبزہ کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں — دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
سبحان اللہ، دودھ ہے کیسا — تازہ گرم، سفید اور میٹھا
دودھ میں بھیگی روٹی میری — اس کے کرم نے بخشی سیری
دودھ دہی اور مٹھا مسکا — دے نہ خدا تو کس کے بس کا
گائے کو دی کیا اچھی صورت — خوبی کی ہے گویا مورت
دانہ دُنکا، بھوسی چوکر — کھا لیتی ہے سب خوش ہوکر
کھا کر تنکے اور ٹھٹھیرے — دودھ ہے دیتی شام سویرے
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری — صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
سبزہ سے میدان ہرا ہے — جھیل میں پانی صاف بھرا ہے
پانی موجیں مار رہا ہے — چرواہا چمکار رہا ہے
پانی پی کر چارہ چر کر — شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا — بچے کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت — دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اُس کے بیل بنائے — جو کھیتی کے کام میں آئے

رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

مولانا اسمٰعیل میرٹھی قدیم دور کی تعلیم و تربیت کے باوجود ذہن

کے اعتبار سے نئے انسان تھے۔ وہ جدید علوم و فنون سے لگاؤ رکھتے تھے اپنی شاعری کے ذریعے ان کی تبلیغ کی اور انھوں نے بیباکی کے ساتھ سرسیّد کی علمی تحریک کا ساتھ دیا۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو ملازمت کے ذریعے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مغربی علوم و فنون کا سیکھنا بہت ضروری ہے۔

ان کی نظم "مسلمان اور انگریزی تعلیم" اس دور کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک دن تھا بحکم سرکاری — گئے اسکول جا بجا کھولے
نہ تو کچھ فیس تھی نہ داخلہ تھا — مفت تعلیم تھی اُسے جو لے
ہم مسلمان سب اکڑ بیٹھے — پہلے فتوی جواز کا ہو لے
منہ زبانی بھی اور لکھ کر بھی — پوچھ گچھ کی تو "مولوی" بولے
ایسی تعلیم سے تو بہتر ہے — آدمی ٹوکری کہیں ڈھولے
ان کو تنقیص دین کی سوجھی — تھے تعصّب کے آنکھ میں پھولے
وہم و وسواس کے رہے چلتے — سالہا سال توپ اور گولے
انتظامِ امورِ دنیا کو — کیا سمجھتے یہ جنّتی بھولے
جس کو ہو کچھ بھی فہم سے بہرہ — اپنے شربت میں زہر یوں گھولے
رہنما بے خبر، تو بات کو پھر — کون میزانِ عقل میں تولے
رہے علم معاش میں کورے — شہر، قصبے محلّے اور ٹولے
ہیں ہمارے جو اور ہمسائے — گویا بیٹھے ہی تھے وہ منہ کھولے
خوانِ یغما پہ جا کے ٹوٹ پڑے — بھر لیے ٹھونس ٹھونس کر جھولے
لگی ہلدی نہ پھٹکری اور مفت — خوب موٹی معاش کے رولے
محکموں کی پلٹ گئی کایا — آنسوؤں کے بدل گئے چولے
کہا سیّد نے قوم سے "ناداں" — تو بھی اٹھ بیٹھ ہاتھ منہ دھولے

پہلے کھیتوں میں بیج تو بولے ۔۔۔ پیچھے اُمید جمع خرمن کر
اور ہم نے بھی بال و پر کھولے ۔۔۔ تب ہوئی کچھ جھجک ہماری دور
متواتر لگے وہ ہچکولے ۔۔۔ مگر اس فیس کی گرانی کے
اور ہمت کے ہو گئے ہولے ۔۔۔ حوصلہ کا نکل گیا بھرکس
سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے ۔۔۔ الغرض وہ مثل ہوئی اپنی

اس نظم میں مولانا نے ہیئت میں اپنی دوسری نظموں سے الگ راہ اختیار کی ہے۔ مطلع نہیں ہے۔ دوسرے مصرعوں میں صرف قافیہ کی پابندی ہے۔

مولانا کا ذہن مغربی تعلیم وفن کے علاوہ سائنس کی ایجادات سے بھی متاثر تھا۔ ان کی نظموں میں جدید سائنس کے نقطہ نظر کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا ہم نے اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن مولانا کے ذہن کی نمائندہ نظم "ریل گاڑی" ہے۔ مولانا کے معاصرین نے اور خصوصاً آزاد اور حالی نے فطری مناظر میں اپنے موضوعاتِ نظم تلاش کیے ہیں سماج سے بھی موضوعات لیے گئے ہیں۔ لیکن نظمِ جدید کے تصوّر سے موضوع کی اتنی ہم آہنگی کوئی پیدا نہ کرسکا۔

"ریل گاڑی" کے آخری دو شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بچوں کے لیے کہی گئی ہے۔ اس لیے اس کو "بچوں کے ادب" میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن موضوع کی سائنسی اہمیت کی وجہ سے اس پر یہاں نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس نظم میں مولانا نے "ریل" کی صورت میں سائنس کا پورے ملک میں فیضان، سماج میں اس کی برکتیں، تجارت کی سہولت صنعت وحرفت کا فروغ، ملک ملک کے انسانوں کا ملاپ اور دنیا کی شادابی کو ایک علامت یعنی "ریل" سے وابستہ کر کے دکھایا ہے ذخیرۂ الفاظ، مقتضائے حال اور روزمرّہ، محاورہ کے ساتھ محاکاتی

پہلو کے عمدہ نمونے اس نظم میں پائے جاتے ہیں۔ مولانا کے اس موضوع کا ترقی پسند شاعروں نے اثر قبول کیا۔ اسرارالحق مجازؔ کی نظم "ریل" اسی تاثر کا نتیجہ ہے۔ وہ مقبول بھی ہے اور مولانا کے انداز کی تفصیل بھی۔

حیواں ہے وہ نہ انساں، جن ہے نہ وہ پری ہے
سینے میں اُس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے
کھا پی کے آگ پانی، چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھواں اُڑا کر غصّہ اُتارتی ہے
وہ گھورتی گرجتی، بھرتی ہے اک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اس نے کاٹا
آتی ہے شور کرتی، جاتی ہے غل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی
پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اس نے سوداگری کے تن میں
برکت سے اس کی بے پر، پردار بن گئے ہیں
ملک اس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں
ہم کہہ چکے مفصّل جو کچھ ہے کام اس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اس کا
جی ہاں سمجھ گیا میں پہلے ہی میں تے ناڑی
وہ دیکھو آگرے سے آتی ہے ریل گاڑی

تصوّف ومعرفت

مولانا اسماعیل میرٹھی کی پرورش اور تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی

تھی۔ اس لیے اُن کا طبعی رجحان روحانیت کی طرف زیادہ تھا۔ کسبِ معاش کو وہ ضروری سمجھتے تھے لیکن روح کی غذا پر زیادہ زور تھا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ مولانا سیّد غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے فیضان سے مولانا اسمٰعیل کی طبیعت پر تصوّف کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ ان کو اپنے پیر و مُرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ خود بھی ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تصوّف کے بارے میں اپنے شیخ کے ارشادات سے بہت زیادہ واقفیت بہم پہنچائی۔ مولانا اسماعیل کے پیر بھائیوں میں ڈپٹی نجم الدین، مولوی گل حسن، قاضی فتح محمد لدھیانوی، نواب محمد ابراہیم عرف نواب پہلوان دہلوی، شیخ احسان اللہ جھجر، حافظ ظہور محمد انصاری مدنی، میر غالب حسین بریلوی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض پیر بھائی مولانا میرٹھی سے تصوّف و معرفت کے متعلق نظمیں کہنے کی فرمائش کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کے حضور "نذرِ عقیدت" میں والہانہ اور جذبہ خلوص و نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ شیخ کے وصال پر طویل نظمیں لکھی ہیں۔ نظم میں شیخ کے اوصاف اور فیضان کا رقّت آمیز انداز میں بیان کیا ہے۔

مسائلِ تصوف اور نکاتِ معرفت کی تبلیغ کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں۔ بعض کا ذکر مثنویات کے تحت ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ نظم کی صورت میں مختلف ہیئتوں کے ساتھ بھی تصوّف کے موضوع پر مواد ملتا ہے۔ مثلاً صفتِ شیخ، میرا خدا میرے ساتھ ہے، ہفت دردِ محمود، تماشائے خیالی، علیک السلام اے شفیع البرایا، تو ہی ظہورِ کون و مکاں، زمانہ تن پرستی میں گزارا، نہیں معلوم کیا واجب ہے، السلام اے شاہ، یادِ الٰہی، ساقی خمخانہ وغیرہ نظمیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ان نظموں میں "میرا خدا میرے ساتھ ہے" مخمّس کی صورت میں ہے۔

پانچواں مصرع مستقل ہے یعنی "کیوں کہ میرا خدا ہے میرے ساتھ"، باقی چار مصرعوں میں کہیں قافیہ اور کہیں قافیہ و ردیف دونوں کی پابندی ہے۔ "ہفت درود محمود" سیدّ غوث علی شاہ کے وصال سے متعلق ہے۔ بہت طویل ہے اس میں تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) اشعار ہیں۔ اس میں جس ہیئت سے کام لیا گیا ہے وہ دوسری نظموں میں مستعمل نہیں کی گئی۔ یہ نظم ترجیع بند میں ہے۔

مختلف ہیئتوں کا استعمال

مولانا نے مثنوی کی ہیئت کے علاوہ اور دوسری ہیئتوں سے بھی کام لیا ہے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے مثلاً "مثلث" میں دو نظمیں درج ہیں۔ (۱) اب آرام کرو (۲) خدا حافظ، خدا حافظ کوئن کا۔

پہلی نظم میں چھٹپٹے کا سماں، سورج کا چھپنا، پرندوں، چرندوں کا اپنے آشیانوں اور تھان میں پہنچنا، وغیرہ مختلف دن بھر کے کاروبار کا ذکر ہے۔ لیکن اس مشاہدہ میں گھر میں پالی ہوئی مرغیوں کا تذکرہ نیا ہے عموماً شعرا اپنے ماحول کی ضروری اشیا کو بھی غیر اہم سمجھ کر اپنی شاعری میں جگہ نہیں دیتے۔ مولانا کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی نظر سے معمولی چیزیں بھی نہیں بچ پاتیں۔ وہ ان میں بھی قدر کی چیز تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

یہ جو کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں   ڈھونڈتی ہیں اپنے ڈربے کا نشاں

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

اس نظم کی فضا میں مولانا نے فطری مناظر کو بھی آرام کا خواہاں پایا ہے

اب ہوا کے تیز جھونکے رک گئے   سو گئے پیڑ اور پتے جھک گئے

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

مولانا اسماعیل نے "مربع" کی ہیئت میں صرف دو ہی نظموں پر

قناعت کی ہے۔

(۱) اچھا زمانہ آنے والا ہے (۲) بچپن میں خدا کی یاد

پہلی نظم موضوع کے اعتبار سے ہی قابلِ قدر نہیں ہے۔ بلکہ پوری نظم میں رجائیت کی جلوہ سامانی ہے۔ اس میں آٹھ بند ہیں اس کا مطالعہ کرکے قاری کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ نظم مولانا کے دور کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے زمانے کی تخلیق ہے۔ اس نظم کو مستقبل کا پیغام اور مولانا کی بشارت کہنا چاہیے۔

مولانا نے ایک خوش آیند اور بہتر سماج کی بشارت دی ہے۔ ان کی یہ نظم ملکی حیثیت کی نہیں ہے بلکہ نظامِ عالم سے متعلق ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں اپنا تجربہ اور ذہن رسا کا نتیجہ یوں پیش کرتے ہیں کہ اب اس زمین پر اسلحہ کا استعمال طاقت کے مظاہرے اور ملک گیری کی ہوس کے واسطے نہ ہوگا بلکہ اسلحہ سے "سچائی" کی حمایت کی جائے گی۔ تلوار کی جگہ نظریہ کام کرے گا۔ حق و باطل کا فیصلہ، جیت ہار کا نتیجہ، دماغ کے اندر نظریہ کی جنگ سے پیدا ہوگا۔ اسلحہ ایک ذریعے کے طور پر استعمال ہوں گے۔ اہل غلبہ اور اقتدار "زبانِ قلم"، یعنی قانون و دستور کو حاصل ہوگا۔ سماج کی تقسیم طبقاتی طور پر نہ ہوگی۔ طبقاتی بنا پر سماج میں ذلّت و عزّت کا تصور نہ ہوگا بلکہ سیرت کے اوصاف کی قدر ہوگی۔ انفرادی شخصیت کی خوبیاں سماج میں عظمت کا باعث بنیں گی۔ عظیم کارناموں کی بناپر عظیم شخصیت کو تسلیم کیا جائے گا۔ نخوت، تفاخر، برتری، مشیخت، ادنا، اعلا، وغیرہ انسانی کمزوریاں قابلِ اعتنا نہیں رہیں گی۔ جنگ بازی کو انسانیت کا دشمن سمجھا جائے گا۔ تعصب، نفرت، عقیدے کے پردے میں رقابت کا جذبہ اور اس کے قبیل کے تمام اخلاقی معائب ختم ہوجائیں گے۔ مذہب کی روح کو انسان پسند کرے گا۔ جس سے بہتر معاشرہ ترتیب پاسکے اور سماج میں شادابی خیر، برکت

اور رونق پیدا کرنے کو اتحاد ناگزیر ہے۔ عوام کے تعاون اور اتحاد سے بڑے مشکل کام آسان ہو سکتے ہیں۔

مولانا اسماعیل نے مخمس کی صورت میں پانچ نظمیں لکھی ہیں۔

(۱) "میرا خدا میرے ساتھ ہے" (مرتبہ ۲۰ جولائی ۱۸۸۷ء)

(۲) صبح کی آمد

(۳) کوشش کیے جاؤ

(۴) چھوٹی چیونٹی

(۵) خدا قیصر الہند کو سلامت رکھے

ان میں صبح کی آمد طویل نظم ہے لیکن خیال و بیان کے اعتبار سے بہت عمدہ نظم ہے۔ اس میں عمل کی تلقین ہے۔ ساری کائنات جاگ اُٹھی ہے اور اس کی بیداری میں انسان کو بیداری کا سبق پیش کیا ہے۔ ایک بند سے اُس کے حسن اور تلقینِ حسن عمل کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہر اک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے — نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سُرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے — مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

کوشش کیے جاؤ

اس نظم میں پند آموزی ہے۔ حوصلہ افزائی کا عنصر غالب ہے۔ پھر بھی شاعر کے خیال کا سہارا الفاظ ہی ہیں۔ ایک بند میں شاعر نے مشاہدے کے سہارے تمثیل پیش کر کے استدلالی شان پیدا کی ہے۔

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل — تو بے شبہہ گھس جائے پتھر کی سِل
رہو گے اگر تم یونہیں مستقل — تو اِک دن نتیجہ بھی جائے گا مِل
کیے جاؤ کوشش میرے دوستو

اس نظم کا مرکزی خیال جس کو پوری نظم کی جان سمجھیے شاعر نے ایک مصرع میں پیش کر دیا ہے۔ "طلب میں جو جستجو میں مرد"

مولانا کی نظم "چھوٹی چیونٹی" موضوع کے اعتبار سے نئی نہیں ہے۔ اس میں مشاہدے کی گہرائی بھی نہیں ہے۔ کسی تمثیل کے ذریعے اس کو زیادہ موثر بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ لیکن اس میں ایک خوبی ضرور ہے۔ صرف چیونٹی کی زندگی کا عمل پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کے عمل کی بنیاد راست خیالی اور عاقبت اندیشی پر رکھی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بند قابلِ توجہ ہے۔

کبھی کام تو نے ادھورا نہ چھوڑا کبھی تو نے تکلیف سے منہ نہ موڑا
بہت کام تو نے کیا تھوڑا تھوڑا ذخیرہ یہ جاڑے کی خاطر ہے جوڑا
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

چند نظمیں مسدس میں ملتی ہیں۔

(۱) ماں کی ممتا (۲) میدانِ کارزار (روس اور ترکی جنگ)

(۳) حیاتِ غم (مرثیہ سید اقبال احمد ہمشیرزادہ مصنف) اقبال کا انتقال ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۰۳ء میں ہوا

(۴) انسان (دو بند)

(۵) محنت کرو (دو بند)

(۶) نفسِ سرکش (ایک بند)

"ماں کی مامتا" میں کفالت اور تربیت کے فرائض کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں جذبات کا حیرت انگیز احاطہ کیا گیا ہے۔ بیان کا انداز اتنا مانوس ہے کہ ماں کی شخصیت قابلِ قدر اور بچے کی شخصیت سے پیار ہو جانا یقینی امر ہے۔

"ہفت درود محمود" کو ترجیع بند کا لباس دیا گیا ہے۔ اس میں آٹھ بند ہیں۔ ایک بند میں حالی مسدس کی ردیف اور قافیہ "پانے والا کھانے والا" کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا نے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ مترنم

نہیں ہے۔ اس لیے مذکورہ قافیہ اور ردیف کی پابندی نے ترنم کی وہ فضا پیدا نہیں کی جو حالی کے یہاں اس قسم کے مصاریع میں ملتی ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

مثلاً مولانا اسماعیل کے مصاریع کو دیکھیے۔

وہ علم و حکمت کا سکھانے والا پیامِ حق کا وہ لانے والا

٭

"جذباتِ الم"، سیّد غوث علی شاہ کی شان میں ہے۔ اس میں سات بند ہیں۔ اس کے بیان میں رقّت ہے۔ صداقت پھوٹی پڑتی ہے۔ نہایت شدید جذباتِ عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔

مثمّن

آثارِ سلف (مشعر کیفیت قلعہ اکبر آباد)

یہ مولانا کی طویل ترین نظم ہے۔ اس میں (۷۰) بند ہیں۔ مولانا نے اپنے معاصرین شعرا کی روش سے ہٹ کر اس نظم کے لیے مسدّس کے بجائے "مثمّن" کی ہیئت پسند کی ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ حالی نے اپنی نظم مسدّس کی مقبولیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے مولانا اسماعیل نے اس طرف توجہ نہیں کی اور مثمّن میں عہدِ رفتہ کی داستانِ عظمت و جلال پیش کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ "برج مثمّن" کے مشاہدے نے مولانا کو اس طرف مائل کیا ہوگا اور اُنھوں نے اپنے موضوع کے لیے مثمّن کی ہیئت کو پسند کیا ہوگا۔

یہ نظم تنوعِ موضوعات کے لحاظ سے مولانا اسماعیل کا قابلِ قدر کارنامہ ہے یہ نظم "قلعہ اکبر آبادی" سے متعلق ہے۔ مولانا نے آگرے میں بہ سلسلۂ ملازمت طویل مدت گزاری قلعہ اکبر آباد کو دیکھ کر ان کے ذہن میں جو تاثرات مترتّب ہوئے

اصل مقصود اُنھیں کا بیان ہے۔ لیکن ان تاثرات نے شاعر کے ذہن میں ماضی حال مستقبل تینوں زمانوں کو ایک آئینے کی صورت میں رکھ دیا ہے۔ جہاں دورِ اکبری کا ذکر ہوا ہے وہاں ہندستان کی قدیم تاریخ اور دولتِ ایران کی پرانی تاریخ کے اشارات بھی ملتے ہیں۔ بکرم، بھوج، ارجن، کسریٰ، سکندر جمشید وغیرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ علم و فن کی داستان کے ورق کھلتے ہیں تو فیضی و ابوالفضل کے تذکرے میں بو علی سینا، افلاطون اور مامون کے اوصاف جھلکنے لگتے ہیں۔ سیاست کی بات نکلتی ہے تو غور و غزنی کی سرگذشت اور سمرقند و بخارا کی دلفریبی تک پہنچ جاتی ہے۔ علما کی مجلس کا نقشا سامنے آتا ہے تو فارابی، طوسی، رازی اور غزالی کی دستارِ فضیلت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ قلعۂ اکبرآباد کی مخاطبت میں مغلیہ تاجداروں کے عروج کی تصویر بھی ہے اور آخری مغلوں کے زوال کا نقشا بھی۔ جس کے ضمن میں جاٹوں کی سرفرازی اور انگریزوں کے رایت اقبال کی بلندی کا بیان ملتا ہے۔ ان متنوّع موضوعات سے مولانا اسماعیل میرٹھی کی علمیت ثابت ہوتی ہے اور نظم کی خوبی کا جواز بھی ملتا ہے۔ اس لیے کہ تنوّعِ موضوعات سے نظم کے مفہوم کو عظمت ملی ہے۔ لیکن موضوعات کی وسعت ہی اس نظم میں سب کچھ نہیں ہے۔ مولانا اسماعیل نے اپنے اسلوب سے اس نظم کو شاعرانہ حُسن عطا کر دیا ہے۔ ہر چند نظم کا حُسن پوری اکائی میں ایک آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ الگ الگ جُز کے حُسن کو پیش کرنے سے حسنِ تمام کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ستّر بند کی طویل نظم قاری کے سامنے پیش کرنا دشوار ہے۔ اس لیے چند مخصوص بند پیش کیے جاتے ہیں۔ آئینے کے ہر جُز میں بھی آئینے کی صفت باقی رہتی ہے اور اس میں صورت نظر آجاتی ہے۔ اسی طرح الگ الگ ہر بند میں پوری نظم کے حسن کا جلوہ نظر آسکتا ہے۔ اور اس سے قاری کا ذہن پوری نظم کے حسن کا اندازہ کر سکے گا۔ ابتدائی بند میں ترکیب، تشبیہ اور خیال کی لطافت

محسوس کرنے کی چیز ہے۔

یارب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے　　یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے　　یا قافلۂ رفتہ کا بس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گذشتہ کی مہابت کا نشاں ہے　　بانیٔ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہی اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہی اکبر

دو بندوں میں قلعہ کے باہر کا منظر، آبِ جمن اور خندق کا ذکر کرتے ہوئے قلعہ کے در و محراب اور اس کے تعمیری حسن کا بیان ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند میں "قصرِ معلّٰی" اور سلاطین مغلیہ کے عظمت و اجلال کا فسانہ نہایت روانی اور تاثیر کے ساتھ ملتا ہے۔

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا　　یا طنطنۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا
یا شاہِ جہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا　　یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا　　دُنیا سے سِوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا
بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشنِ ملوکانہ اسی قصر کے اندر

یہ قصرِ معلّٰی کہ جہاں عام تھا دربار　　آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقفِ زر اندوز ہے مانندِ چمن زار　　اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
اب بانگِ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار　　سرہنگِ کمر بستہ نہ وہ مجمعِ حضّار
کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

دربارِ خاص میں بخشی دربان، خدّام، اعیانِ سلطنت، فتوحِ ممالک، اورنگ سبز رنگ (تختِ جہانگیر) خان اور خوانین وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے اور "برجِ مثمّن" کی کیفیت کے ساتھ کارِ جہاں کی بے ثباتی کا

نقشا قابل دید ہے۔

وہ رنگ محل برجِ ثمن کا وہ انداز　　صنعت میں ہی بے مثل تو رفعت میں سرافراز
ہاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز　　گہ ہند کی دھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے بتلائے جو کیفیت آغاز　　زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز
جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منوّر
اب ان کا مقابر میں تہہ خاک ہے بستر

اس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب　　فوارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جامِ بلوریں ہیں نہ وہ گوہرِ نایاب　　وہ چلمنِ زرتار نہ وہ بستر کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب　　یہ معرضِ خدام تھا وہ موقفِ حجاب
وہ بزم نہ وہ دور نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق در رواق اور در و بام ہیں باقی

تعمیری حسن کی وحدت میں رنگ کثرت کا اظہار مولانا اسمٰعیل نے جس قدرت اور علامتوں کے سہارے کیا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے لفظ و معنی کا یہ ربط اتنے لطیف اور کیفیت سے لبریز انداز میں دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گل　　سو وہ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کُل
کچھ خیری فرغانہ تھے کچھ لالۂ کابل　　پھر مولسری ہند کی ان میں گئی مل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامل　　تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمل
سیاحِ جہاں دیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالات مرکّب کی ہے تصویر

اس کے بعد والے بندوں میں سماجی حالت اور درباری رسموں کا تذکرہ ہے۔ درشن جھروکا، تلادان، زنجیرِ عدل، نورجہاں اور ممتاز محل کا حسن اور ذہانت، رانی جودھا بائی کی ثروت و حشمت، ان کے محلوں

کا عالم سب چیزوں کے اشارے ہیں۔ اس کے بعد مولانا اسماعیل نے قلعہ کی مسجد کی روداد بیان کی ہے۔ اس میں عظمتِ رفتہ کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں اور حسنِ تعمیر کی جھلک ملتی ہے۔ شعریت، رومانیت، صداقت رمز و ایما کا حسین ترین امتزاج ملتا ہے

وہ مسجدِ زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن — خوبی میں یگانہ ہے ولے سادہ و پُرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان تو ہے دودھ سا آنگن
کانورؔ کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے کہ خود روز ہے روشن
بلّور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے — سانچے میں عمارت کے مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
گو شمع نہ فانوس نہ بتی نہ دیا ہے — ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلیے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارے کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی — کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
ان حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح نہ تحلیل نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا — مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا — ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا — جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین

یا دھوپ ہے یا چاندنی، یا سایۂ مسکین

"مسجد" کے ان بندوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمارا ذہن اقبال کی "مسجدِ قرطبہ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ گمان گزرتا ہے کہ اقبال کے ذہن کا مسجدِ قرطبہ سے متاثر ہونا اور اظہار خیال کرنا ممکن ہے۔ اسی "مثمن" کے مطالعہ کا نتیجہ ہو۔ اس لیے کہ اس نظم کا تفصیلی پس منظر اور تنوّعِ موضوعات دیکھنے کے بعد اقبال کے یہاں بجز اسلوب بیان کے کوئی ندرت یا اضافہ نہیں ملتا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اسلاف کے اوصافِ سیرت پر خصوصی توجّہ کی ہے

وہ عیش کے مملوک تھے نے بندۂ راحت — گلگشت چمن زار تھی گویا اُنھیں عزّت
برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت — اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت
دنیا کے کسی کام میں ہیٹی نہ تھی ہمّت — بے غیرتی زنہار نہ تھی ان کی جبلّت

ہمّت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزّت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

اس بند میں شاہین و شہباز کی علامتیں مستعمل ہوئی ہیں۔ یہ مولانا اسماعیل کی اختراعِ ذہن ہے۔ غالباً تصوّف کی راہ سے اُنھوں نے ان علامتوں کو اپنایا تھا۔ ممکن ہے اقبال نے ان علامتوں کو مولانا اسماعیل سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستعار لیا ہو اور بعد میں ان کو اپنا لیا ہو۔ اقبال کے یہاں خودی کا فلسفہ شاہین اور شہباز کی مدد سے مرتّب ہوا ہے اور اُنھیں علامتوں سے ابلاغ میں مدد لی گئی ہے۔

مولانا اسماعیل نے عظمتِ دیرینہ کے ساتھ قوم کے اخلاقی زوال کو بھی پیش کیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں عیش بھی اور ناموری بھی — دولت بھی ہمیں چاہیے اور بے ہنری بھی
اعزاز بھی مطلوب ہے بیہودہ سری بھی — آوارگی منظور ہے اور راہبری بھی

گر پستی ہمت ہے تو عالی نظری بھی   مقصود رفو ہے مگر جامہ دری بھی
یہ بات تو ہوگی نہ ہوئی ہے کبھی آگے
پھرتے ہیں محالات کے پیچھے یونہی بھاگے

بشیتر بندوں میں مولانا اسماعیل نے قوم کے ادنیٰ کردار کا ماتم کیا ہے اُنھوں نے اپنے دور کا تاریخی اور سماجی نقشا دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ اب برطانوی اقتدار کو ہٹاکر ہندستانیوں کی حکومت کا خواب دیکھنا تضیع اوقات ہے۔ اس لیے اُنھوں نے مثبت رائے قائم کی اور مثبت مشورہ دیا

اس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی   یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی
یہ جنگ ہے تحصیلِ عمل اور نظر کی   یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی
آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی   اس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی
یہ جنگ نہیں وضعِ مروّت کے منافی
اس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

مولانا اسماعیل نے آخر میں نوجوانوں کو عظمتِ کردار کی تلقین کی ہے اور علم کی شمع سے اپنی زندگی روشن کرنے اور مستقبل کو منور بنانے کا پیغام دیا ہے۔

اس نظم کو "کلیات اسماعیل" میں شاہکار کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ہیئت کے نئے تجربے

مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی نے نظم جدید کی تبلیغ کی اور اس میں اُنھیں کامیابی نصیب ہوئی لیکن ان حضرات نے بنے بنائے سانچوں سے کام لیا۔ بڑا کارنامہ ہیئت کے سلسلے میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ "مثنوی اور مسدس" کی ہیئتوں کو مستعمل کیا

گیا۔ البتہ عبدالحلیم شرر نے منظوم ڈراموں میں ہیئت کا نیا تجربہ کیا تھا۔ جو اسی مخصوص صنف سے متعلق تھا۔ اردو میں ڈراما کا فن آج بھی دوسری اصناف سخن کی بہ نسبت کم ترقی یافتہ ہے۔ اس لیے اس کا ہمہ گیر اثر نہ تھا۔

جدید نظم نگاروں کی نورانی محفل میں مولانا اسماعیل میرٹھی ہی تنہا وہ نظم نگار شاعر ہیں۔ جنھوں نے اپنی نظموں میں ہیئت کا نیا تجربہ کیا اور اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

مولانا نے اردو ادب میں "ابیات" کا اضافہ کیا۔ فردیات کا رواج قدیم سے ہے۔ لیکن مطلع کی صورت میں ایک خیال کو صرف دو مصرعوں میں مرکوز کر دینا مولانا کا اختراع ہے۔ مولانا نے مکمل خیال کو "قطعہ" سے بھی چھوٹی ہیئت میں پیش کرنے کا نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ ایجاز بیان اور جامعیت کی نادر مثال ہے۔ اس کو "دو بیت" یا یک شعری نظم کہیے۔

"ابیات" میں اخلاقی درس و حکمت شامل ہیں۔ مثلاً:-

"اچھی بات"

جو بات کہو صاف ہو ستھری ہو بھلی ہو   کڑوی نہ ہو کھٹی نہ ہو مصری کی ڈلی ہو

وقت سے کام لو

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ   کھینچنے سے بڑھتی ہے چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

بری صحبت سے بچو

بد کی صحبت مت بیٹھو اس کا ہے انجام برا   بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا

مولانا نے بعض کہانیوں کا اخلاقی سبق ابیات میں نظم کیا ہے۔ مثلاً:-

کیا کیا خیال باندھے نادان نے اپنے دل میں   پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت　　نہیں کام آتی دلیل اور حجت

؛

جب کہ دو مولویوں میں ہو گھٹ پٹ　　اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

مولانا نے بعض ابیات میں حکیمانہ تجربے پیش کیے ہیں۔

اعتدال خیال

نہ حلوا بن، کہ چٹ کر جائیں بھوکے　　نہ کڑوا بن، کہ جو چکھے سو تھوکے

اعتدال غذا

نہ کھاؤ اتنا زیادہ کہ ڈال دے بیمار　　نہ اتنا کم ہو کہ ناطاقتی ہی ڈالے مار

راستی

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں

کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

احساس وقت

خبر لو وقت کی اپنے خبر لو　　اُڑا جاتا ہے جو کرنا ہے کر لو

بخیلی

ہر چند اس کے مال سے کچھ واسطہ نہ ہو　　پھر بھی بُرا ہی کہتی ہے خلقت بخیل کو

مولانا نے مذکورہ ابیات میں معلّمین اخلاق کے اور اپنے تجربوں کا اظہار کیا تھا۔

اب ایک "بیت"، یعنی ایجازی نظم کو نگاری کے مطالعہ کے لیے ہم پیش کرتے ہیں اس میں فلسفہ و منطق کا استدلال ہے اور حدیث کا مضمون بھی۔

ساغر زرّیں ہو یا مٹی کا ہو ایک ٹھیکرا　　تو نظر کر، اس پہ، جو کچھ، اسکے اندر ہے بھرا

ان ایجازی نظموں میں "کلیات اسماعیل"، کے صفحات پر چند غزلوں کے شعر یا فردیات بھی درج ہو گئے ہیں۔ انھیں ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔

عظیم و نادر کارنامہ

مولانا اسماعیل میرٹھی نے دو نظموں میں ہئیت کا نیا اور کامیاب تجربہ کیا ہے اس لیے یہ نظمیں ان کا عظیم و نادر کارنامہ سمجھی جائیں گی۔ ان نظموں کے خالق کی حیثیت سے ایک طرف وہ اپنے معاصرین میں ممتاز انفرادی مقام پاتے ہیں اور دوسری طرف ترقی پسند آزاد نظم نگار شعرا میں وہ مشعلِ ہدایت قرار پاتے ہیں۔ پہلی نظم "تاروں بھری رات" ملاحظہ فرمایئے۔

تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے — مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

جونہی آفتاب تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم — یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں — بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی — نہ میسّر آتی ان کو
تو غریب جنگلوں میں — یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی — نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشانِ راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے — وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی — کہیں کھیت کٹ رہا ہے

کہیں گہہ رہا ہے خرمن نہیں آنکھ ان کی جھپکنی
یونہیں شام سے سحر تک ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو ہو تمھیں انھیں سُجھاتے
کہ گئی ہے رات کتنی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحرِ اعظم
انھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آرہا ہے واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے ان کی منزل
نہ تو مرحلہ، نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تمھیں ان کے رہنما ہو

اس نظم کی ہیئت میں صرف یہ بات نئی نہیں ہے کہ بے قافیہ نظم ہے۔ بلکہ مولانا نے ایک مروّجہ بحر کے وزن کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے نظم کے لیے یہ ہیئت اختیار کی ہے۔

انھوں نے بحر "رمل مثمن مشکول" کے وزن کے ٹکڑے کر کے دو مصرعے بنائے ہیں۔ ارکان حسبِ ذیل ہیں

فَعِلاتُ فاعِلاتُن فَعِلاتُ فاعِلاتُن

تیسری جدّت یہ ہے کہ ہر بند کے بعد ایک مصرعہ لگایا ہے جو مذکورہ وزن کا ایک ٹکڑا ہے۔

مولانا اسماعیل کی دوسری چونکا دینے والی نظم "چڑیا کے بچّے" ہے۔

چڑیا کے بچّے

دو تین چھوٹے بچّے چڑیا کے گھونسلے میں — چپ چاپ لگ رہے ہیں سینے سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو — اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روز مرّہ کرتی ہے ماں حفاظت — سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو
لیکن چڑا گیا ہے چگّا تلاش کرنے — دانہ کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کر
جب لائے گا تو بچّے مُنہ کھول دیں گے جھٹ سے — ان کو بھرائیں گے وہ ماں اور باپ دونوں
بچوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر — اور چھوٹے بچّے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے
اے چھوٹے چھوٹے بچّو تم اونچے گھونسلے سے — ہرگز نہیں گروگے پر اور پرندے اب تک
نکلے نہیں تمھارے اس واسطے ابھی تم — اونچے نہ اُڑ سکو گے ہاں جب تمھارے بازو
اور پَر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں — سیکھو گے تم بھی اُڑنا کرتے پھرو گے چیں چیں
اُڑتے پھرو گے پُھر پُھر اے چھوٹے بچّو لیکن — کوّا بری بلا ہے اس سے خدا بچائے

اس نظم کے آخری چار اشعار بےحد مربوط ہیں۔ آخری مصرع کا سلسلہ مصرعِ اوّل سے مل جاتا ہے یعنی تسلسل میں کہیں جھول نہیں ہے اور اس لیے وحدتِ تاثر بے مثال ہے۔ نظم بے قافیہ ہے لیکن یہ مولانا کا کمال ہے اور ہیئت کا نیا تجربہ کہ پوری نظم کو "بحرِ مضارع مثمن اخرب" میں کہا گیا ہے۔ اس کا وزن یہ ہے

مَفْعُولُ فاعِلاتُنْ مَفْعُولُ فاعِلاتُنْ

مولانا کا سب سے قابلِ قدر کارنامہ یہ تھا کہ اُنھوں نے اردو زبان و ادب کی ابتدائی منزل میں قدم رکھنے والے نونہالوں کے ذہنوں کو نظم کی جدید ہیئت سے روشناس کرا دیا۔ ہمارا قیاس کہتا ہے کہ آزاد نظم نگار شعرا کے ذہن پر بچپن میں یقیناً مولانا اسماعیل کے کلام کی چھاپ رہی ہوگی وہی نقش بعد میں اُبھرا۔ اس میں رنگ بھرا گیا اور ایک نئی تصویر بن گئی۔

اردو شعرا کا انتخاب کلام (غیر مطبوعہ) ۹۹، ۱۸۹۰ء

مولانا اسماعیل میرٹھی کو تنقیدی شعور ملا تھا وہ اچھے تبصرہ نگار بھی تھے۔ ان کا مذاق شعری پاکیزہ تھا۔ انھوں نے اردو کے تقریباً چالیس شعرا کے کلام کا بہتر انتخاب کیا تھا ان شعرا کے کلام پر تبصرہ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ انتخاب کلام کے شائع ہونے کی نوبت بھی نہ آسکی۔ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی مسودہ ان کی ذاتی لائبریری میرٹھ میں محفوظ ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم نمونہ کلام درج نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف شعرا کا نام پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مرزا سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، غلام ہمدانی مصحفی، انشا، غالب، جرأت، مومن، شیفتہ، ذوق، بہادر شاہ ظفر، آتش، ناسخ، نواب محمد خاں رند، میر ممنون، داغ دہلوی،

ان شعرا کے علاوہ درج ذیل شعرا کے کلام کا نہایت مختصر انتخاب کیا گیا ہے۔

میر محمد دہلوی بیان، جوشش، حاتم، حسرت، حسن، درد، ضیاء، عشق، فقیر، فغاں، زرقت، قدیم، قدرت، منت، ولی، ہدایت، شہید، آبرو، آرزو، مظہر، اور تاباں۔

نئے شعراء کا انتخاب کلام ۱۴، ۱۹۱۲ء مولانا اسماعیل نے نئے شاعروں کی نظموں کا انتخاب بھی کیا تھا مثلاً اقبال (پرندہ کی فریاد) شوق (پھول کی فریاد) سید فاروق (سچے دوست) ابوالحسن ناطق (جلوۂ صبح) عزیز لکھنوی (ماما) یہ کلام مولانا کی ایک بیاض میں درج ہے بعض نظموں پر شاعر کا نام درج نہیں ہے۔

بابِ چہارم

بچّوں کا ادب

شمالی ہندستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج اور بقا و استحکام کے لیے پانچ مرکزوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ کلکتہ ۲۔ دہلی، ۳۔ لاہور، ۴۔ لکھنو ۵۔ علی گڑھ

اسی طرح اردو زبان و ادب کے معماروں میں اور محسنوں میں درج ذیل شخصیتوں کا ذکر تاریخ اردو ادب میں ناگزیر اور ناقابلِ فراموش رہے گا۔ (۱) ڈاکٹر گل کرسٹ (۲) کرنل ہالرائڈ (۳) سرسید احمد خاں

کسی قوم کی بقا و ضمانت اور مستقبل کی امید اس قوم کے نونہال تصور کیے جاتے ہیں اس لحاظ سے "بچوّں کا ادب" بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ "اساسی ادب" نہایت قابلِ توجہ ہے اور اس مقام پر مذکورہ ناموں کی فہرس میں ہمیں حالی، شبلی، نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے ناموں کا اضافہ کرنا چاہیے۔

بچّے کی تربیت اور ذہنی نشو و نما کا پہلا مکتب "آغوشِ مادر" کو قرار دیا ہے۔ جہاں بغیر کتاب کے بچّے کی ذہنی غذا میسّر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ شفیق استاد کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھتا ہے۔ وہاں "آنکھ از کان"

کی صلاحیتوں کے نئے ڈھنگ اور نئے ذرائع سے استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خصوصاً مشاہدے کے ساتھ مطالعہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ مطالعہ کا عمل اور اس کے لوازمات بچّے کی شخصیت کو نکھارنے اور بھرپور بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ہمارے پُرانے طریقۂ تعلیم میں مطالعہ کے ذرائع اور لوازمات پر توجّہ نہیں کی جاتی تھی لیکن جدید دور میں جہاں دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی گئی وہاں اہلِ علم نے بچّوں کے لیے نصابی کتابوں کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور بچّوں کے لیے مفید اور دلچسپ کتابیں مرتب کیں۔ یہ کام مرکز لاہور کے علاوہ میرٹھ میں بھی ہوا۔

اردو کی نصابی کتابوں سے بہت پہلے بچّوں کے لیے انفرادی کوششوں کے ذریعے مختلف مضامین کی کتابیں شائع ہوتی رہی تھیں۔

اردو کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی خدمات نہایت روشن ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۸۴۰ء میں دہلی میں ایک سوسائٹی اس غرض سے قائم ہوئی کہ علم و فن کی کتابیں اردو میں ترجمہ و تالیف کی جائیں۔ سوسائٹی کے ممبر امام بخش صہبائی، مولوی کریم بخش، فیلن صاحب، ماسٹر تاراچند، مولوی سبحان بخش، مولوی احمد علی، سید محمد باقر، مولوی نور محمد، مولوی مملوک علی اور مولوی ذکاءاللہ تھے۔

سب سے پہلے اردو کو علمی زبان بنانے کی ایک باضابطہ اور متّفقہ کوشش سرسیّد احمد خاں نے کی اور ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ "سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کی۔ سرسیّد احمد خاں بڑے دوراندیش مدبّر تھے اور اُنھوں نے اپنے رفقائے کار کی صلاحیتوں کو موقع و محل اور ضرورت کے لحاظ سے استعمال کیا۔ سرسیّد نے بچّوں کے لیے علم ریاضی کی سلسلہ وار کتابیں مرتّب کرنے کی اسکیم بنائی اور اس کام میں مولوی ذکاءاللہ کے علم، تجربے اور ذہانت سے فائدہ اُٹھایا۔

انفرادی کوشش کی جگہ سر سید نے پہلی مرتبہ منظم طور پر کتابیں چھاپنے کی رسم ڈالی اور کتابوں کی سیریز مرتب کر کے چھاپنے کا کام شروع کرایا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سر سید کا ایک نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

سلسلہ کتب ریاضیہ مرکبہ

"سات برس ہوئے کہ ایسا ہی اشتہار سلسلہ علوم ریاضیہ بسیطہ کا ہمارے اسی اخبار نے مشتہر کیا تھا...... ہم کو فخر کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے معزز اور نامی بزرگ منشی محمد ذکاء اللہ صاحب نے اپنی محنت سے اس سلسلے کے ترجمے کو پورا کر دیا.... وہ سلسلہ پورا چھپ گیا اور طالب علموں نے اس سے بے انتہا فائدہ اٹھایا گو اس سلسلہ ریاضیہ علوم بسیطہ کی یہ سترہ کتابیں جان ہیں۔ مگر اس سارے سلسلے کی چھوٹی موٹی مطبوعہ کتابوں کو اگر شمار کیا جائے تو وہ باون کے قریب ہوں گی اور ان کے صفحوں کی تعداد بھی دس گیارہ ہزار سے کم نہ ہو گی۔

اگرچہ علوم مغربی کے ترجمے کا خیال ہمارے ملک کی زبان میں انگریزی عمل داری کے آغاز سے ہوا۔ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے اردو زبان میں کتابیں ترجمہ کیں۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد میں بعض کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ پھر دہلی سوسائٹی نے علوم مغربی کی اشاعت کے لیے اردو زبان میں کتابوں کا ترجمہ کیا۔ پھر ہماری سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد اس کام کے لیے رکھی گئی۔ جس نے چند سال تک نہایت مفید کتابوں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا اور چھاپا۔ سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی و اودھ اور پنجاب میں بھی متعدد کتابیں تالیف ہوئیں۔"

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اسی نمبر میں ۱۱۵۳ صفحے پر مولوی ذکاءاللہ کی جانب سے ایک اشتہار چھپا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے۔

اشتہار کتب ریاضیہ مرکبہ

ارادہ ہے کہ اردو زبان میں ایک سلسلۂ کتب ریاضیہ مرکبہ کا جس کی تفصیل ذیل میں لکھی ہے تالیف و تصنیف کیا جاوے آج کل کے زمانے میں جو کتابیں ان علوم میں انگریزی زبان کی مشہور ہیں ان میں سے مضامین اس طرح اخذ کیے جائیں کہ کوئی سلسلۂ عظمیہ باقی نہ رہ جائے اور سارے مسائل کا بیان بسط و تفصیل کے ساتھ ہو۔ اس سلسلے کے تین حصے ہوں گے۔ حصہ اول مبتدی طلبہ کے لیے۔ حصہ دوم متوسطین طلبہ کے لیے۔ حصہ سوم اعلیٰ طلبہ کے لیے۔ اول حصہ سب سے پہلے چھاپا جاوے گا۔ یہ یقین ہے کہ سو صفحے مہینے میں چھپ جائیں گے جو صاحب کہ قیمت پیشگی بھیجدیں گے ان سے محصول نہیں لیا جائے گا۔ قیمت بحساب ایک روپیہ سو صفحے کی لی جاوے گی اور سو صفحے جس وقت چھپ جائیں گے اس وقت بھیجدیے جائیں گے۔ یہ سلسلہ ولایتی بہت عمدہ کاغذ پر چھاپا جائے گا۔ تفصیل صفحات اور علوم یہ ہے۔

علم سکون، علم حرکت، علم ہندسہ و سکون، علم ادات و آلات	۲۰۰۰
علم سکون و حرکتِ آب	۱۸۰۰
علم مناظر و مرایا	۸۰۰
علم حرارت	۶۰۰
علم آواز	۴۰۰
علم برق	۸۰۰

علم مقناطیس	۴۰۰
علم ممٹرالوجی	۱۲۰۰
علم طلسمات عام فہم	۱۲۰۰
علم ہیئت	۱۵۰۰

راقم محمد ذکاء اللہ (۱)
پروفیسر ورنا کیولر سائینز اینڈ لٹریچر
میور سینٹرل کالج - الہ آباد

سر سیّد کے اس نوٹ سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ ۱۸۷۰ء سے بچوں کے لیے کتب ریاضیہ کی سیریز مرتب ہونے لگی تھیں اور اس کام کا سہرا مولوی ذکاء اللہ کے سر رہا۔

مولوی محمد اسماعیل سے پہلے

غالباً اُنیسویں صدی کی آخری دہائی وہ زمانہ ہے جب بچّوں کے لیے درسی کتابیں مہیا کرنے کا شعوری طور پر احساس جاگ اُٹھا اور سلیقہ کے ساتھ کتابیں مرتب ہو کر بچّوں کے ہاتھوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ چنانچہ پنجاب میں بھی ایک بار آور کوشش کا نشان ملتا ہے۔ یہ کامیابی مولانا محمد حسین آزاد کے ذہن و تعلیم کا نتیجہ تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کو درسی کتابوں کی تالیف میں اوّلیت حاصل ہے۔ لیکن اُن کی تصنیفی زندگی کی یہ خصوصیت بھی قابلِ احترام ہے کہ پہلے اُنھوں نے اسی چراغ کو روشن کر کے ملک میں قبولِ عام حاصل کیا اور بعد میں ادبی تصانیف کی مشعل سے اردو زبان و ادب کی فضا کو منور د

---

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ۔ گزٹ، جلد ۱۲، نمبر ۸۲، صفحات ۱۱۴۹، ۱۱۵۰،
۲۹ دسمبر ۱۸۷۷ء

تابناک بنایا۔ ہمارے اس خیال کی توثیق ڈاکٹر اسلم فرخی کے بیان سے ہو جاتی ہے۔

"آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز درسی کتابوں ہی سے ہوا تھا۔ ادبی تصانیف کے وجود میں آنے سے پہلے ان کی درسی کتابیں قبولِ عام کا خلعت حاصل کر چکی تھیں۔ (۱)

مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸ر جون ۱۸۶۴ء کو عربی قواعد کا ایک مسودہ محکمۂ تعلیم کے سامنے پیش کیا تھا۔ ۲ر جولائی ۱۸۶۴ء کو انھوں نے منطق کی ایک کتاب تالیف کرنے کی اجازت طلب کی اور بالآخر ۱۸۶۷ء میں محکمۂ تعلیمات میں درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر مامور کیے گئے۔ یہ سلسلہ ۲ر اگست ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ اردو کی درسی کتابیں قصصِ ہند اور فارسی کی پہلی دوسری کتابیں اس دَور کی یادگار ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں مولانا آزاد دہلوی گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۷۹ء میں محکمے کے حکم پر انھوں نے قواعدِ فارسی مرتب کی اور ۱۸۸۴ء میں جامع القواعد تالیف کی۔

ایسا نظر آتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے نصابی کتابوں کی سیریز مرتب کرانے کا رجحان اردو ادیبوں میں پیدا کیا۔ پنجاب میں کرنل ہالرائڈ نے اس رجحان کو عام کیا اور وہاں اردو کی درسی کتابوں کو سلسلہ وار شائع کرنے کی مبارک مہم شروع ہوئی۔ اس میں مولانا محمد حسین آزاد کے قلم کی محنت ایک برکت کا درجہ پا گئی۔ انھوں نے اردو کی کتابوں کے دو سلسلے مرتب کیے تھے

(۱) قدیم۔ جو اردو کی پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل تھا

(۲) جدید۔ یہ سلسلہ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر مشتمل ہے۔

---

(۱) اردو کی پہلی کتاب، ص ۶، ڈاکٹر اسلم فرخی، جون ۱۹۶۳ء ناشر ترقی اردو بورڈ، اردو منزل، جمشید روڈ کراچی۔

یہ کتابیں اس عہد کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائڈ کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ یہ تمام کتابیں مولانا محمد حسین آزاد کی مرتب کی ہوئی تھیں۔ "اردو کی پہلی کتاب" میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے داخلی اور خارجی شہادتیں مہیا کرکے ثابت کردیا کہ اردو کی یہ درسی کتابیں مولانا محمد حسین آزاد کی ہیں۔ اس کے علاوہ داخلی شہادت ان کتابوں کے وہ مسوّدات ہیں جو آغا محمد باقر کے پاس پاکستان میں محفوظ ہیں۔

مولانا اسماعیل اور نصابی کتابیں

شمالی ہندستان میں ایک اور اہم مرکز قابلِ توجہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرف مناسب توجہ نہیں کی گئی۔ وہ "میرٹھ" ہے۔ اسی مرکز سے ہندستان کی پہلی تحریک آزادی کا شعلہ لپکا۔ اسی مرکز سے جدید شاعری کے حلقۂ اثر کو پھیلایا گیا اور اسی مرکز سے تعلیمی میدان میں ایک صحت مند انقلاب کی شمع روشن ہوئی۔ ہماری مراد مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی خدماتِ نظم ونثر سے ہے۔

ہمارے بزرگوں کو اعتراف رہا ہے اور نئی نسل اپنے تجربے کی بنا پر معترف ہے کہ اردو میں درسی کتابوں کے دو سلسلے نہایت مقبول ومشہور رہے ہیں پہلا سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد کا اور دوسرا سلسلہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا ہے مولانا آزاد کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور مولانا اسماعیل میرٹھی کو نقشِ ثانی کی بہتری کا فخر ملا ہے۔

دونوں سلسلوں میں بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض چیزوں میں فرق ہے مولوی محمد اسماعیل نے درسی کتابوں کے سلسلے کی حسبِ ذیل کتابیں مرتب کی ہیں۔

(۱) اردو زبان کا قاعدہ　　　(۲) اردو کی پہلی کتاب

(۳) اردو کی دوسری کتاب (۴) اردو کی تیسری کتاب
(۵) اردو کی چوتھی کتاب (۶) اردو کی پانچویں کتاب

اردو زبان کا قاعدہ

نہایت مفید اور مقبول چیز ثابت ہوا۔ ۱۹۵۸ء تک یہ ۱۲۵ دفعہ چھاپا گیا۔ اس کا حلقۂ فیض وسیع تھا۔ سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ اور صوبجات بہار و اڑیسہ کے ڈائریکٹروں کی تجویز کے مطابق اس کی تالیف و اشاعت عمل میں آئی۔ حروف باترتیب کے تحت ۳۹ حرفِ تہجی لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد حروف بے ترتیب کے تحت یوں لکھا گیا ہے۔

ق ل ص ن ی چ ع پ م خ د ذ ش ف ۔ ٹ ض ت ء غ ح
و ژ ھ گ ث ہ ط ا ج ۔ ظ ر ک ڈ ز ب س ڑ ے

اس کے بعد باترتیب حروفِ تہجی پر جداگانہ زبر، زیر، پیش کی علامات ثبت کر کے آوازوں کا فرق سمجھایا گیا ہے۔ پھر بے ترتیب حروف تہجی پر پیش زبر، زیر، کی علامتیں ہر حرف پر جداگانہ طور پر لگائی ہیں۔

(۷) الف کے ساتھ مد (~) کی علامت بڑھائی ہے۔ اس کے علاوہ زیر، زبر، پیش کی مدد سے الف کے ساتھ دوسرا حرف شامل کر کے دو حرفی کلمے بنائے ہیں۔

(۸) "بے" پر زیر، زبر، پیش کی علامات نصب کر کے اس کے ساتھ دوسرے حروف جوڑنے سکھائے ہیں۔ آواز کے علاوہ 'بے' کے ساتھ دوسرے حروف جوڑنے کی تمام شکلیں پیش کی ہیں۔

(۹) "ج چ ح خ" کے ذریعے دو حرفی کلمات بنانے سکھائے ہیں۔ یعنی یہ حروف دوسرے حرفوں کے شروع میں آتے ہیں تو اُن کی شکل پوری قائم

نہیں رہتی بلکہ صرف ابتدائی شوشے کام میں آتے ہیں اور ان کی شکلیں بھی دو طرح بنتی ہیں۔ مثلاً: جب، جد، جج، اور جع وغیرہ

(۱۰) "د ذ ر ز" ان سے دو حرفی کلمے بنائے ہیں اور دوسرے حروف کے شروع میں آنے پر یہ حروف دوسرے حروف میں ضم نہیں ہوتے۔ اپنی جداگانہ شکل باقی رکھتے ہیں۔

(۱۱) "س، ش" کو شروع میں استعمال کر کے دو حرفی کلمات بنائے ہیں۔ جن میں ان حروف کی اصل شکل کام نہیں آتی صرف شوشے مستعمل ہوتے ہیں۔ سج، شش۔

(۱۲) "ص، ض" یہ حروف بھی دوسرے حرفوں کے شروع میں آتے ہیں تو پوری کشش کی ضرورت نہیں صرف شوشوں سے کام نکلتا ہے۔ صبر ضم۔

(۱۳) "ط، ظ" حروف کے شروع میں مکمّل شکل بنتی ہے۔ ان حروف سے دو حرفی کلمے بنائے ہیں۔ طف، ظل۔

(۱۴) "ع غ" یہ حروف دوسرے حروف کے شروع میں ملتے ہیں تو پوری شکل نہیں بنتی۔ شوشوں کا استعمال ہوتا ہے۔ عب، عش۔

(۱۵) "ف ق" یہ حروف بھی دوسرے حرفوں کے شروع میں آتے ہیں تو پوری شکل اختیار نہیں کرتے۔ شوشوں سے کام چل جاتا ہے۔ فر، قط۔

(۱۶) "ک، گ" حرفوں کے شروع میں نصف شکل کام میں آتی ہے کٹ، گڑ۔

(۱۷) "ل" دوسرے حرفوں کے شروع میں نصف شکل کام آتی ہے لب، لق۔

(۱۸) "م" پوری شکل کی جگہ صرف گھنڈی مستعمل ہوتی ہے۔ من، مہ۔

(۱۹) "ن، ی" دوسرے حرفوں کے شروع میں "ن" کی چھوٹی چھوٹی

دو شکلیں بنتی ہیں اس کی اصلی شکل بدل جاتی ہے۔ نٹ، نخ، اسی طرح "ی"
کی بھی بالکل مذکورہ چھوٹی شکلیں کام آتی ہیں۔ اضافہ یہ ہے کہ اس نئے نشان
کے نیچے دو نقطے بڑھانے پڑتے ہیں۔ یک، یخ۔

(۲۰) "ہ" دوسرے حرفوں کے شروع میں اس کی کئی شکلیں بنانی پڑتی ہیں
مثلاً ہ، ہہ، ہر، یعنی ہد، ہٹ، ہر، ہم۔

(۲۱) ھ، ہائے مخلوط، دوسرے حرفوں کے ساتھ مل کر اس کی اپنی آواز
بدل جاتی ہے اور دوسرے حرف کی آواز بھی بدل جاتی ہے۔ دو حرفی کلمے تک
میں اس کے شامل ہونے سے ایک تیسری آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس حرف
کی اصلی شکل عموماً تمام صورتوں میں یعنی شروع درمیان آخر سب میں قائم
رہتی ہے۔ دوسرے حرف کے شروع میں 'ھ' آنے سے اس کی صورت میں
ذرا سا فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک ترچھی لکیر بڑھا دی جاتی
ہے۔ "ٹھا"

(۲۲) "و" (واو ماقبل مفتوح و معروف مجہول) واو مجہول پر الٹا کاما "،"
لگا کر اس کی آواز کی شناخت بتائی ہے۔ رو، لو، سو۔

(۲۳) "ی" اس کی تین صورتیں قائم کی ہیں۔

۱۔ "ے" جس کے پہلے زبر ہو جیسے اسے، لے، ہے، بے وغیرہ
۲۔ "ی" معروف زیر کے ساتھ پوری کشش سے لکھی جاتی ہے۔
مثلاً: جی، کی، دی، بی وغیرہ
۳۔ "ے" مجہول علامت زیر کے ساتھ پوری شکل میں لکھی جائے گی۔
نے، بے، دے، سے، کے وغیرہ

(۲۴) دو حروف کے الفاظ دل، رگ، لگا وغیرہ

اس گروپ میں تمام دو حرفی کلمے ایسے شامل ہیں جن کے حروف الگ
الگ لکھے گئے ہیں۔ صرف "گا" ایسا ہے جس کے حروف مل گئے ہیں

ہمارے خیال میں یہ کلمہ اس مقام پر شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح صفحہ ۱۲ پر نمبر ۳ میں دو حرفی الفاظ کے ذیل میں پاتا، جاگا، لاگا، کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر چند پا اور تا۔ جا اور گا۔ لا اور گا۔ الگ الگ دو حرفی کلمے ہیں۔ لیکن انھیں ایک ہی مقام پر بغیر ڈیش لگائے لکھنے سے چار حرفی کا گمان طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوگا۔ اس لیے یہاں ان کلموں کی گنجایش نہ تھی۔ اس کے بعد نمبر ۴ میں کب جب، نمبر ۵ میں جس، اگن وغیرہ اور نمبر ۶ میں غُل گُل وغیرہ دو حرفی کلمے لکھے گئے ہیں۔ اس صورت میں مذکورہ تینوں کلموں کا شامل ہونا اور بھی حیرت انگیز ہے۔

(۲۵) دو حرفی الفاظ کے جملے

۱۔ یا رَب، دِل دِے، سُن لے وغیرہ

۲۔ سب سے مل، اَب مَت سُو، چُپ مَت رَہ، دَس تک گِن وغیرہ۔

اس میں "ھ" مخلوط والے الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے۔

(۲۶) سہ حرفی الفاظ

آپ، بات، رات وغیرہ۔ آج، رات، تاج وغیرہ

ادب، غرض، طلب، قدم وغیرہ

بھڑک، چھڑک، گھڑا، بڑھا وغیرہ

دھوپ، جھوٹ، بھوک، ڈھول، تھان، بھیس، دھان وغیرہ

(۲۷) سہ حرفی الفاظ کے جملے

آج دیکھ، گھاس کھود، پاس بیٹھ، ٹھیک بول وغیرہ

صاف صاف حرف لکھو، رات بیت گئی، بدن صاف رکھو، علم طلب کرو وغیرہ

(۲۸) دو حرفی و سہ حرفی الفاظ کے جملے

سچ بول، خوش رہ، پاک صاف رہ، شہرت بہت دُور ہے وغیرہ۔ آخر میں دس جملے لکھے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند جملے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اس تال کے آس پاس کمر کمر گھاس ہے۔
۲۔ خدا نے ہم کو مٹی میں سے غلّہ، شکر اور ساگ پات دیا۔
۳۔ جو دل بدی سے خوش ہو اس میں کوئی روگ ہے۔
۴۔ سچ میں نفع ہے، سچ ہی عزّت ہے، سچ ہی زور ہے۔
مال اور وقت اس کام میں خرچ کرو جس میں کسی کا بھلا ہو۔

اردو زبان کی نصابی کتابوں کے دو سلسلے جو ابتدائی مدارس کے لیے مرتّب کیے گئے۔ زمانی اعتبار سے پچیس برس کا فصل رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی درسی کتابیں ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان کے زمانے میں مرتّب کی تھیں۔ اس کے پچیس برس بعد ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۴ء میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے اپنی درسی کتابوں کو مرتّب کیا۔

عجیب اتّفاق ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اردو ریڈروں کی سیریز کو دو برس کی مدّت میں تیار کر لیا تھا۔ ان دونوں نصابی سلسلوں کا مطالعہ کرنے سے چند امور واضح ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مولانا محمد حسین آزاد نے "اردو قاعدہ" تیار نہیں کیا بلکہ "اردو کی پہلی کتاب" کو حاجت روا سمجھا۔ اس کے شروع میں "اعرابوں کے قاعدے درج کر دیے تھے۔ جن سے تلفّظ، املا کی سہولت کے علاوہ طالب علم کو کتاب کی عبارت صحیح طور پر سمجھنے اور پڑھنے میں کافی مدد ملتی تھی۔ لیکن اس کتاب کی ضخامت ۱۰۸ صفحات تھی۔ اس لیے یہ امکان ہے کہ دلچسپی کے باوجود طالب علم اور اُستاد دونوں کو اکتاہٹ ہوتی ہو گی۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب کو جلد ختم کرنے کا شوق دامن گیر رہا ہو۔

برخلاف اس کے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے اس درسی سلسلۂ کتب کی بنیاد "اردو قاعدہ" کو قرار دیا۔ اس کے بعد اردو کی پہلی کتاب، طالب علم کے ہاتھ میں پہنچانے کی ہدایت کی۔ قاعدے میں ۲۰ صفحے اور پہلی کتاب میں ۴۴

صفحے تھے یعنی کل ۲۱۶ صفحات ہیں اور دو منزلوں کے ذریعہ بچّوں کے ذہن تک اتنا مواد پہنچا دیا گیا جو ایک منزل پر ۱۰۸ صفحات میں پھیلا ہوا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل نے اردو زبان کی پہلی کتاب سررشتۂ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ و صوبجات بہار و اُڑیسہ کی تجویز پر مرتّب کی تھی۔ یہ کتاب ماہ ستمبر ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اور حسب ذیل نوٹ درج تھا۔

"ماہ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء سے جن اسماعیل ریڈروں میں یہ مونوگرام نہ ہو وہ جعلی تصوّر کی جائیں۔"

اس نوٹ سے کتاب کی مقبولیت پر روشنی پڑتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء میں جب یہ کتاب نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپی تو اس سے قبل اس کے بیانوے (۹۲) ایڈیشن نکل چکے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی "اردو کی پہلی کتاب" میں اٹھائیس موضوعات پر اسباق تیار کیے تھے۔ اس میں الفاظ کی شناخت کی جگہ جملوں کی ساخت کو اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس صورت میں STRUCTURAL APPROACH کا پورا فائدہ بچوں کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ جملے کی ساخت میں الفاظ کے بدلنے، ان کے معانی کے بدلنے اور مختلف محل پر الفاظ کے مختلف اور صحیح استعمال کی مشق کا موقع نہیں ہے۔ پھر اس کتاب میں بعض موضوعات بچّوں کی زندگی اور ان کے ماحول سے قریبی نسبت نہیں رکھتے۔ اس لیے وہ معلوماتی تو ہو سکتے ہیں مگر دلچسپی قائم نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً نیزہ بازی، پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں۔ سانڈنی سوار، مچھلی والے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں، بنیے کی دُکان، گھوڑے کے نعل بندھ رہے ہیں، آرہ کش لکڑیاں چیر رہے ہیں، جلاہا کپڑا بن رہا ہے وغیرہ۔

اس کے علاوہ پہلی کتاب میں آٹھ نظمیں آخر میں شامل کر دی ہیں۔

اس طرح نظم اور نثر کو دو جداگانہ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بچوں کی دلچسپی "لوری" سے شروع ہوتی ہے۔ پھر کہانی سننے کا شوق۔ نثری عبارت کے مقابلے میں بچوں کو نظمیں زیادہ بھاتی ہیں اور جلد یاد ہو جاتی ہیں۔ اس لیے نظم سے کتاب شروع ہونی چاہیے تاکہ قوتِ حافظہ، پسند اور دلچسپی کا عمل بڑھتا رہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے "اردو کی پہلی کتاب" میں تیئیس (۲۳) اسباق شامل کیے ہیں۔ چودھویں سبق تک کوئی سبق "موضوع" قائم کر کے نہیں لکھا ہے بلکہ یہاں تک کہ آٹھ حرفی الفاظ کی شناخت کرائی ہے بتدریج مختلف افعال میں جملے دیے ہیں۔ پہلے اسماء درج کیے ہیں پھر صفاتی الفاظ پھر ان کے مرکب۔ اس کے بعد جملے بنائے ہیں۔ اسی ترکیب سے مرکب اضافی "کا، کی، کے" استعمال کر کے ذہن نشین کرائے ہیں 'نے' اور 'میں' کے استعمال کی مشق کرائی ہے اور رفتہ رفتہ حروفِ جار کا استعمال سکھایا ہے۔ اس ضمن میں 'دار، وار، مند، کار، خواہ وغیرہ کلموں سے پہلے اسم لگا کر الفاظ بنائے ہیں۔ صفات سے اسما بنانے سکھائے ہیں۔ ان کی مشق و مزاولت کا آسان طریقہ برتا ہے۔

اس کتاب میں نو باب ایسے ہیں جو عنوان کے تحت مرتب ہوئے ہیں جن میں ایک مختصر کہانی شامل ہے۔ ایک سبق "دن" اور ایک "مہینہ" کے تحت لکھا ہے۔ ان میں اردو، ہندی، فارسی دنوں کے نام درج ہیں اس کے بعد نو (۹) جملوں میں ان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہندی اور انگریزی مہینوں کے نام اور چھ جملوں میں ان کا استعمال کر کے دکھایا ہے۔ ایک سبق "نام" ہے۔ جس میں آدمی، شہر، دریا، پہاڑ، ملک یعنی اسمائے معرفہ درج ہیں۔ اس کے بعد اسمائے نکرہ درج ہیں۔ جانور، درخت برتن، پھول، رنگ، کپڑے، کام، پیشہ۔ اس کتاب کے سترھویں سبق

تک ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اردو گرامر کو غیر شعوری طور پر بچّوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ گرامر کی اصطلاح اور اس کی تعریف کو بغیر نام لیے کتاب کا متن اس آسانی سے بنا لیا ہے کہ خوشی کے ساتھ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً:۔

(۱۷) سبق "نام"

۱۔ آدمیوں نے جن چیزوں کو دیکھا، بھالا، یا سمجھا بوجھا ہے اُن سب کا نام رکھ لیا ہے۔ نام لینے سے چیز سمجھ میں آجاتی ہے۔ نام لے کر پکارتے ہیں۔ نام لے کر چیز کو بتاتے ہیں۔ نام سے بڑے کام نکلتے ہیں۔ کیسی دقت ہوتی اگر چیزوں کے نام نہ رکھتے

۲۔ جن چیزوں سے زیادہ کام پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا نام الگ الگ رکھ لیا ہے۔

اس عبارت کے بعد اسمائے معرفہ لکھے ہیں اور اسمائے نکرہ درج کرنے سے پہلے یہ عبارت ملاحظہ کیجیے۔

۳۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک طرح کی کل چیزوں کا ایک نام رکھ لیا ہے۔ اکیلی چیز کا نام کچھ نہیں رکھا۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ عبارت میں پیراگراف پر نمبر ڈالے گئے ہیں۔ ان سب میں معنوی تسلسل ہوتا ہے۔ عبارت کی اپنی خوبیوں کے علاوہ اس میں مختلف علوم و فنون کی مناسب واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ مثلاً (۱۸) سبق "بستی" کی چند سطور ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ آدمی اپنے رہنے کے لیے گھر بناتے ہیں۔ جہاں بہت سے مکان بن جاتے ہیں۔ وہ "بستی" کہلاتی ہے۔

۲۔ چھوٹی بستی کو گاؤں، بڑی کو قصبہ اور بہت بڑی کو شہر بولتے ہیں۔

۳۔ امیروں کے محل بڑے اور پکّے ہوتے ہیں۔ غریبوں کے جھونپڑے

چھوٹے اور کچے ہوتے ہیں۔

(۱۹) سبق "آدمیوں کے کام" کا ایک نمبر ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) حاکم سر پر نہ ہو تو بستی میں امن چین نہ ہو اور جب امن چین نہ ہو تو ہمارے سب کام خراب ہو جائیں۔

یہاں مدنیت اور برکتِ امن کے نکات اس طرح بتلائے ہیں کہ کسی دوسرے قلم سے یہ وضاحت ممکن نہیں۔

مشاہدے اور معلومات کے ساتھ "سمجھ" کو استعمال کرنے اور خیال میں پختگی پیدا کرنے کی غرض سے بھی موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً:

۲۰۔ سبق۔ "وقت"

۱۔ "وقت بھی عجیب چیز ہے۔ بہتے دریا کی مانند چپ چاپ چلا جاتا ہے۔ جو گھڑی جاتی ہے واپس نہیں آتی۔"

"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

۲۔ جو وقت کو کام میں لاتا ہے وہی نفع اٹھاتا ہے۔ جو سستی کرتا ہے وہ مصیبت بھرتا ہے۔

صبح گزری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

۵۔ پل، گھڑی، منٹ، دن، رات، ہفتہ، مہینہ، برس، یہ وقت کے حصّے ہیں۔

۶۔ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر کرو۔

یہ موضوع عام دلچسپی کا نہ تھا مگر نہایت اہم تھا۔ اس میں دلچسپی پیدا کرنے کو مصرع اور شعر کا اضافہ کر دیا اور ان کا استعمال نہایت برمحل ہے۔
مولوی اسماعیل میرٹھی کے یہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ زبان کے معاملے میں

سخت گیر نہ تھے۔ بلکہ لچک کو پسند کرتے تھے۔

۲۱۔ سبق "مشہور شہر اور دریا" میں صفحہ ۲۱ پر ایک جملہ ملتا ہے۔

"متھرا جمنا کے کنارے تیرتگاہ ہے۔"

یہاں تیرتھ کو "تیرت" بجز "گاہ" کلمہ فارسی کا اضافہ کر کے نیا لفظ بنا لیا اور اسے اردو میں منتقل کیا۔

۲۲۔ سبق ایک کہانی سے متعلق ہے۔ اتنی مختصر، دلچسپ، جامع اور اثرانگیز کہانی شاید انگریزی میں ہی مل سکے گی۔ ملاحظہ فرمایئے۔ "کہانی"

۱۔ ایک عورت نے اپنے بچّے کو روٹی کا ٹکڑا کھانے کے واسطے دیا۔

۲۔ کوّا جو دیوار پر بیٹھا تھا "کائیں کائیں" کر رہا تھا۔ جھپ سے اُترا اور ٹکڑا چھین کر اُڑ گیا۔ بچّہ رونے چلّانے لگا۔

۳۔ عورت بچے کا بلبلانا سُن کر یوں کہتی ہوئی دوڑی۔

"کیسا کم بخت لالچی دغاباز جانور ہے۔"

کوّے نے جواب دیا کہ "جو آدمی اپنے بھائیوں کا مال دغا فریب یا چوری سے کھاتے ہیں پہلے ان کو بُرا کہو وہ تو مجھ سے بھی زیادہ بُرے ہیں۔"

اوروں کی بُری بات تو بھاتی نہیں تم کو
پر اپنی برائی نظر آتی نہیں تم کو

اس کہانی کی تاثیر بڑھانے اور اس کا اثر پھیلانے کو یہ شعر انتخاب کی بہتر مثال ہے۔

(۲۳) سبق "بدن کے حصّے اور ان کے کام" اس سبق میں اعضا کا شمار بے کیفی کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ بلکہ اعضا کی خاصیت اور فعل کے اظہار کو ایسے الفاظ کے پیکر تراشے ہیں جو نادرات میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ مثلاً:

۵ ۔ خدا نے ہم کو کیا اچھے دو ہاتھ دیے ہیں ۔ جن سے چیزوں کو چھوتے، ٹٹولتے، پکڑتے، اٹھاتے، پھینکتے اور اچھالتے ہیں ۔ چھونے سے ہم کو چیزوں کی سردی گرمی، سختی، نرمی، کھردرا پن اور صفائی معلوم ہو جاتی ہے ۔ ہم اپنے ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں کپڑا بُنتے اور گھر بناتے ہیں ۔ انگلیوں سے ہم سیتے ہیں اور لکھتے ہیں ۔ ناخن سے کھجلاتے اور گرہ کھولتے ہیں ۔"

یہ کتاب اس سبق کے ساتھ ختم ہوتی ہے ۔ مگر اس کے بعد چند صفحات اور شامل ہیں زراعت کے تحت زمین، کھیت پودا، موسم اور فصلیں ذیلی عنوانات قائم کر کے معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی اسماعیل میرٹھی کا ذہن آگے کی جانب دیکھتا تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان زراعتی ملک ہے اور یہاں کے بچوں کو کاشتکاری اور گانو کی زندگی کا علم ضروری ہے ۔

مولانا محمد حسین آزاد کی دوسری کتاب میں ۸۵ صفحات ہیں ۔ اس کتاب کو انھوں نے چار حصوں میں تقسیم کر کے ترتیب دیا ہے ۔

(۱) جانوروں کا بیان (۲) درختوں کا بیان (۳) وقت اور موسموں کا بیان (۴) نظم ۔

نظمیں تین ہیں اور اخلاقی درس کی حامل ۔ باقی تین حصوں میں چڑیا گھر باغبانی اور جغرافیائی معلومات یکجا مل جاتی ہیں ۔ ان کے قلم کے اعجاز نے ہر چند عبارت کو دلچسپ بنا دیا ہے ۔ مگر ذہنی اعتبار سے بچوں کی تربیت میں خاطر خواہ ترقی کا امکان کم ہی رہتا ہے ۔ اس کتاب کو ٹیکسٹ بک کے اصول پر آج قبول کرنا مشکل ہے ۔ بلکہ بچوں کے لیے "معلوماتی کتابچہ" کہنا مناسب ہوگا

مولوی اسماعیل میرٹھی کی دوسری کتاب میں موضوعات کی وسعت ہے پہلی کتاب کی طرح نثری حصے کے ساتھ مصرع اور شعر چسپاں کرنے کا عمل بھی

جاری ہے اور نظمیں کافی تعداد میں بڑھا دی ہیں۔ جن میں خود مولف کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں سبق کے آخر میں مشق کے طور پر "یاد کرو ہجے اور معنی" کے تحت چند مشکل الفاظ دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا سبق "خدا کی خلقت" ہے۔ اس سبق کا آغاز سوالیہ جملوں سے کیا گیا ہے۔ اس طرح کے چھ پیراگراف ہیں اور ساتویں پیراگراف میں جواب دیا گیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ نیلا آسمان روشن سورج اُجلا چاند اور جگمگاتے تارے کس نے بنائے؟

۷۔ یہ سب چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔ خدا بڑا مہربان اور کل عالم کا نگہبان ہے۔ وہی سب کو پالتا — اور روزی دیتا ہے وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ وہی بناتا اور بگاڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

"نور کا تڑکا" میں صبح کی فضا اور مخلوقِ خدا کے مصروفِ کار ہونے کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس سبق کا مقصود ظاہر کیا ہے۔

۴۔ مکتب کے لڑکے بھی ہوشیار ہو گئے کچھ ناشتہ کر کے بستہ بغل میں دبائیں گے، ٹھیک وقت پر حاضر ہو جائیں گے، جو دیر لگائیں گے وہ پھسڈّی کہلائیں گے۔"

رات گزری نور کا تڑکا ہوا ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

اس کتاب میں مختصر کہانیاں شامل ہیں۔ جن میں اخلاقی درس ہے۔ بعض کہانیوں میں جانوروں کی زبان سے نصیحتیں کی گئی ہیں۔ دلچسپی قائم رکھنے اور ذہن میں دیرپا نقش ثبت کرنے کو چھوٹی چھوٹی نظموں میں کہانیاں کہی گئی ہیں۔ کہانی کا نتیجہ کسی شعر، قطعہ یا چند اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بعض نظمیں انگریزی کہانیوں سے

اخذ کی گئی ہیں۔ بعض کہانیاں فارسی سے لی ہیں۔ حکایتوں کے شامل کرنے سے بچّوں کو تعقّل کی منزل پر مناسب ذہنی غذا ملتی ہے۔ مثلاً ایک حکایت حکیم لقمان سے منسوب ہے جس میں "جو بوؤ گے وہ کاٹو گے" اس کا ماحصل ہے۔ اس کے آخر میں چار شعر درج ہیں پہلا شعر یہ ہے۔

نتیجہ کیوں کر اچھا ہو نہ ہو جب تک عمل اچّھا
نہیں بویا ہے تخم اچھا تو کب پاؤ گے پھل اچھا۔

نظم اور نثری حصّے کی مفید اور دلچسپ خوبیوں کے ساتھ اس میں "رخصت کی عرضی" ایک سبق کا اضافہ ہے۔ اسکول کی زندگی میں بچّے کا "رخصت" سے قریبی تعلّق ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں مولانا نے رنگین دہلوی کی ایک نظم "ایک حریص بلّی" شامل کی ہے اور میاں نظیر اکبر آبادی کی نظم "جب لاد چلے گا بنجارا" بھی۔

اس طرح بچّوں کو اردو ادب کے قدیم شہ پاروں سے واقفیت ہو جاتی ہے اور ان کے نیض سے وہ اتنا ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ "بچّوں کی دُنیا" سے بزرگ شاعروں نے دلچسپی لی ہے۔

اس کتاب میں جذبے کی تزئین، اخلاق کی تربیت، ذہن کی بالیدگی، کردار کی خوشنمائی، ذکاوت و ذہانت کی راہ، فطری مناظر، دیہی اور شہری ماحول، صحت مندی، عام معلومات، آدابِ مجلس، پسندیدگیِ شعر، دل چسپی وغیرہ اتنی بھرپور چیزیں شامل ہیں کہ سخت سے سخت حرف گیر کو اس میں کسی عیب کا پانا مشکل ہے۔

اس کتاب میں مؤلف کی نظم "گائے" بہترین تخلیق ہے جو قومی یکجہتی کے لیے نادر مثال ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی تیسری کتاب کو درج ذیل حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) دودھ پلانے والے جانوروں کا بیان (۲) پرندوں کا بیان (۳) درختوں کا بیان (۴) سورج کا بیان (۵) تاریخی حالات۔

تاریخی حالات میں امیر ناصرالدین، سبکتگین، سلطان محمود غزنوی، ظہیرالدین، بابر بادشاہ، آنا کی جاں نثاری اور پرتاپ کی بہادری شامل ہیں ان تاریخی کرداروں سے بچّوں کے ذہن اور کردار پر یقیناً بہتر اثر ہونا چاہیے۔ لیکن پوری کتاب کی ترتیب میں ان موضوعات کا مواد یکجا ہونا WATER TIGHT COMPARTMENT کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرے بچے کی طبیعت پر ایک موضوع کی یکسانیت جبر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس ترتیب کے ذریعے بچّوں کو جو تاثرات ملتے ہیں ان کا مجموعی اثر ذہن پر نہیں پڑتا بلکہ جزو جزو ہو کر حافظے میں بادلوں کی مانند لہراتے ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے اپنی تیسری کتاب میں ''انسان اور جدید علوم'' کو اہمیت دی ہے۔ اس لیے اس کا مواد زیادہ تر انسانی اقدار اور سائنسی نقطۂ نظر کا مظہر ہے۔ پٹواری گری کی نوکری کے لیے کلکٹر کے یہاں ایک عرضی کا مضمون درج ہے۔ اس منزل پر کام کی تلقین کے ساتھ آرام کی ہدایت بھی ملتی ہے۔

کتاب کا آغاز مؤلف کی نظم ''خدا کی تعریف'' سے ہوتا ہے۔ کہانی، مضمون نظم، حکایت سب کا مواد پُر تاثیر ہے۔ نثری حصے میں اشعار شامل کر کے دلچسپی بڑھا دی ہے اور خیال کو ذہن نشین کرنے میں مدد لی ہے۔

نثری حصے میں ایک اضافہ یہ ہے کہ رباعی شامل کر کے بچّوں کو ایک نئے نام سے آشنا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کو نثر کے بعد ہی شامل نہیں کیا ہے۔ بلکہ بیچ بیچ میں موقع و محل کے لحاظ سے شعر شامل ہیں۔ اس کی بہترین مثال ''معافی اور انتقام'' میں ملتی ہے درمیان میں دو شعر درج ہیں۔

نادموں کی خطا معاف کرو ہے معافی میں لذّت اور سرور
اپنے دل میں ذرا کرو انصاف کون ہے جو ہے بے خطا و قصور

اس کے بعد پھر نثری عبارت ہے اور سبق کے آخر میں درج ذیل اشعار شامل ہیں۔

ہے بیمار تو لیک بچنے کے قابل جو اپنی خطا کو خطا جانتا ہے
مگر ایسے نادان کا کیا ٹھکانا کہ جو درد ہی کو دوا جانتا ہے
بُرا مانتا ہے جو سمجھائے کوئی برائی کو اپنی بھلا جانتا ہے
وہ انجام کو روئے گا سر پکڑ کر نہیں اس میں دھوکا خدا جانتا ہے

اس میں ایک خط تحریر کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے بچّوں کو خط لکھنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ تاریخی حال میں راجہ بکرماجیت کا قصہ بیان کیا ہے

پانی کی شکلیں، دھات، ہوا، پانی، غذا، لباس، موسم، زمین مکان، غسل وغیرہ پر مختصر مضمون لکھے ہیں۔

نظمیں بہت اچھی ہیں۔ خصوصاً "دال کی فریاد" ندرت لیے ہوئے ہے۔ آخر میں زراعت کے تحت زمین، ہل، بیل، بیج، جوتائی، بوائی، سینچائی، نرائی، کٹائی، مڑائی، اوسائی، سراون، میائی، کھاد وغیرہ کا تفصیلی مگر آسان طور پر ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی "اردو کی چوتھی کتاب" کو بھی جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ چند حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۱) جانوروں کا بیان (۲) پرندوں کا بیان (۳) کیڑوں کا بیان (۴) درختوں کا بیان۔ ان ابواب سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں بھی انسان کو مرکز توجہ نہیں بنایا گیا ہے۔ جانوروں، پرندوں، کیڑوں اور درختوں سے بچّوں کو ایک حد تک دلچسپی ہو سکتی ہے۔ معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر اس کتاب کو آج کی اصطلاح میں ٹیکسٹ بک کہنے میں تامّل

ہوگا۔ اس کو بچوں کے لیے ''انسائیکلوپیڈیا'' کہا جا سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے ''اردو کی چوتھی کتاب'' کا آغاز اپنی نظم ''خدا کی قدرت'' سے کیا ہے۔ اس کے بعد ''خود رائی کا نتیجہ'' میں دو کبوتروں کا قصّہ درج کیا ہے۔ نثری عبارت کے بعد یہ شعر ملتا ہے۔

سیر کر دُنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں ؎ زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

اس کے بعد نثر کا ٹکڑا ہے اور یہ شعر لکھا ہے۔

گلستاں جہاں ہیں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گُل کے جویا ہیں اُنھیں کیا خار کا کھٹکا

اس کے بعد سفر کا انجام نثری عبارت میں درج ہے اور یہ شعر لکھا ہے۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

اس کتاب میں تاریخی قصص کا اضافہ ہے۔ اس لیے کہ اس عمر کے بچّے تاریخی کرداروں کو پسند اور ناپسند کرنے کا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت بننے اور نکھرنے میں یہ کردار اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ محمود غزنوی اور بڑھیا''، محمود غزنوی اور کنور رائے والیٔ قنوج، سلطان ناصر الدّین، سلطان جلال الدّین خلجی، سلطان فیروز، نور جہاں بیگم، شیر شاہ سوری، اہلیا بائی، سیتاجی غیاث الدّین و شہاب الدین، پرتھوی راج اور شہاب الدّین غوری، جلال الدّین محمد اکبر، بیرم خاں، ابوالفضل فیضی راجہ ٹوڈر مل، راجہ بیربل کے حالات درج کیے ہیں۔ ہندستانی خواتین کے حالات شامل کر کے مولانا نے صنفِ نازک کے دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس کتاب میں مثبت اخلاقی قدروں کے ساتھ فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً گرمی کا موسم صبح کی آمد، آسمان اور تارے، تاروں بھری رات، جنگل اور چاندنی رات وغیرہ نظمیں دلچسپ ہیں اور بچّوں کو حسنِ فطرت کی طرف مائل کرنے کا

موثر ذریعہ ہیں

اس کتاب میں دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی کہانی کے روپ میں آسان او دل چسپ مضمون کے ذریعہ بچوں کو روشناس کیا گیا ہے۔ مثلاً، "محنت سونے سے بہتر ہے" یہ سبق چھ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسپین کے ایک باشندے اور جنوبی امریکہ کا قصہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح نئی دنیا کا پانا' آٹھ صفحوں کا ایک مضمون ہے۔ اس کا آخری جملہ ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ پہلی ملاقات تھی جو نئی اور پرانی دنیا کے باشندوں میں ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو ہوئی۔"

بیرونی ملکوں کی ترقی اور وہاں کے تمدن کی برتری کا بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ یوروپ کی سائنسی ایجادات سے مولّف کو دل چسپی ہے۔ اپنی دل چسپی میں بچوں کو شامل کیا ہے۔ مثلاً" ریلوے انجن کا موجد، جارج ہندوستانی بچوں کے لیے خوشی، دل چسپی اور کسی قدر حیرت کا موجب ہے۔

اس کتاب میں "آرائش محفل" اور "مثنوی سحر البیان سے منظوم ٹکڑے لے کر درس کو عام پسند اور بلند بنایا ہے۔

بیلون یا غبارہ، کوئلے کی کان، دمدار ستارے، چھاپہ خانہ، قوت کہر بائی، بخاری یا دخانی کشتی ایسے اسباق ہیں جن کا تعلق جدید سائنسی علوم سے ہے جدید سائنسی اصطلاحات کی تفہیم کے لیے مولانا نے آسان الفاظ بھی اصطلا ح کے ساتھ لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً قوّت کہربائی، اس منزل کے بچّوں کے لیے سمجھنا مشکل تھا مولانا نے اس کو آسانی کی خاطر اس طرح ادا کر دیا

"قوتِ کہربائی یا برق یا بجلی۔"

نظموں میں وطنیت کا عنصر غالب ہے بیشتر فضا ہندستانی ہے۔ مثلاً آم کی تعریف، ہندوستان کے پھول، بنائے قلعہ آگرہ، کوہ ہمالہ وغیرہ۔

مولّف کی نظمیں کافی تعداد میں شامل ہیں۔ "بارش کا پہلا قطرہ" اور "اچھا زمانہ آتا ہے۔" اپنے موضوع، طرز ادائیگی اور تاثیر کے لحاظ سے خصوصی

توجہ کی طلب گار ہیں۔

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ زبان سکھانے کے ساتھ شعری ادب کو بھی داخل کر دیا ہے۔ ذوق دہلوی کی غزل:

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا ؛ جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

رند کی غزل:

ہیں یہ، سارے جیتے جی کے واسطے۔ کون مرتا ہے کسی کے واسطے

مرزا غالب کا قطعہ:

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں۔ ذوقِ آرایش سر و دستار

شامل اشاعت ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو ختم کرنے والے طلبہ اردو زبان و ادب کی اچھی روایتوں سے واقف ہوں گے۔

نثری حصے بلند، دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ سرکشی کا ثمرہ، زیادہ جاذب توجہ نظر آتا ہے۔ بدن کے اعضا کا معدے سے جھگڑا ہو جاتا ہے سب کام معطل ہونے اور غذا نہ پہنچنے پر سب کو اپنی بھول پر افسوس ہوتا ہے۔ یگانگی و اتحاد اور تعاون کار کی اسپرٹ پیدا کرنے کو یہ سبق نہایت مناسب ہے۔ آخر میں زراعت کے تحت اقسام زمین، ہل کے پرزے، کھاد، بیج، سنچائی اور دیگر امور پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے نصابی سلسلے کو چوتھی کتاب پر ختم کر دیا تھا۔ لیکن مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے اس پر ایک کتاب کا اضافہ کیا اور اردو کی پانچویں کتاب تک اپنے درسی سلسلۂ کتب کو پہنچا دیا۔

پانچویں کتاب کا آغاز "خدا رزّاق ہے" سے ہوتا ہے۔ اس نظم پر مولوی صاحب کے بڑے بھائی مولوی عبدالحکیم کا نام چھپا ہے حالانکہ نظم مولوی اسماعیل میرٹھی کی ہے۔ اور ان کے کلیات میں بھی درج ہے۔

اس کتاب میں نظم کا حصہ غالب ہے۔ مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار نسیم میر تقی میر، خواجہ حالی وغیرہ کے شہ پارے داخل نصاب ہیں۔ اردو ادب کی

مقبول صنف یعنی غزل بھی شامل ہے۔ مثلاً آتش لکھنوی کی غزل:

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اور انشاء دہلوی کی غزل:

مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر   کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

درج ہے۔

حکیم الیسپ کا بیان بچوں کے لیے مفید اور نتیجہ خیز ہے۔ "صرف دولت" ایک نہایت عمدہ علمی مختصر مضمون ہے جس میں سیر چشمی، مروّت، سخاوت، عوض کفایت شعاری، بخل، اسراف کے معنی مثالوں کے ذریعے سے سمجھائے ہیں۔ یہ معنی لغت میں نہیں مل سکتے۔

ایک اور مضمون "سچائی" قابل قدر ہے۔ جس میں روکھی پھیکی تعریف نہیں ہے بلکہ بات کی سچائی، نیت کی سچائی ارادہ کی سچائی عہد کی سچائی، عمل کی سچائی اور مصلحت کے موقع پر رمز و کنایہ سے بات کہنا یا جواب نہ دینا سچائی ہے۔

اس کتاب میں مشکل الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے ممکن ہے مولانا کے زمانے میں اس منزل کے بچوں کی ذہنی سطح اتنی بلند رہی ہو کہ وہ تضیع اوقات، انصرام، قطع و برید، کریہہ المنظر، کوزہ پشت، بقائے شریف اور منغص وغیرہ الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرنے اور ان کے مفہوم کو سمجھنے پر قدرت رکھتے ہوں لیکن ہمارے دور میں یہ الفاظ مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا نے سر جان لارنس، ارسطو، شارپ کے حالات لکھ کر بچوں کو عام بہبود کے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ حکومت، آزادی اور غلامی کے تصورات سے واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ اس سلسلے میں غلامی کا انسداد اہم مضمون ہے۔ اس میں ۱۸۳۴ء میں شارپ کی جدوجہد سے انگلستان میں غلامی کی رسم ختم ہونے کا بیان ہے۔

ٹھوس علمی مضامین بھی شامل ہیں۔ مثلاً مبادلہ، تحقیق، حکومت، ستارے

اور کہکشاں، ہوا اور آسمان، حواس خمسہ، اس کتاب میں توہم پرستی کا اثر بچوں کے ذہن سے دور کرنے کو دو نہایت دلچسپ اور انوکھے مضمون لکھے ہیں۔

(۱) بکری کا بھوت (۲) باجے کا بھوت

"علم زندگی ہے"، مولوی عبدالحلیم شرر کے قلم کا نتیجہ ہے۔ مولف نے نصابی سلسلۂ کتب کی ترتیب و تدوین میں اچھے نظم گو اور نثر نگاروں کو شریک کر لیا تھا۔

آخر میں زراعت کے تحت اقسام زراعت، ہل کی قسمیں، زراعت کے مویشی، ہل کے بیل اور ان کی نسلیں، کھاد کی قسمیں، بیج بوائی، زراعت اور اس کی ضرورتیں پر بھی چند صفحات شامل ہیں۔

ہماری کہانیاں

دنیا میں کہانیوں کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ مصر و بابل کے افسانے ایسپ کی کہانیاں، (حکایات لقمان) کافی مشہور ہیں اپنیشد میں ایک تمثیل ملتی ہے کہ کتوں نے جمع ہو کر ایک سردار کو چنا اور کھانا مانگنے کے لیے مل کر شور کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ مہا بھارت میں بہت سی کہانیاں درج ہیں۔ اس کے بعد جاتک کہانیاں ملتی ہیں یہ وہ پالی کہانیاں ہیں جو گوتم بدھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ حیوانی کہانیوں کے لیے جاتک کے بعد سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنتر ملتی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جتنے زیادہ ترجمے اس کتاب کے ہوئے اتنے غالباً کسی کتاب کے نہیں ہوئے یہی انوار سہیلی کی اصل ہے۔ حکایات ایسپ، مہا بھارت، جاتک اور پنچ تنتر میں بہت سی کہانیاں مشترک ہیں۔

عربی اور فارسی قصوں کا اردو سے براہ راست تعلق ہے۔ تمام مشہور قصوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی قصے اردو سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ فسانۂ عجائب، سروشِ سخن، اور طلسم حیرت تین قصے طبع زاد آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے تمام مشہور افسانے ترجمہ ہیں۔ مولانا

اسماعیل میرٹھی کے ریڈروں کی بعض کہانیاں بھی فارسی قصّوں سے ماخوذ ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کی ماخوذ کہانیاں

مولانا کو افسانہ نگاری یا ناول نویسی سے دلچسپی نہیں رہی۔ انھوں نے ادب کی ان اصناف کی جانب توجہ نہیں کی حالانکہ ان کے ہم عصر عبدالحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے لیے ناول کے فن کو مخصوص کر لیا مولانا اسماعیل نے بچوں کے لیے کہانیاں مرتب کی ہیں لیکن یہ کہانیاں محض طبع زاد نہیں ہیں بلکہ دوسرے ذرائع سے اخذ کی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانیوں کے سلسلے میں مولانا نے بستانِ حکمت، انوارِ سہیلی سے استفادہ کیا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔

۱۔ اردو کی دوسری کتاب میں مولانا نے ایک کہانی "ایک شیر اور چیتا" شامل کی ہے۔ اس میں ایک لومڑی کا کردار بھی ہے۔ یہی کہانی بستانِ حکمت میں روباہ اور دو نخچیروں کی لڑائی کے تحت ملتی ہے۔

۲۔ اردو کی دوسری کتاب میں "باز اور مرغ" کی کہانی درج ہے۔ بستانِ حکمت میں صفحہ ۳۷ پر یہی کہانی باز و مرغ خانگی کی کہانی کے زیرِ عنوان بیان کی ہے

۳۔ اردو کی دوسری کتاب میں "مرغابی اور کچھوا" ایک کہانی درج ہے لیکن یہی کہانی بستانِ حکمت میں صفحہ ۷۹ پر حکایتِ سنگ پشت کے نام سے ملتی ہے اس کہانی میں دو بطخوں کا ذکر ہے۔ انوارِ سہیلی میں صفحہ ۷۸ پر یہ حکایت دو مرغابیوں اور کچھوے کے ساتھ درج ہے۔

۴۔ اردو کی چوتھی کتاب میں "خودرائی کا نتیجہ" ایک کہانی ہے۔ جس میں نوازندہ اور بازندہ دو کبوتروں کا کردار پیش کیا ہے۔ یہی کہانی بستانِ حکمت میں صفحہ ۲۲ تا ۲۶ نوازندہ اور بازندہ دونوں کبوتروں کے نام سے لکھی ہوئی ہے۔

کہانیوں پر عمومی نظر مولانا اسماعیل نے کہانیاں بچوں کے لیے لکھی ہیں اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اس دور میں کہانیوں کی تکنک آج سے مختلف تھی ان کہانیوں میں مقصد پہلے سے متعین ہوتا تھا مولانا کی کہانیوں کے موضوع دو دائروں میں محدود ہیں۔

۱- ہیرو ورشپ ۲- مجرد اوصاف

ہیرو ورشپ میں بیشتر ایشیا کے نامور مسلمان حکمرانوں کے نام نظر آتے ہیں ہندستان کے بعض ہندو ہیرو بھی کہانی کا مرکز ہیں۔ ایسی کہانیاں واقعات کے سہارے بڑھتی ہیں کوئی مخصوص پلاٹ نہیں ہے۔ کردار واقعات سے نہیں ابھرتے بلکہ پہلے سے متعین ہیں۔ کردار کہانی مربوط ہونے میں کوئی خاص مدد نہیں دیتے۔ صرف ہیرو پوری کہانی پر چھایا رہتا ہے۔ کردار متحرک نہیں ہیں مکالمہ کے ذریعے یا کہانی کار کی زبان سے بولتے ہیں۔ ہر کہانی میں نیکی کی فتح یقینی ہے۔

دوسرے قسم کی کہانیاں مقصدی تو ہیں مگر ان کا تانا بانا معاشرے نفسیات اور براہ راست زندگی کے نشیب و فراز کی مدد سے نہیں تیار ہوتا۔ ان کہانیوں میں تمام کردار جانوروں کے ہیں۔ یہ "پنچ تنتر" کی روایت ہے لیکن مولانا محمد اسماعیل نے اپنی کہانیوں کو "انوار سہیلی" سے اخذ کیا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

بعض کہانیاں طبع زاد بھی ہیں۔ مگر ان پر بھی "انوار سہیلی" کی چھاپ ملتی ہے۔ اس لیے کہ ان میں مولانا اسماعیل نے اپنے ماحول، معاشرے اور زندگی کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اخلاقی تعلیم کے لیے اور لوگوں میں مجرد اوصاف پیدا کرنے کو کہانیاں لکھی ہیں۔ مثلاً اتحاد، حفاظت، دوراندیشی بہادری سچائی وغیرہ۔ ان کہانیوں کے کردار بھی جانور ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا نے ہندستان کے جانوروں کو شامل کر لیا ہے۔ یا ان جانوروں کو بچوں کے لیے دلچسپ بنانے کو نئے نام دے دیے ہیں۔ مثلاً گوا "کالے خاں"، چوہا

موسیٰ خاں)، بلّی (خالہ جان)، ہرن (ہرچرن داس) وغیرہ۔
ٹکنک کے اعتبار سے کہانیاں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں مگر ان میں دلچسپی ہے۔ اندازِ بیان، مقتضائے حال کے مطابق ہے۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔

ان کہانیوں میں بیک وقت کئی کرداری وصف پیش کیے گئے ہیں: شکاری عموماً دھوکا کھاتا ہے۔ زیادہ تر اجتماعی عقل کی جیت ہوتی ہے۔ کہانیوں میں ایک بڑی خوبی یہ ملے گی کہ (suspence) کا عنصر کہانی میں آخر تک جاری رہتا ہے۔

مولانا اسماعیل نے اپنی زندگی درس و تدریس میں گزاری تھی۔ ان کا رشتہ ملک و قوم کے تمام طبقات کے نونہالوں سے تھا اس لیے توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنی کہانیوں میں اس دور کی سماجی اقتصادی اور تعلیمی خصوصاً متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی پیش کرتے یا ان میں صنعت و حرفت اور آزادی کی برکتوں کا ذکر ہوتا۔ چوں کہ مولانا نے یہ کہانیاں رغبت یا فن سے لگاؤ کی بنا پر نہیں بلکہ کورس کی ضرورت پوا کرنے کو لکھی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی کا اعتراف کرنا چاہیے۔

مضامین

موضوع کے اعتبار سے مولانا کے ریڈروں میں مضامین کی کئی قسمیں ہیں اخلاقی معلوماتی، تاریخی، زراعتی، طبعی، حفظانِ صحت وغیرہ لیکن پہلی اور دوسری کتاب میں تاریخی مضمون شامل نہیں ہیں۔ تیسری کتاب میں تاریخی مضامین کا نصاب میں اضافہ کیا ہے۔ زیادہ تر ایسے کردار اور تاریخی واقعات لیے ہیں جو بچوں کی سیرت بنانے میں موثر اور مفید ثابت ہوں۔ انسان کی اخلاقی قدروں کے کسی ایک پہلو کو روشن کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ذہن پر انصاف، فرض شناسی ایفائے وعدہ، محنت کی روزی، حسنِ سلوک، رفاہ عام، ذہانت، شجاعت

مساوات، وفاداری، قومی یکجہتی، علم وفضل کی عظمت، روشن خیالی وغیرہ اوصاف کا نقش مُرتسم ہو سکے۔ تاریخ سے اخذ کیے ہوئے مضامین میں راجہ بکرماجیت، محمود غزنوی اور ادور بڑھیا، محمود غزنوی اور کنور رائے والیِ قنوج، سلطان ناصرالدین، سلطان علاءالدین خلجی، سلطان فیروز نورجہان بیگم، شیر شاہ سوری، اہلیہ بائی، سنیتاجی، جلال الدین اکبر بیرم خان، ابوالفضل، فیضی، ٹوڈرمل، بیربل، اور مہابھارت شامل ہیں۔

ہندستان کی عظیم تاریخی شخصیتوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کی اہم شخصیتوں اور بین الاقوامی شہرت کی مالک ممتاز شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے حکیم الیسپ کا بیان اور ارسطو اور نوشیرواں وغیرہ۔

ان مضامین کے مطالعے سے بچوں کے ذہن میں وطنیت کا محدود تصور قائم نہیں ہوتا۔ ان کے اندر شخصیت پرستی کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جس کی حدیں عصبیت سے مل جاتی ہیں رنگ نسل اور ذات کا امتیاز پیدا نہیں ہوتا۔ طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بُرے بھلے کی پہچان سچائی اور خلوص کے ساتھ کر سکیں۔ وہ پوری انسانیت کو ایک اکائی تصور کرنے لگتے ہیں۔

بچوّں کی نظمیں

مولانا اسماعیل میرٹھی کی بعض نظموں کا بیان ہم نے گذشتہ ابواب میں کیا ہے چوں کہ موضوعات کی نوعیت اس امر کی متقاضی تھی۔ اب ان نظموں کا تذکرہ کرنا ہے جو قطعی بچوں کے ذہن کو پیشِ نظر رکھ کر کہی گئی ہیں۔ ان میں چار طرح کی نظمیں شامل ہیں۔

(۱) فطری (۲) مشاہداتی (۳) صفاتی (۴) تمثیلاتی

فطری نظموں میں "ہوا چلی" اور "ساون کی جھڑی"، قابل ذکر ہیں پہلے ہوا چلی

کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی چلی ہوا — کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں — پودے بھی جھولتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی — سویا ہوا تھا سبزہ اسے تو جگا چلی
سرسبز ہوں درخت نہ باغوں میں تجھ بغیر — تیرے ہی دم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر
پڑ جائے اس جہاں میں ہوا کی اگر کمی — چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی
چڑیوں کو یہ اڑان کی طاقت کہاں رہے — پھر کائیں کائیں ہو نہ غٹرغوں نہ چہچہے

مفہوم کے لحاظ سے یہ نظم بچوں کے لیے افادی حیثیت رکھتی ہے پانچویں اور چھٹے شعر میں سائنسی انداز بیان ہے۔ لیکن مولانا نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جو پیرایہ اختیار کیا ہے اور جن الفاظ سے کام لیا ہے وہ ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے۔

عموماً۔ اس نظم کی فرہنگ آسان اور عوام کی بول چال سے قریب ہے خصوصاً شروع کے دو شعروں کی فضا نہایت سہانی ہے۔

ساون کی جھڑی

گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ — بجایا رعد نے نقّارخانہ
گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے — برس آخر تو ساون کی جھڑی ہے
بھنبیری اُڑ کہ ساون آگیا اب — گھٹا اُمڈی ہے بادل چھا گیا اب
کہو کویل سے امرودوں میں بولے — پُھدک ٹہنی پہ تو بھی او ممولے
کٹورا سا ہوا تالاب لبریز — کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز

زباں اپنی کھگولے او ٹٹیری
بجا دے تو بھی او جھینگر نفیری

یہ نہایت مختصر نظم ہے لیکن نہایت جامع اور خوبصورت ہے۔ اس میں تشبیہوں اور استعاروں کا حسن داد طلب ہے۔ نظم کی خوبی یہ ہے کہ تمام تشبیہات

واستعارات کو موسم برشگال سے لیا گیا ہے۔ اس میں مقامی رنگ پوری رعنائی کے ساتھ بہار افزا ہے۔ مقامی رنگ میں عمومیت نہیں ہے وہ بالکل ہندستان کی فضا کا آئینہ دار ہے اور خصوصاً برسات کے موسم کا ترجمان۔

مولانا نے حسین الفاظ کے پیکر تراشے ہیں بعض تصویریں بے حد جاندار ہیں مثلاً "گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے یا کٹورا سا ہوا تالات لبریز حسنِ بلاغت کے لیے" اپنی لے کرے تیز" قابلِ ملاحظہ ہے۔ یا زبان اپنی بھگوئے" ان اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے بچے ہی نہیں بلکہ عام قاری کے ذہن پر بھی ہندستانی برسات کی فضا چھا جانا یقینی ہے۔ یہاں شاعر کا مشاہدہ اور جذبہ الفاظ میں گھل مل کر قاری کے سامنے آتا ہے۔

مشاہداتی نظمیں

اپنے ماحول سے مانوسیت اور واقفیت ایک باشعور شاعر کے ذہن کی بیداری اور اس کے نیک دل ہونے کی پہچان ہے، کتے اور بلّی، ہندستانی گھروں کی زندگی کا ایک ضروری جزو بن گئے ہیں۔ ان کے پالنے کا رواج دراصل بچوں کی دلچسپی اور مصروفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ ہمارے گھروں کی زینت کا سامان بن گئے ہیں۔ اس لیے شیر خوار بچوں کے لیے گڑیوں کے ساتھ کتے بلی کے کھلونے خریدے جاتے ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں مقامی رنگ اور گھریلو زندگی کی تصویریں جتنی مانوسیت، معصومیت اور خلوص کے ساتھ ملتی ہیں ان کی نظیر معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ ان کے موضوعات سے یگانگی کی جو خوشبو نکلتی ہے وہ شاعر کے دل کی مہک کا نتیجہ ہے مثلاً "ہمارا کتا ٹیپو" اسلم کی بلّی ان نظموں میں، ہمارا "پورے گھرانے کے پیار کا راز داں ہے اور اسلم ان کے خاندان کے چہیتے بچے کی ترجمانی ہے

مولانا اسماعیل مذہبی آدمی تھے۔ اسلام میں بعض علما نے، کتے کو نجس عین

بتایا ہے مگر اس نظم کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اسماعیل سچے موحّد تھے۔ وہ علما کی انتہا پسندی کے حامی نہ تھے اس نظم میں کتّے کی وفاداری، حق شناسی، ضبط و تحمل، گھر کے دوسرے جانوروں سے اپناپن، اور رات کو گھر کی چوکسی کرنا، یہ تمام اوصاف ایسے ہیں جو انسان کے دل میں جانوروں سے محبت و رفاقت پیدا کرتے ہیں۔ سچے انسانی جذبات کو نکھارتے ہیں اس سے گھریلو زندگی کے عام معمولات کا بھی تھوڑا بہت علم ہو جاتا ہے۔ اس نظم کے عنوان سے ایک بات کھٹکتی ہے ٹیپو سلطان ہمارا قومی کردار ہے۔ انگریز نفرت کی بنا پر اپنے کتّوں کے نام ٹیپو رکھتے تھے ہندوستانیوں نے ناسمجھی میں، دیکھا دیکھی ایسا کیا اور مولانا اسماعیل بھی بغیر سوچے سمجھے اس کا شکار ہو گئے لیکن اس غیر شعوری عمل سے مولانا کی نظم کی خوبیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

"اسلم کی بلّی"۔ کتّے سے تو گھریلو زندگی کے بعض مفاد بھی وابستہ کیے جا سکتے ہیں لیکن بلّی سے چوہوں کو بھگا دینے کے علاوہ اور کوئی فیض نہیں ہے بلّی کا پالنا محض شوق، دلچسپی اور گھر کی رونق سے متعلق ہے۔ مولانا اسماعیل نے چھوٹے صاحبزادے کی بلّی پر یہ نظم کہی ہے۔ انسان کو اپنی اولاد کے ساتھ کتنا پیار ہوتا ہے۔ اولاد کی ہر چیز شفقتِ پدری کے جذبہ کے تحت عزیز بن جاتی ہے۔ اس نظم میں اسی جذبۂ محبت کی عکاسی ہے۔

چھوٹی سی بلی کو میں کرتا ہوں پیار — صاف ہے ستھری ہے بڑی ہے کھلاڑ
گود میں لیتا ہوں تو کیا گرم ہے — گالے کی مانند رُواں نرم ہے
میں جو نہ چھیڑوں تو نہ جھلّائے وہ — میں نہ ستاؤں تو نہ غرّائے وہ
کھینچ کے دُم اب نہ ستاؤں گا میں — گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں
اب نہ ڈرے گی وہ میری مار سے — کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے
صحن میں گھر میں کبھی میدان میں — کھیلیں گے در میں کبھی دالان میں

دم کو ہلا میرے پڑے گی وہ پاؤں | بولے گی پھر پیار سے وہ میاؤں میاؤں
دوں گا اسے گیند جب میں آن کر | جھپٹے گی وہ اسکو چوہا جان کر
تاک لگائے گی دبوچے گی خوب | مارے نہیں اسے نوچے گی خوب

ہم نے بڑے پیار سے پالا اسے
کہتے ہیں سب چوہوں کی خالا اسے

اس نظم میں محاکاتی عنصر کو بڑی خوبی سے ابھارا گیا ہے۔ مشاہدے کی باریک بینی اور صداقت اظہار نے نظم کو قدر کی چیز بنا دیا ہے۔ خصوصاً دوسرا شعر شاعر کے سچے جذبے اور عام انسانی مشاہدے کی بے نظیر تفسیر ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ بلی اور وہ بھی بچے کی بلی کا بیان ذہنِ قاری کو گھر کی اس فضا میں پہنچا دیتا ہے جہاں ایک فرد فرصت کے لمحات میں بچوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ اور ان کی بلی کو پیار دیکر بچوں کی خوشیوں میں شریک ہوتا ہے۔

گھر کے ماحول سے ذرا ہٹ کر مولانا اسماعیل کے دور کی گھریلو زندگی سے گہرا ربط رکھنے والی چیز، پن چکی تھی ہے۔ پتھر کی چکی کے مقابلہ میں یہ جدید قسم کی ایجاد تھی اس لیے اس میں جاذبیت اور ندرت تھی۔ پتھر کی چکی قدیم ادب میں گوشہ گیر متوکل کی نشانی بن چکی تھی۔

مولانا اسماعیل میرٹھی نے پن چکی، کو اردو ادب میں ایک مقام دیا جس میں تنہا نشینی کی بجائے عوام کی بھیڑ میں رہنے کا مادّہ تھا۔ منظرِ عام پر حرکت و عمل کا نمونہ تھا۔ مخلوق کی خدمت کے ساتھ بچوں اور بڑوں میں فرض کی دھن اور زندگی کو فعّال بنانے کا درس تھا۔ پوری نظم درج نہیں کی جاتی اگرچہ اِدھر اُدھر سے اشعار کا انتخاب نظم کی فضا کو مجروح کر دیتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی | دھن کی پوری ہے کام کی پکّی

پینے میں نہیں لگی کچھ دیر — تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
ختم تیرا سفر نہیں ہوتا — نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
کیا تجھے چین ہی نہیں آتا — کام جب تک نبڑ نہیں جاتا
مینہ برستا ہو یا چلے آندھی — تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی

پن چکی کا یہ عمل ہی قابل ستائش نہیں بلکہ اس کے چلنے میں آواز سے ہوا میں جو ترنم بکھرتا ہے وہ بھی بچوں کے لیے دلچسپی کی چیز ہے۔ اور شاعر نے اس مقام پر بچوں کی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

تو بڑے کام کی ہے اے چکی — مجھ کو بھاتی ہے تیری لے چکی

یہاں شاعر نے تعلیمی نفسیات سے کام لیا ہے یہ اشعار اور فضا ان کو ابھارنے کا کام کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھا کر شاعر نے بچوں کے ذہن کو ان کے فرض کی طرف رجوع کیا ہے۔

علم سیکھو سبق پڑھو بچو — اور آگے چلو بڑھو بچو
کھیلنے کودنے کا مت لو نام — کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب نبڑ جائے کام تب ہے مزا — کھیلنے کھانے اور سونے کا
دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ — نہ کہ اکتا کے خامشی کے ساتھ

دیکھ لو چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

بچوں کو درس کی طرف مائل کر کے ان کی دلچسپی کی چیز کو پھر ان کی نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے۔ جذباتی وابستگی (association) کے ذریعے ذہنوں میں کام کی اہمیت کو نقش کرنا اور شوق کو برقرار رکھنا، آخری شعر کی حسن کارانہ صنعت ہے۔

صفاتی نظمیں

مولانا نے بچوں کے لیے ایسی نظمیں

بھی لکھی ہیں جن کی حیثیت اخلاقی درس کی ہے مگر ان میں کسی مجرد صفت یا اخلاقی قدر کا بیان ہے اور براہِ راست انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ایسی نظموں میں حسب ذیل عنوانات شامل ہیں۔

(۱) موعظت ۲۔ بخیلی اور فضولی ۳۔ ایک وقت میں ایک کام ۴۔ سچ کہو

ہے کام کے وقت کام اچھا — اور کھیل کے وقت کھیل اچھا
جب کام کا وقت ہو کرو کام — بھولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام
ہاں کھیل کے وقت خوب کھیلو — کودو پھاندو کہ ڈنڈ پیلو
خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ — ہر بات کا سیکھیے سلیقہ

ان اشعار کے بعد اپنی ہمت سے کام کرنے اور غیر کے سہارے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد پھر کام کرنے کا گر بتایا ہے۔

مت چھوڑیو کام کو ادھورا — بے کار ہے جو ہوا نہ پورا
ایک وقت میں صرف ایک ہی کام — پا سکتا ہے بہتری سے انجام
جب کام میں کام اور جھیڑا — دونوں ہی میں پڑ گیا بکھیڑا
جو وقت گزر گیا اکارت — افسوس ہوا خزانہ غارت

اس نظم کی ترتیب اور خیال سے مترشح ہے کہ یہ انگریزی کی مشہور نظم

Work while you work
And Play while you play

سے ماخوذ ہے۔

تمثیلی نظمیں

ان نظموں میں دو کرداروں کا مکالمہ پیش کر کے یا کسی نہایت مختصر حکایت کے ذریعے شاعر نے کوئی پیغام نئی نسل کے ذہنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے

ایک جگنو اور بچے کی باتیں

ابتدائی چھے اشعار میں شاعر نے تقریب

سخن" کے طور پر اندھیری رات میں جگنو کا چمکنا اور ایک بچّے کا اُسے ٹوپی میں چھپا لینا بیان کیا ہے ۔ اسکے بعد جگنو اور بچے کی گفتگو اس طرح شروع ہوئی ہے

جگنو خدا کے لیے چھوڑ دے چھوڑ دے — مری قید سے جال کو توڑ دے
بچّہ کروں گا نہ آزاد اسوقت تک — کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک
جگنو چمک میری دن میں نہ پاؤ گے تم — اُجالے میں ہو جائے گی وہ تو گُم
بچّہ ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے — کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اُجالے میں دن کے کھلے گا یہ حال — کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال
دھواں ہے نہ شعلہ، نہ گرمی، نہ آنچ — چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ
جگنو یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب — کہ ذرّے کو چمکائے جوں آفتاب
مجھے دی ہے اسواسطے یہ چمک — کہ تم دیکھ کر مجھکو جاؤ ٹھٹک
نہ اَلّھڑ پنے سے کرو پائے مال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال

اس نظم کی خوبی یہی ہے کہ مکالمے کے ذریعے دلچسپی قائم رکھی ہے اظہار بیان کے لیے مثنوی کی ہیئت سے کام لیا ہے۔ بچّوں کے لیے جگنو کا موضوع مانوس بھی ہے اور حیرت و عشرت کا ذریعہ بھی۔

تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے

اس نظم میں کائنات اور زندگی سے بیشتر مثالیں دی ہیں کہ آغاز کار نہایت معمولی ہوتا ہے لیکن انجام قابلِ قدر بن جاتا ہے مثالیں ملاحظہ کیجیے

بناتا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا — سو ایک ایک تنکا اکٹھا کیا
گیا ایک ہی بار، سورج نہ ڈوب — مگر رفتہ رفتہ ہوا ہے غروب

قدم ہی قدم طے ہوا ہے سفر   گئیں لحظے لحظے میں عمریں گزر
درختوں کے جھنڈ اور جنگل گھنے   یونہیں پتّے پتّے سے مل کر بنے
ہوئے ریشے ریشے سے بن اور جھاڑ   بنا ذرّے ذرّے سے مل کر پہاڑ
لگا دانے دانے سے غلّے کا ڈھیر   پڑا لمحے لمحے سے برسوں کا پھیر
لکھا لکھنے والے نے ایک ایک حرف   ہوئیں گڈیاں کتنی کاغذ کی صرف
ہوئی لکھتے لکھتے مرتب کتاب   اسی پر ہر ایک شے کا سمجھو حساب
یونہیں پھوٹیوں پھوٹیوں بھرے جھیل تال   یونہیں کوڑی کوڑی ہو جمع مال

بچوں کے ذہن کو مطمئن کر کے آخر میں درسِ عمل دیا ہے۔

اگر تھوڑا تھوڑا کرو صبح شام   بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام

بچوں کے لیے تو یہ نظم بیحد مفید ہے لیکن جو لوگ کام سے جلدی اکتا جاتے ہیں ان کے لیے، تکمیلِ کار پر آمادہ کرنا بھی اس نظم کے تاثر میں شامل ہے

ایک گدھا شیر بنا تھا

(مرتبہ ۱۸۹۳ء)

اس نظم میں "نقل اور بناوٹ" کی ذلت کا بیان ہے۔ راستی کی تلقین کی ہے گدھے اور شیر کی علامتیں معنی خیز ہیں اور تفہیم کے لیے نہایت معاون۔ اصلاً یہ بلیغ استعارے ہیں۔ گدھے کی حماقت اور شیر کی دلیری انسانی زندگی میں سچائی کا درجہ پا چکی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

پایا تھا اک گدھے نے کہیں پوستینِ شیر   سوچا کہ آؤ خوب ہے کچھ کھیلیے شکار
پہنا اور آس پاس کے کھیتوں میں جا گھسا   دیکھا جو شیر، سہم گئے اس سے کاشتکار
اتنے میں اپنی بولی جو بولا تو کھل گیا   ہے شیر کے لباس میں پوشیدہ ایک حمار
جب کھل گیا فریب تو پھر مارے طیش کے   لے کے اپنی لاٹھیاں سب پل پڑے گنوار
بچیو سدا تکلف و ناراستی سے تم   کرتا ہے آدمی کو یہ شیوہ ذلیل و خوار

جو بات تھی صلاح کی وہ، ہم نے بتا دی
آئندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

ملمّع کی انگوٹھی

اس نظم میں بھی وہی سچائی کی تلقین اور بناوٹ کی مذمت ہے۔ اس نظم کی فضا سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ، لڑکیوں کے لیے کہی گئی ہے تکرار کے الفاظ ترکیبیں، طرزِ بیان، جذبات کا اظہار، سب سے مترشح ہے کہ یہ تکرار صنفِ نازک کی ہے۔ اس صداقت بیان سے مولانا کی نظم نگاری کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔

ناقدردانی

اس نظم میں ایک مختصر حکایت یہ ہے کہ ایک دہقان کو کیچڑ میں پڑا ہوا لعل ملا۔ اس نے ایک تحفہ سمجھ کر اپنے بچّے کو دے دیا۔ بچہ بہت خوش ہوا۔ لعل کو مشخص کر کے مولانا نے اس کی زبان سے ناقدردانی کا ماتم کرایا ہے۔ مولانا اسماعیل کی نظم "مدر اور کلنگ" میں اسی خیال کا نقش ملتا ہے۔

بچّہ اور ماں

مولانا اسماعیل کی یہ نظم دراصل ایک انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔ اردو کا پیرہن مولانا نے عطا کیا ہے۔ انگریزی نظموں میں "سر" سی سیڈلے کی نظم "چائلڈ اینڈ میڈن" مشہور نظم ہے

Child and Maiden

By Sir C. Sedley Book second p.86

The Golden Treasury by Francis.

7 Palgrave London (1926)

اسی انگریزی نظم کو سامنے رکھ کر مولانا اسماعیل نے اپنی نظم کہی ہے۔ اس میں بچے کی معصوم زندگی اور شفقتِ مادری کا اظہار ہے۔

ماں اور بچہ

اسی سلسلے کی دوسری نظم ہے۔ بچے کی زبان سے شفقت مادری کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ مولانا اسماعیل کی یہ نظم انگریزی ادب کے مشہور شاعر کی نظم سے اخذ کی گئی ہے۔ ڈبلیو مارس کی نظم "مدر اینڈ سن" بچوں کی مشہور اخلاقی نظموں میں شامل ہے۔

Mother and Son by W. Morris

ایک لڑکا اور بیر

اس نظم میں کوئی حیرت نفضا کہانی نہیں ہے۔ ایک پڑوسی کے گھر میں بیروں کا ڈھیر کھلا پڑا ہے۔ ایک بچہ داخل ہوتا ہے۔ بچے کے لیے بیر دلچسپی اور رغبت کی چیز ہیں اور کوئی نگہبان نہیں ہے۔ مگر بچے نے بیر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پڑوسی آکر یہ دیکھتا ہے کہ بیر کی چوری نہیں ہوئی اس پر اسے تعجب ہے اور بچے سے جواب معلوم کرتا ہے۔ بچے کی عادتوں کی بنیاد، نیکی اور ایمان داری ہے۔

نظم کی تلقین یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اگر اچھے ماحول میں ہو جائے تو ان میں نیک خیالات خود پیدا ہو جاتے ہیں اور نیکی ان کی عادت بن جاتی ہے۔

ایک پودا اور گھاس

اس نظم میں ایک پودے اور گھاس کی گفتگو کے ذریعہ مولانا اسماعیل نے ہمارے سماج کے ایک رجحان کو پیش کیا ہے۔ ہم اپنے ماحول سے مطمئن نہیں ہوتے۔ سماج کی بے انصافی کے شکوہ سنج رہتے ہیں۔ مولانا نے بتایا ہے کہ سماج کی خدمت اور سماجی بہبود کے ساتھ، افراد کی خوشحالی اور کامرانی وابستہ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے ریڈر

(۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۴ء)

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے اردو ریڈروں کا سلسلہ انقلابی ثابت ہوا اور نہایت مقبول۔ اس وقت تک ان کی کتابیں بعض مطابع سے شائع ہو رہی ہیں اور خصوصاً آسان اردو کے طلبا انہیں کالج تک میں پڑھتے ہیں۔

مولانا اسماعیل نے سب سے پہلے ایک قاعدہ اور اردو کی پہلی کتاب مرتب کی تھی۔ یہ دونوں چیزیں پہلی بار ۱۸۹۲ء میں چھپی تھیں۔ مولانا نے ان کو خود طبع کرایا تھا۔ دوسرے برس گرمیوں کی تعطیل میں مولانا نے میرٹھ جانا ملتوی کر دیا اور آگرہ ہی قیام کر کے اس سلسلے کی بقیہ چار کتابیں مرتب کیں۔ ۱۸۹۴ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے یہ سلسلہ منظور کیا اور ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے حکم سے یو۔پی کے تمام ابتدائی مدرسوں میں یہی سلسلہ داخلِ نصاب ہوا۔ ان کتابوں کی طباعت منشی مجید الدین کے مطبع اکبری آگرہ میں ہوئی تھی۔

توزک اردو (۱۸۹۴ء)

آگرے کے دوران قیام میں مولانا نے اردو مڈل کلاس کے طلبہ کے لیے ایک انتخاب کیا تھا جو "توزک اردو" کے نام سے چھپا۔ یہ کتاب کئی برس تک نصاب میں داخل رہی۔ کچھ دن بعد مولانا نے اس کتاب کا بڑا ایڈیشن مرتب کیا جو ہائی اسکول کے لیے تھا اور کئی برس تک ہائی اسکولوں کی نویں اور دسویں جماعتوں میں پڑھایا گیا۔ مولانا نے اس کتاب کو نثر اور نظم دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ نثر کے ۲۰۸ صفحات اور نظم کے ۱۰۰ صفحات رکھے تھے۔ حصۂ نثر میں پہلا سبق "سولزیشن یا تہذیب" سر سید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق سے لیا گیا تھا۔ اس سبق سے پہلے مولانا اسماعیل میرٹھی نے اپنا نوٹ درج کیا ہے۔

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اردو زبان کے علم و ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا پرتو اس پر پڑا وہ زیادہ تر سرسیدہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ان کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔"(۱)

اس کتاب میں ۳۲ مضامین ہیں۔ حصّۂ نظم میں سب سے پہلے مثنویات شامل ہیں جن میں حالی، میر حسن، نسیم اور میر تقی میر کی مثنویوں کا انتخاب درج ہے۔ اس کے بعد غزلیات ہیں۔ سب سے پہلے داغ دہلوی کی دس غزلیں ہیں۔ امیر مینائی کی چھ غزلیں، اسماعیل میرٹھی کی نو غزلیں، ظفر کی نو غزلیں، ذوق کی آٹھ، مومن کی آٹھ شیفتہ، غالب، آتش، ناسخ کی سات سات غزلیں، جرأت کی چھے، انشا کی آٹھ، مصحفی کی نو، میر تقی میر کی دس، سودا کی آٹھ خواجہ میر درد کی چھ غزلیں منتخب کی گئی ہیں

غزلوں کے بعد قصائد میں چھ شاعروں کے قصیدے شامل کیے ہیں۔ امیر مینائی ڈاکٹر نذیر احمد، مومن، غالب، ذوق اور حالی۔ قصیدہ نگاروں میں نیا نام نذیر احمد کا ہے ان کے قصیدے کا پہلا شعر درج کیا جاتا ہے۔

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام   پر اس میں شک نہیں جلسہ ہوا ہے کا بے ہنگام

اس کے بعد حالی، غالب اور ذوق کے قطعات درج ہیں۔ میر ببر علی انیس کے مسدّسات ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کا مثمّن (کیفیت قلعۂ اکبر آباد) ہے۔ آخر میں حالی، اسماعیل، امیر مینائی، غالب، میر انیس اور میر تقی میر کی رباعیاں ہیں۔

اس ترتیب و انتخاب سے طلبہ کے ذہن اصناف شعر سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اردو ادب کے اہم شاعروں سے واقفیت کے ساتھ ان میں اچھے کلام کی پسند کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اردو کورس برائے نارمل اسکول (۱۸۹۷ء)

یہ انتخاب نارمل اسکولوں کی دوسرے سال کی جماعت کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ کتاب نولکشور پریس لکھنؤ کی فرمائش پر تالیف کی گئی تھی نول کشور پریس میں چھپی تھی

(۱) ص - ۱

اور نول کشور بک ڈپو سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں " نثر و نظم "کا انتخاب شامل ہے

کمک اردو اور ادیب اردو

۱۹۰۹ء میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی لکھنؤ تشریف لے گئے اور چندے مقیم رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے دو ادبی انتخابات کیے۔ یہ انتخابات کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان کی افادیت کی پیش نظر ان کو داخل نصاب کیا گیا۔ چنانچہ یہ کتابیں شہری اور دیہی مدارس کی پانچویں اور چھٹی جماعتوں کے لیے برسوں داخلِ درس رہی ہیں۔

سفینۂ اردو (۱۹۱۰ء)

یہ کتاب اردو انتخاب کا عمدہ نمونہ ہے۔ انگریزی اسکولوں میں درجہ ہفتم و ہشتم کے سرکاری نصاب میں شامل تھی۔ سفینۂ اردو میں پہلی مرتبہ سید سجاد حیدر یلدرم کا کلام انتخاب کیا گیا تھا۔ سفینۂ اردو میں جن نئے مصنفوں کی تخلیقات پر مولانا نے اپنی مہرِ انتخاب ثبت فرمائی ہے اُن کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

محمد محمود سیفی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، سجاد مرزا بیگ دہلوی مولانا عبدالحق بی اے، راشد الخیری دہلوی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، عنایت اللہ بی اے دہلوی مولانا ظفر علی خاں۔

سواد اردو (۱۹۱۴ء)

ہندستانی زبان کی تیسری اور چوتھی جماعت کے طلبہ کے لیے یہ کتاب سررشتۂ تعلیم یوپی کی خواہش پر تالیف کی گئی تھی۔ سواد اردو ۱۹۱۴ء سے غالباً ۱۹۳۰ء تک نصاب میں شامل رہی ہے۔

غیر مطبوعہ

مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مولانا نے اردو کی اور بھی کئی کتابیں لکھیں ان

غیر مطبوعہ کتابوں میں سے ایک اردو کی درسی لغت تھی جو ۱۹۱۰ء میں مکمّل ہوئی۔ مولانا کا یہ کام کئی جلدوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مسوّدے مولانا کی ذاتی لائبریری میرٹھ میں محفوظ ہیں۔ وہ اردو ڈکشنری کا ایک سستا ایڈیشن شایع کرنا چاہتے تھے جو نہایت مستند ہو۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال کے لیے انھوں نے اساتذہ کے کلام سے مثالیں جمع کی تھیں۔

قواعد اردو حصہ اول و دوم (۱۸۹۴ء)

مولانا نے عربی گرامر کی تقلید سے بچکر یہ رسالے ترتیب دیے تھے۔ یہ مختصر رسالے لوئر پرائمری اور اپر پرائمری اسکول کے طلبہ کے لیے لکھے گئے تھے۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنی کتاب "تاریخ نثر اردو" بنام تاریخی "نمونہ منثورات" میں مولانا اسماعیل کے قواعد اردو حصہ دوم کا ذکر کیا ہے اور مندرجہ ذیل نمونہ عبارت شامل کیا ہے۔

علمِ ہجّا

۱۔ علم ہجّا سے حرفوں کے ہجے کرنے اور ملانے کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ حرف وہ سادہ آوازیں ہیں جن سے لفظ بنتے ہیں۔

۳۔ ہر حرف کا ایک نام ہے اور لکھنے کے لیے ایک شکل مثلاً:

الف : ا ، بے : ب ، تے : ت

۴۔ اردو زبان میں سب ۳۵ حرف ہیں جن کے مجموعے کو الف بے تے یا حروفِ تہجی کہتے ہیں۔

۵۔ اردو کی الف بے تے میں، ہندی، فارسی، عربی تینوں زبانوں کے حرف شامل ہیں۔ ان میں سے ٹ، ڈ، ڑ خاص ہندی ہیں۔ ژ، خاص فارسی ہے۔ ث ح، ص، ض، ع، ق، ط، ظ، یہ آٹھ خاص عربی کے ہیں۔

پ، چ، گ، ہندی میں مشترک ہیں۔ عربی میں نہیں آتے۔

ذ (۱)، ژ، خ، ف، عربی فارسی میں مشترک ہیں ہندی میں نہیں آتے۔ ۲

مولوی عبدالحق نے مولانا محمد اسماعیل کے قواعد اردو کے بارے میں لکھا ہے۔

"زمانہ حال میں متعدد کتابیں اس مبحث پر طلبہ مدارس وغیرہ کے لیے پنجاب، وممالک متحدہ آگرہ واودھ میں تالیف ہوئی ہیں جن میں کم و بیش عربی صرف ونحو کا تتبع کیا گیا ہے۔ البتہ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے جو دو مختصر رسالے طلبہ مدارس کے لیے لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے تقلید سے الگ ہو کر جدت سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ رسالے بہت مختصر ہیں اور صرف ابتدائی مدارس کے طالب علموں کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔" (۱)

قواعد اردو حصہ دوم

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی

ورناکیولر اور اینگلو ورناکیولر اسکولوں کی چوتھی جماعت کے لیے مولانا اسمٰعیل نے اس قواعد میں مندرجہ ذیل دیباچہ بھی شامل کیا تھا۔

دیباچہ

میں نے ۱۸۹۴ء میں قواعد اردو کو چار حصوں میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ تقسیم اس بنا پر تھی کہ یہ حصص بتدریج مدارس کی مختلف جماعتوں کے معیار

---

(۱) ذ۔ ذال کو متقدمین نے عربی فارسی میں مشترک مانا ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ فارسی میں ذال (ذ) کا وجود نہیں۔ اس لیے گزر اور گزارش کا املا "ز" سے چاہیے۔

۲۔ ص۔ ۲۵   ۳۔ قواعد اردو ۱۹۱۴ء مقدمہ ۱۷

درس کو پورا کر سکیں۔ اس وقت صرف دو ابتدائی حصے چھاپے گئے جو اس فن کی کتب متداولہ سے اکثر مسائل میں مختلف تھے۔ لہذا دیباچہ کتاب میں اربابِ فن سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ عالمانہ تنقید و نکتہ چینی اور مفید تجویزات سے میری اعانت فرمائیں۔ لیکن اڈیٹر رسالہ معارف کے سوا کسی نے یہ تکلیف گوارا نہ فرمائی۔ غالباً یہ فن ہی ایسا غیر دلچسپ اور بے حظ ہے کہ دماغ کو مصروفیت کا کوئی فوری صلہ عطا نہیں کرتا۔ خیر وہ دونوں حصے اب تک نولکشور پریس میں چھپتے اور شائع ہوتے ہیں۔ میں نے ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھی اور اس کی تکمیل کے لیے انگریزی زبان کی مستند گریمروں کا مطالعہ بھی بالواسطہ کیا اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہماری زبان کی گریمر بہ نسبت عربی کے انگریزی سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ اور یہ مطابقت اتفاقی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔

اردو کے بڑے عناصر تین زبانوں کے الفاظ ہیں۔ ہندی، فارسی عربی ان میں سے دو یعنی ہندی و فارسی آرین خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو الفاظ کی صرف اشتقاق اور جملہ کے اندر الفاظ کی ترتیب و تالیف بالکل ہندی طریقہ پر ہے۔

انگریزی زبان کا رشتہ ناطہ بھی آرین خاندان سے ہے۔ پس ان دونوں زبانوں کی گریمر میں جو تطابق پایا جاتا ہے وہ ان کی خاندانی قرابت کا اثر ہے۔ عربی، سامی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا طریقہ صرف اور آیئن اشتقاق آرین زبانوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی لیے عربی کی تقسیم میں کلمات اور جملوں کی تالیف کے طریقے اردو پر منطبق نہیں ہوتے۔ جن اعتبارات کی بنیاد پر وہاں قواعد و ضوابط منضبط کیے گئے ہیں یہاں وہ اعتبارات ہی

مفقود ہیں۔

لیکن اردو میں گریمر کی تالیف و تدوین جان گلکرسٹ کے زمانے سے عربی کے انداز پر شروع ہوئی اور اسی ڈگر پر اب تک چلی جاتی ہے۔ حقیقت میں ان کتابوں کو اردو گریمر کہنا درست نہیں بلکہ عربی گریمر کا فوٹو چربہ کیمرہ مین لیا گیا ہے۔ تالیف کے اس غلط اصول نے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) کلموں کی تقسیم بلحاظ معنی تین قسموں میں کی جاتی ہے۔ اسم، فعل، حرف، لیکن اسم جو کہ پہلی تقسیم میں فعل و حرف کا مدِ مقابل ہے آئندہ چل کر کبھی ضمیر کا مقابل ہوتا ہے۔ کبھی صفت کا کبھی ظروف کا۔ ایک ہی اصطلاح کو کئی معنی میں استعمال کرنا مبتدی کے حق میں وبالِ جان ہے۔

(۲) اسم کی قسمیں اشتقاق کے لحاظ سے تین کی جاتی ہیں۔ جامد، مصدر، مشتق۔ یہ تقسیم عربی کے لیے درست ہے۔ لیکن عربی کا سا اشتقاق ہندی و فارسی میں نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ان زبانوں کے الفاظ اس تقسیم کے احاطے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ ہندی فارسی میں اسم سے صفت اور صفت سے اسم بنانے کا عام قاعدہ جاری ہے۔ برخلاف اس کے عربی میں اشتقاق کی اصل صرف مصدر رہے۔

(۳) معرفہ کے اقسام سات بیان کیے گئے ہیں۔ جو عربی زبان کے لیے کارآمد ہیں۔ بعض قاعدے اس تقسیم سے متعلق ہیں۔ لیکن اردو میں یہ تقسیم بیکارِ محض ہے۔

(۴) کلماتِ استفہام کو حروف میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ

حروف ہرگز نہیں۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں حروف ہی استفہام کا کام دیتے ہیں۔

(۵) حروف کے اقسام باعتبار معنی بعض کتابوں میں (۳۴) اور بعض میں اس سے بھی زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔ کوئی نظام و ترتیب ان میں نہیں ہے۔

(۶) افعال کی تقسیم محض زمانہ کے اعتبار سے کی ہے اور زمانے تین قرار دیے ہیں۔ لیکن فعل چھے بیان کیے ہیں اور کوئی وجہ نہیں بتائی کہ چھے کیوں ہیں۔

(۷) نحو میں بہت سے توابع بیان کیے ہیں جن کی اردو میں کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ عربی میں اواخر کلمات کے اعراب مختلف ہو جاتے ہیں۔ اعراب کی بنا پر توابع قرار دیے گئے ہیں اردو میں نہ اعراب کا اختلاف ہے نہ توابع کی ضرورت۔

باوجود ان خرابیوں کے بھی جو کتابیں عربی گریمر کے انداز پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے طرز بیان اور تقسیم و ترتیب میں ایک طریقۂ راسخہ پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایسی کتابیں بھی رائج ہیں جن میں نہ عربی کا تتبع ہے نہ انگریزی کا۔ وہ ادھر کی نہ اُدھر کی بلکہ اس فن کے حق میں بلائے بے درماں ہیں۔

ان مشکلات پر نظر کر کے میں نے دو حصے قواعد اردو کے از سر نو مرتب کیے ہیں پہلے حصے میں صرف اقسام کلمات کا ذکر کیا ہے اور تقسیم اس اعتبار سے کی ہے کہ کلمہ جملہ کے اندر کیا کام دیتا ہے اس تقسیم میں اگرچہ کلمات کی آٹھ قسمیں انگریزی سے مطابق ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہ کثرت ان بکھیڑوں سے بمراتب بہتر اور قریب الفہم ہے جو معنوی اور اشتقاقی تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے حصے

میں اقسامِ ہشتگانہ کی انواع اور ان کی گردان بیان کی گئی ہے۔ طرزِ بیان وہی ہے جو مطبوعات ۱۸۹۶ء کا تھا۔ یعنی امثال کو کلیات کا ماتحت نہیں بنایا بلکہ امثال سے کلیات و ضوابط کا استخراج کیا ہے۔ اب کی بار مسلّم اساتذہ کے کلام سے مشق و تمرین کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے اور بالخصوص افعال کی تقسیم اور گردان ایک معقول ترتیب سے لکھی گئی ہے۔ جس میں اوضاعِ افعال (Moods) بھی بیان کیے گئے ہیں یہ دونوں حصے چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔ اُمید ہے تیسرا اور چوتھا حصہ بھی اسی سال شائع ہو جائے گا۔

تیسرے حصے میں کلمات کا اشتقاق اور جملے کی ترتیب و تالیف کے قاعدے بیان کیے جائیں گے اور الفاظ فارسی و عربی جو اردو میں مستعمل ہیں ان کی صرف و اشتقاق اُنھیں زبانوں کے طریقے پر جداگانہ ابواب میں لکھی جائے گی۔ کیونکہ ایک ہی قواعد کا ماتحت بنانا محالِ عقل ہے۔

چوتھے حصے میں علم معانی و بیان و بدیع اور عروض و قافیہ کا بیان ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو حصص قواعد مطبوعہ ۱۸۹۶ء میں بعض اصطلاحی الفاظ نئے اختیار کیے گئے تھے ان میں سے بعض کو تبدیل کر دیا ہے اور ضرورتاً چند اور جدید اصطلاحیں اختیار کی گئی ہیں جن کی فہرست درجِ ذیل ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ جن صاحبوں کو اس فن سے دلچسپی ہے اور وہ اپنی زبان کی گرامر کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ ان الفاظ پر غور کریں گے۔ اگر ان سے بہتر الفاظ وہ تجویز فرمائیں تو میں نہایت امتنان کے ساتھ ان کی تجویز کا طبعِ آئندہ میں

لحاظ رکھوں گا۔

محمد اسماعیل
بالائے کوٹ میرٹھ
۱۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء

ترجمان فارسی

مولانا اسماعیل کو اردو سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ ترجمے کی قدر وقیمت سے واقف تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ۱۸۹۴ء میں سرکاری مدارس کے مبتدی طلبہ کے لیے ایک کتاب ترجمان فارسی مرتب کی تھی۔ اس میں ترجمہ کرنے کے قاعدے بیان کیے اور مہارت پیدا کرنے کے لیے ان قاعدوں سے متعلق مشقیں بھی شامل کیں۔ یہ کتاب نول کشور پریس سے کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ ہمارے سامنے ترجمانِ فارسی حصّہ اول کا مطبوعہ نسخہ (۱۹۱۴ء) ہے اس میں مولانا کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم

دیباچہ

فارسی میں ترزبان اس شخص کو کہتے ہیں جو خوش بیان و چرب زبان ہو۔ کئی زبانیں جانتا ہو۔ اہل عرب نے اپنے لہجے میں ترزبان کو بنایا ترجمان پھر اپنے مصدروں کے قیاس پر اس کا مصدر وضع کیا، ترجمہ۔ جس کے معنی ہیں ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلب بیان کرنا۔ پس لفظِ ترجمہ کے معنی سے خود ظاہر ہے کہ اس کا عامل کوئی شخص نہیں ہو سکتا جب تک کہ کم از کم دو زبانوں سے واقف نہ ہو۔

دنیا میں جو زبانیں رائج ہیں ان میں سے بعض بالکل متغائر

ہیں۔ بعض میں ایک پوشیدہ رشتہ غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ بعض میں کھلا کھلا میل جول ہے۔ چنانچہ فارسی اردو قسم آخر کی مثال ہیں۔

ان میں بے شمار الفاظ مشترک ہیں۔ جملے کی ترکیب کا انداز بھی تقریباً یکساں ہے۔ البتہ افعال اور ان کی گردان کا طور اور بعض حروف جداگانہ ہیں۔ لہٰذا ہمارے اسکولوں کے طلبہ کا جن کی مادری زبان اردو اور درسی زبان فارسی ہے۔ ترجمہ کی مشق شروع کرنے سے پیشتر مقدم کام یہ ہے کہ مصادر فارسی کی فہرست بامعنی اور افعال کی تصریف مستحضر ہو۔

چونکہ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد مترجم کے ذہن کو ان ضوابط تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو زبانوں کے خواص اور محاورات کے اختلاف سے متعلق ہیں۔ اس لیے راقم نے اس مختصر رسالے میں از روئے استنباط قواعدِ مذکور کو منضبط کیا ہے تاکہ ان کی رعایت، مبتدی کو ابتدا ہی سے راہِ راست پر لگا دے اور جو محنت و وقت ان قاعدوں کے ادراک میں صرف ہوتا ہے اس کو رائیگاں جانے سے بچا دے گو یہ چند قاعدے اس فن کی تمام تر مشکلات پر حاوی نہیں ہیں لیکن شبِ دیجور میں ایک ٹمٹماتے چراغ کا وجود بھی بس غنیمت ہے۔

راقم

محمد اسماعیل

سابق مدرسِ فارسی سنیٹرل نارمل اسکول آگرہ

مولانا نے اس کتاب میں ترجمہ کرنے کے ۵۹ قاعدے اور مشقیں درج کی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند قاعدے درج کیے جاتے ہیں۔

(۲) قاعدہ

جن اسموں میں اہل زبان نے کچھ تصرّف کر لیا ہو تو مترجم کو اس کی پیروی لازم ہے۔ مثلاً:

فارسی	اردو
دھلی	دلّی
دکن	دکھن
پاریس	پیرس
چیتر	چھتر
گنگ	گنگا
جمن	جمنا
ناپلیون	نپولین
برطانیہ	برٹن
کمپانی	کمپنی

(۴) قاعدہ

جب فارسی، ہندی کے ہم معنی الفاظ اردو میں یکساں مستعمل ہوں تو مترجم کو اختیار ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک طالب علم کے حق میں یہی مفید ہے کہ وہ ٹھیٹ ہندی لفظ کے لانے میں کوشش کرے۔ مثلاً:

ہندی	فارسی	ہندی	فارسی
نس	رگ	ہونٹ	لب
گھاؤ	زخم	برس	سال
سلوٹ، بل	چین	دُکھ	درد
سانس	دَم	ڈر	ہَول
سڑک	راہ	لڑائی	جنگ

فارسی	ہندی	فارسی	ہندی
سہو	بھول	موج	لہر
روز	دن	وزن	تول
پُشت	پیٹھ	دستہ	گڈی، گچھا
خون	لہو	خطا	چوک
جگر	کلیجہ	اُمید	آس
قطرہ	بوند	درخت	پیڑ
ہوش	اوسان	نرخ	بھاؤ
نمونہ	بانگی	فریب	دھوکہ
اندیشہ	سوچ، بچار	دام	اُدھار
نیزہ	بھالا	ہمیشہ	سدا

(۵) قاعدہ

بعض الفاظ کا ترجمہ ان کے اصلی معنی کے لحاظ سے درست نہیں ہوتا

مثلاً

بادکش	پنکھا	بادزدش	بھاٹ
بوستان	باغ	پائے پوش	جوتی
تازیانہ	کوڑا	پیش خدمت	نوکر
رودخانہ	ندی	درویش	فقیر غریب
خرگوش	خرگوش	زیرجامہ	پاجامہ
گاومیش	بھینس	رستاخیز	قیامت
پیش رو	سامنے	پشت سر	پیچھے
سنگ پُشت	کچھوا	سیماب	پارہ
شمشیر	تلوار	کہکشاں	کہکشاں

گرمابہ	حمّام	آتش زن	چقماق
کرم شب تاب	جگنو	نیم روز	دوپہر
چنانچہ	جیسے		

غرض مولانا نے قواعد کے بیان کرنے میں گریمر کی تمام اقسام کا ترتیب سے احاطہ کیا ہے۔

○

باب پنجم

نثر

ایک صوفی بزرگ سیّد غوث علی شاہ گزرے ہیں۔ وہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے پیر و مُرشد تھے۔ اُن کے حالاتِ زندگی اور ارشادات کتابی صورت میں قلم بند ہیں۔ کتاب کا نام ۔تذکرہ غوثیہ، ہے۔ یہی کتاب "شجرۂ معرفت" کے نام سے بھی موسوم ہے۔

"تذکرۂ غوثیہ" کی تالیف کے سلسلے میں ایک اہم گتھی اصل مولّف کی شناخت کے متعلق ہے اس کتاب پر مولّف کی حیثیت سے سیّد گل حسن شاہ کا نام چھپا ہے۔

حیات و کلیات اسماعیل مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں تذکرہ غوثیہ کو مولانا اسمٰعیل میرٹھی سے منسوب کیا گیا ہے۔

مگر حیات و کلیات اسماعیل کے پہلے ایڈیشن میں جو مولانا کی زندگی میں طبع ہوا اور جس کے مولّف خان بہادر محمد اسلم سیفی ہی تھے۔ تذکرۂ غوثیہ کا ذکر شامل نہیں ہے۔ بلکہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے دیباچہ بھی نہیں لکھا۔ صرف کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نثر کی ایک سطر بھی درج نہیں ہے۔ غالباً مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے پیر بھائی کی پردہ داری کی اور اپنی زندگی میں اخلاقاً حقیقت کو بے نقاب کرنے سے گریز کیا۔

لیکن عوام کے ذہن، آنکھ کی شہادت سے زیادہ، کان کی مستقل و مسلسل شہادت پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً تقسیم ہند کے بعد دہلی میں "ہارڈنگ برج" کا نام بدل کر تلک برج کر دیا گیا۔ اسی نام کا بورڈ بھی آویزاں ہے۔ لیکن اب بھی لبوں میں سفر

کرنے والے تمام لوگ ہارڈنگ برج کے نام سے ٹکٹ خریدتے ہیں - اور بس کنڈکٹر مذکورہ بس اسٹاپ قریب آنے پر "ہارڈنگ برج" کا بلند آواز سے اعلان کرتا ہے۔ یا اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ حیات وکلیات اسمٰعیل ۱۹۳۹ء میں یہ دعویٰ کیا گیا اور مذکور ہے کہ "تذکرۂ غوثیہ" کو مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے مرتب کیا۔ اس وقت سے آج تک بجز اکرام احمد کے جو سیّد گل حسن شاہ کے عزیز ہوتے ہیں کسی محقق نے تردیدی بیان نہیں دیا۔

ایک اور اسی سے ملتا جلتا مسئلہ مولانا محمد حسین آزاد کے اردو ریڈر کا ہے۔ ان کی درسی کتابوں پر کرنل ہالرائڈ کا نام درج ہے۔ مولانا کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود سب مانتے ہیں کہ وہ ریڈر مولانا محمد حسین آزاد کے ہیں اور ان کے نام سے چھپ رہے ہیں۔ ان خارجی شہادتوں کے علاوہ ہمیں ایک داخلی شہادت بھی دستیاب ہوئی ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے کتب خانہ میں اس کتاب کا قلمی نسخہ مولانا اسمٰعیل کے قلم کا لکھا ہوا محفوظ ہے۔ راقم نے بچشم خود دیکھا ہے۔

اس قلمی نسخہ کے ایک صفحے کا فوٹو "حیات اسمٰعیل" میں صفحہ ۵۴ اور ۵۵ کے درمیان چسپاں ہے۔ اس قلمی مسوّدہ کی لمبائی سات انچ اور چوڑائی ساڑھے پانچ انچ ہے۔ اس میں آٹھ خطوط بھی درج ہیں۔ سرنامہ پر رقم ہے۔

"مکتوبات از جانب حضرت قبلہ وکعبہ بہ طرف حکیم احتشام الدّین احمد صاحب"

اس مسوّدے میں بعض صفحات پر سیّد گل حسن شاہ کی تحریر بھی ہے۔ مثلاً: "کپالی" کی تشریح سیّد گل حسن شاہ کی تحریر میں ہے اور درجِ ذیل شعر سیّد گل حسن شاہ کے قلم سے لکھا ملتا ہے۔

بھلا میں دیکھا ستم گرسنتہ سپاہی

رام نام کی پٹا لکھا لی ایسی جاگیر پائی

یہ مسودہ مولانا اسماعیل میرٹھی کی تحریر ہے۔ (۱)

ہمارے اس بیان کی تصدیق، مالک رام کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ "تلامذۂ غالب" میں وہ لکھتے ہیں۔

عام لوگ اس کتاب کو سید گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف خیال کرتے ہیں کیونکہ ان ہی کا نام اس کے مصنف کی حیثیت سے سرورق پر لکھا ملتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ سید گل حسن شاہ جس خطۂ ملک کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہے۔ میں نے کتاب کا اصلی مسودہ خود مولانا اسماعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ان کے صاحبزادے جناب سیفی صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ جس کے بعد کوئی شبہ ہی نہیں رہ سکتا کہ یہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔" (۲)

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے اپنے پیر بھائی کے رتبہ کو بڑھانے اور ان کی سجادہ نشینی کو محبوب و مستحکم بنانے کے لیے یہ کتاب سید گل حسن شاہ کے نام سے چھپوا دی۔ دوسرے یہ کہ اس تذکرہ میں "ارشادات" کی نوعیت بھی عجیب و غریب ہے ممکن ہے بعض باتوں کو وہ پسند نہ کرتے ہوں۔ وہ ملک میں ممتاز شاعر اور معزز معلم کی حیثیت سے اپنا وقار قائم کر چکے تھے۔ تذکرۂ غوثیہ کی بعض دلچسپ روایات ان کی سنجیدگی اور اعلیٰ مذاق کے معیار پر پوری نہیں اتر سکیں۔

تذکرۂ غوثیہ میں ارشادات کے ساتھ جگہ جگہ اردو اور فارسی کے اشعار درج ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۶ پر سید غوث علی شاہ کی ولادت کا ذکر ہے۔ ذیل میں فارسی

---

(۱) قلمی مسودہ، اسماعیل لائبریری

(۲) مالک رام "تلامذۂ غالب"، ص ۷۴، مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء

اشعار ہیں۔ اس مطلع سے آغاز ہوتا ہے۔

سرورِ روحانیاں آمد پدید   جنبشِ در جسم و جان آمد پدید

اس مقام پر مرقوم جتنے اشعار ہیں وہی کلیاتِ اسماعیل میں فارسی کلام کے ساتھ درج ہیں۔ اسی طرح ''قصیدہ در مدح پیر و مرشد'' پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔ ''مولانا سید گل حسن مولانا میر بھٹی کے پیر بھائی تھے۔ اس نظم میں ان کا نام ڈال دیا ہے۔

مدّعا یہ ہے کہ تذکرہ میں فارسی اور اردو کے منتخب اور مناسب حال اشعار کی شمولیت اور تصوّف کے مختلف خانوادوں کا فارسی زبان میں شجرہ تحریر ہونا اس بات کی دلیل ضرور ہے کہ یہ کسی شاعر کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یا پھر ایسے صاحب ذوق کا کرشمہ جس کی عمر نہایت پاکیزہ ادبی صحبتوں میں گزری ہو۔ مطالعہ وسیع اور نظر میں تنقیدی صلاحیت ہو اور حسنِ انتخاب کا سلیقہ بھی رکھتا ہو۔ مولانا سید گل حسن شاہ کے یہاں تصوّف کے نکات، ریاضت، خدمتِ خلق، عقیدتِ شیخ اور صوفیوں کے ارشادات و اوصاف کی واقفیت مل سکتی ہے۔ لیکن اردو زبان و ادب میں ان کے ذوقِ مطالعہ، معلومات کا ذکر ان کے حالات زندگی میں نہیں ملتا اور ان کے پیر بھائی بھی اس سلسلے میں خاموش نظر آتے ہیں۔

تذکرۂ غوثیہ ایک حصار نہیں ہے جس میں تصوّف و معرفت کے نکات اکٹھے کر دیے گئے ہوں بلکہ اس میں اسی دنیا کے باعمل اور بے عمل نیک و بد، بے خبر اور باخبر انسانوں کے واقعات پیش کر کے رشد و ہدایات کی جانب مائل کیا گیا ہے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے قاری کو دلچسپی کے ساتھ ان کی افادیت کا اندازہ ہوگا۔

(۱) ایک روز ارشاد ہوا کہ مراد آباد میں ہم شیدی میاں کی زیارت کے لیے گئے۔ دیکھا کہ تالاب میں غسل کر کے چلے آتے ہیں اور پیٹھ ایسی چمکتی ہے جیسے سلہٹ کی ڈھال۔ اس وقت یہ مصرع ہمارے

ذہن میں گزرا۔ "آبِ حیواں درونِ تاریکی است۔"
شیدی میاں نے حالِ ضمیر دریافت کرکے فوراً یہ شعر پڑھا۔

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے لگنے کے ڈھنگ اور ہی ہیں (۱)

(۲) ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آن کرلے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا، مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو ٭ میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں ہے کسی اُستاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔ غزل مرزا نوشہ

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی ٭ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد ٭ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(پوری غزل درج ہے)

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے ہرچند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میخوار روسیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اُلش شر کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ تشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسرِ نفسی اور فروتنی تھی۔

---

(۱) تذکرۂ غوثیہ، مطبع فاروقی بہ اہتمام محمد اعظم۔ ص ۶۵ (سن ندارد)
(۲) ایضاً ص ۹۸

(۳) ایک روز ارشاد ہوا کہ اس شعر میں ایک شغل بیان کیا ہے۔

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکنِ بُت خانہ باش و مردم آزاری مکن

مے سے مراد عشق ہے اور مصحف، جسم انسان، کعبہ، دل اور بُت خانہ، تصور شیخ یا رسولؐ یا معشوق اور مردم آزاری سے مراد ہے پلک مارنا۔ (۱)

(۴) ایک روز ارشاد ہوا یہ بھی ایک شغل ہے۔

سن مکھ کر و دیدار محل میں پیارا ہے
تربینی کی گھاٹ میں مانجھی دھارا ہے

تربینی اس مقام کو کہتے ہیں جہاں تین دریا جمع ہو جائیں اور یہاں مُراد ہے دماغ سے یعنی جس وقت انسان اس شغل کو کرتا ہے تو مقام دماغ میں جس کا نام ہندی برم منڈ یعنی اخفیٰ ہے۔ تین آنکھیں یکجا جمع ہو جاتی ہیں۔ دو چشم ظاہر اور ایک چشم دل جس کا نام سویدا ہے۔ اس شغل کا نام ترکٹی ہے اور اسی کو "نصیر المحمود" بھی کہتے ہیں۔ ترکیب یہ ہے کہ اول دونوں آنکھوں کی نظر سر بینی پر قائم کرے چند روز کے بعد پتلی بطرف دماغ چڑھ جائے گی اور چشم دل بھی اسی طرف رجوع کرے گی جب ہر سہ چشم دماغ میں مجتمع ہو جاتے ہیں تو روح کو صعود حاصل ہوتا ہے۔ اور صعود کا انجام تین حال سے خالی نہیں۔ اگر طالب علم کم ظرف اور مُرشد ناقص ہے تو پردۂ دماغ پھٹ جائے گا اور روح نکل جائے گی۔ اور اگر طالب علم خود قوی ہے تو پرم ہنس یعنی مجذوب بن جائے گا اور اگر مُرشد کامل ہے تو روح اس صعود سے نزول کرے گی اور انوار روحانی سے تمام جسم روشن اور منوّر ہو جائے گا۔ لیکن غذا اس عمل میں نہایت لطیف ہونی چاہیے۔ جیسے دودھ چاول اور مسکا گاؤ کا استعمال بھی ضروری ہے۔ ابتداء میں آنکھوں پر بڑا زور پڑتا ہے۔ بتدریج اس کی مشق بڑھایا کرتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) ص ۱۵۹ (۲) ص ۳۳۴

(۵) ایک روز ارشاد ہوا کہ دو تپلیاں تھیں۔ ایک دانشمند سے پوچھا گیا کہ ان میں سے کون سی عمدہ اور بہتر ہے۔ اس نے دونوں کے کان میں تنکا ڈالا۔ ایک کے حلق سے نکل کر آیا۔ دوسرے کے پیٹ میں اُتر گیا۔ دانشمند نے جواب دیا کہ جس کے پیٹ میں سے تنکا اتر گیا وہی بہتر ہے ایسے ہی جو آدمی بات کو سُنکر ضبط و ہضم کر سکے وہی آدمی ہے۔

(۶) ایک روز ارشاد ہوا کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں ایک جوان کمبل پوش وارد ہوئے اور اس مسجد میں ٹھہرے جہاں ایک حافظ مرید حضرت کا رہا کرتا تھا۔ حافظ مسجد سے باہر جانے لگا تو فقیر نے پوچھا تم کہاں جاتے ہو۔ اس نے عرض کیا کہ میں دن میں دو بار مولانا کی مجلس میں حاضر ہوتا ہوں فجر کو تو درس حدیث ہوتا ہے اور عصر کے وقت مثنوی معنوی۔ فقیر بولا، بھلا حدیث تو کیا لیکن مثنوی سمجھ بھی لیتے ہو۔ حافظ چونکہ مُرید تھا اس کو یہ بات بری معلوم ہوئی۔ حضرت سے یہ حال گزارش کیا۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ واقع میں وہ بزرگ سچ کہتا ہے۔ چونکہ منصف مزاج اور صاحب کمال تھے خود اس کے پاس تشریف لائے اور درخواست کی کہ آپ کی زبان مبارک سے حدیث و مثنوی سُننا چاہتا ہوں۔ یہ کہکر اول تو ایسے معنی بیان کیے کہ عام فہم تھے دوبارہ ایسے مطالب بیان کیے کہ صرف مولانا سمجھے۔ تیسری بار جو شرح کی تو حضرت بھی نہ سمجھ سکے۔ تمام مجلس بیخود ہو گئی اور وہ شخص چل دیا۔ فی الحقیقت مردانِ خدا کے حالاتِ باطن کو کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔(۲)

(۷) ایک بار ارشاد ہوا کہ روح ندائے ربانی پر عاشق ہے جس آدمی کا وقت آخر ہوتا ہے تو وہ ندا آتی ہے اس کو سُنتے ہی روح پرواز کر جاتی ہے۔ چنانچہ

---

(۱) ص ۳۳۴ (۲) ص، ۳۲۸

مولانا روم نے اس ندا کو لفظِ "اغنون" سے تعبیر کیا ہے۔

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون
گویدم اِنّا الیہ راجعون (۱)

تذکرۂ غوثیہ کا سب سے قابلِ قدر اور اہم حصّہ "باب چہارم" ہے۔ جس میں مسئلہ توحید کا بیان ہے۔ اس میں نہایت وسعت ہے۔ اس لیے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں توحید کی تعریف لکھی ہے۔ توحید کی قسمیں بتائی گئی ہیں پھر آیاتِ قرآن اور احادیث نبوی سے توحید کی تصدیق اور وضاحت کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ آثار و اطوار اہلِ توحید کی گفتگو ہے اور ان کی مثالیں درج ہیں مثلاً توحید کے تحت کہا گیا ہے۔

"توحید ایسا مسئلہ ہے جو کبھی نسخ پذیر نہیں۔ ہر ایک دین و ملّت میں اس کی شہادت موجود ہے۔ کوئی قوم پردۂ زمین پر ایسی نہیں جس میں خدا کی یگانگی کو تسلیم کرنے والے نہ ہوں۔ جملہ انبیا و اولیا اور ہادیانِ راہ خدا خواہ کسی سرزمین اور کسی زمانے میں ہوئے ہوں ان کی تعلیم و تلقین کی بنیاد اسی لازوال مسئلہ پر ہے۔ یہی مسئلہ اسلام کا رُکن اور ایمان کی کلید ہے۔ یہی معلوماتِ ظاہر کا قبلہ اور مکشوفاتِ باطن کا کعبہ ہے۔ یہی شریعت و طریقت کی جان۔ یہی حقیقت و معرفت کی نردبان ہے۔ یہی جملہ طاعات کا راس اور یہی حکمت کی اساس ہے۔ طبعیٔ، ریاضی، الٰہی سب کے سلسلے اسی پاک مسئلہ سے شروع اور اسی پر ختم ہوتے ہیں۔" (۲)

توحید کے معنیٰ۔ توحید کے معنی ہیں، شے کے واحد ہونے پر حکم کرنا

---

(۱) تذکرہ غوثیہ، ص ۳۵۸
(۲) تذکرہ غوثیہ، ص ۱۲۷

اور شے کے واحد ہونے کا علم بھی توحید ہے۔" (۱)
توحید کی قسمیں۔ وجودی، شہودی، اور عینی وظلی بھی مشہور ہیں۔

ہر چند کہ یہ مسائل کشف باطن اور وجدان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ظاہر عبارت میں اس کی تقریر اس طرح لکھی ہے کہ وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے۔ لیکن ایک ظاہر کا وجود ہے اور ایک باطن ___ باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لیے بمنزلۂ جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پر تو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم وصفت و فعل کہ عالم ظاہر میں ہے ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے جیسی امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں سُبْحَانَ الَّذِی خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَھُوَ عَیْنُھَا، اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ اَلْحَقُّ مَحْسُوْسٌ وَالْخَلْقُ مَعْقُوْلٌ۔ یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے اور وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہور آثار وصفات مختلفہ واحد مطلق کی ذات وصفات کا ظل وعکس ہے جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے اور یہ ظل عین صاحب ظل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔ (۲)

بیان توحید سے معلوم ہوتا ہے کہ سید غوث علی شاہ کو ہندو فلسفہ سے بھی واقفیت تھی خصوصاً "بھگتی مت" کے بارے میں ان کی جانکاری قابل حیرت ہے۔ تذکرۂ غوثیہ میں فصل چہارم "آثار واطوار اہل توحید" سے متعلق ہے اس فصل میں ایک سرخی "گفتگوئے مہا پرس شناس منا" قائم کی گئی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

"جملہ علما حکما پنڈت گیانی فرماتے ہیں کہ پہلے کچھ نہ تھا فقط ایک

---

(۱) تذکرہ غوثیہ، ص ۱۲۸

(۲) تذکرہ غوثیہ، ص ۱۳۲

"الکھ" تھا یعنی ذات لاتعین بے نام ونشان تعینات حسّی سے منزّا ومبرّا۔ اس ذات سے یہ تمام اجسام ارضی واجرام فلکی یعنی پرجاپت اور ہرن گربھ اور ارواح ونفوس قرآن و انجیل و بید وشاستر پیر ومرشد شاہ وگدا امیر وفقیر وغیرہ ظہور میں آئے۔ (۱)

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے حسب ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

"لیکن با اعتبار سنکلپ روپ ہے اور با عتبار نرسنکلپ اروپ اور بصورت جسم فانی ہے اور بہ ہیئت روح باقی نہ مرے نہ زندہ ہو۔ جب تک جسم کو آگیان یعنی جہل ہے جیو آتما ہے اور جب گیان ہوا اسی کا نام پرم آتما یعنی ذات خدا ہے۔ وہ بڑا گیانی یعنی صاحب علم ہے کہ ہر شے کے جزو وکل سے واقف ہے مگر کچھ علم نہیں رکھتا کیوں کہ وہ عین علم ہے۔ (۲)

سوائے اس کے کچھ نہیں۔ پس یہ جونام ونشان جہاں میں ہیں، یعنی خدا، رسولؐ، اولیا، فرشتے، جنّ والنسان، بھوت چڑیل، شیطان، ایشور اوتار، رشی منی، ملکش، سورگ نرگ، بہشت و دوزخ، یہ سب حضرت انسان کا وہم و خیال اور عقل جزوی کی گھڑت ہے مالا لکڑ ٹھاکر پتھر تیرتھ، ہیں سب پانی راما کرشنا مر گئے، دیکھے چاروں وید کہانی۔

تذکرۂ غوثیہ میں باب پنجم میں ایک نئی بات یہ ہے کہ تصوّف کے نکات کو تصوفانہ اصطلاحوں کی مدد سے فارسی اشعار میں واضح کیا گیا ہے۔ ان میں لطائف پیش کیے گئے ہیں اور تقابلی مطالعہ کے طور پر مذکور ہے کہ وہ لطائف "شیتاس متا" میں بھی ہیں۔ چنانچہ حقیقت طور لطائف خمسہ کو کسی بزرگ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

---

(۱) تذکرۂ غوثیہ، ص ۱۳۹ (۲) تذکرۂ غوثیہ، ص ۱۴۰

"دربیان حقیقت طور قلب - دربیان طور حقیقت روح - دربیان طور حقیقت سرّ - دربیان حقیقت طور خفیہ دربیان حقیقت طور اخفا دربیان چار سیر مالک - مذکورہ سرخیوں کے تحت فارسی اشعار شامل ہیں۔

"اور یہ لطائف سنہ شیتاس متا میں بھی ہیں۔ کھٹ کنول یا کھٹ چکر بطریق یوگ شاستر یہ ہیں۔ یعنی نابھ کنول، من کنول، ہردے کنول بھرکٹی، ترکٹی، بھنور گپھا اور بعضوں نے یوں بیان کیا ہے۔

"آدھار کنول، لنگ کنول، نابھ کنول، ہردے کنول، کنٹھ کنول، بُرّد کنول،"

غرض "تذکرہ غوثیہ" ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں ایک طرف نفس اور انسانی خامیوں کے قصے ہیں اور دوسری طرف انسان کی پاکیزہ اور بلند زندگی کا مذکور ہے۔ اذکار و مراقبات، سلوک مشائخین زمانہ، طریقہ تعلیم کملا اقسام توجیہہ عرفان، توحید اقسام موحدین، مقام استغنا، مجازیب کی قسمیں، شغل سلوک، ریاضت و مجاہدہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔

"تذکرہ غوثیہ" میں قدیم روایت کے مطابق کتاب کا آغاز "حمد" سے ہوا ہے لیکن اس میں بھی ایک قلندرانہ شان نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"حمد و ثنا، سہو و خطا، شکر و سپاس وہم و سواس، کیسی حمد اور کس کا شکر، حامد کون محمود کیا شاکر کدھر مشکور کہاں۔ قطرہ ہے تو دریا موہوم دریا ہے تو قطرہ معدوم جب تک ذرّہ ذرّہ ہے آفتاب نہاں ہے۔ جب وجود آفتاب نمودار ہوا تو ذرّہ کہاں ہے۔ قطرہ امر اعتباری ہے۔ ہر قطرے میں دریا جاری ہے۔ آفتاب سے ذرّے کا وجود، ذرّے سے آفتاب کی نمود، قطرے سے دریا کا ظہور قطرے قطرے میں دریا معمور۔ لیکن نہ قطرہ نہ دریا نہ ذرّہ نہ آفتاب وہ خود نیست بہ خود نایاب۔ نہ اس کا پتا نہ اُس کا نشان نہ اُس کا ٹھکانا

نہ اُس کا مکان، تحریر و تقریر سے پاک خارج از فہم و ادراک جو سمجھے سو غلط جو لکھا سو خبط جو کہا سو جنون۔ تعالیٰ شانہٗ عما یصفون (۱)

حمد کی مانند نعت میں بھی ایک آن بان اور امتیازی انداز ملتا ہے۔

"حسن کو پردے میں قرار نہیں، خوبی بدون اظہار نہیں، معشوق کو حجاب عاشق کو تاب کہاں۔ جمال بے تجلّی اور طالب کو تسلّی محال۔ کہ حسن از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را۔"

حُسنِ ذات نے حلیۂ صفات میں نگار بیرنگی نے لباسِ تعیّنات میں ظہور کیا۔ وہی روزِ ازل وہی موجِ اوّل وہی تجلّی وہی نزول وہی مرتبۂ اولیٰ وہی شانِ آخری جو حال جو قال جو عبارت جو اشارت جا ہو قرار دوا عتبار اظہار تجلّی تفصیل تغیّر تبدّل تصور تخیّل، تشخص تعیّن حدوث خلق کون و فساد سب کا ایجاد اَوّلُ مَاخَلَقَ اللہُ نُوْرِیْ

اے پردہ برگرفتہ ببازار آمدہ
خلقے دریں طلسم گرفتار آمدہ

یعنی غایت مقصود علم میں مقدم مگر ظہور میں موخر ہے۔ تخم ریزی سے پہلے ثمر مدِّ نظر ہے۔ بعدہٗ ظہور شجر ہے۔ شاخ و برگ و پھل پھول یہ سب اُسی اجمال کی تفصیل ہے۔" (۲)

ان اقتباسات سے انشا پردازی کے معیار اور کتاب کی افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) ص ۲

(۲) ص ۴

۱۰

مقدمہ
مثنوی قران السعدین

امیر خسرو کی مثنوی "قران السعدین" مثنویات میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ مثنوی قران السعدین پر مقدمہ لکھنے کے لیے مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا نام منتخب ہوا تھا۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے مثنوی قران السعدین پر مقدمہ لکھا۔ وہ علی گڑھ میں نہایت پسند کیا گیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لیکن بعض دشواریوں کی بنا پر وہ مولانا کی رحلت کے بعد ۱۹۱۸ء میں شائع ہو سکا۔ اس تصنیف کے ساتھ سیّد حسن برنی بی اے علیگ، مہتمم دفتر کلیات خسرو، کی تفصیلی تمہید شامل ہے۔ اُنھوں نے مولانا کے کام کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

"وابستگان سلسلۂ خسروی پر ان کا بہت بڑا احسان ہے اور ان کی خدمات پورے طور اعترافِ خاص اور اظہارِ تشکر یہ کی مستحق ہیں۔ اُنھوں نے ابتداً یہ کام فخر ملک و ملّت اور شیدائے علم وفن نواب حاجی محمد اسحاق خانصاحب بہادر آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی فرمایش سے مخلصانہ تعلقات کی بنا پر قبول فرمایا تھا۔ آغازِ کار کے بعد مولانا کو اس مشغلہ سے ایسا عشق پیدا ہو گیا تھا کہ آخیر تک وہ اس میں منہمک رہے۔"(۱)

مولانا کے خلوص اور کارِ منصبی میں انہماک کا انداز پیرانہ سالی کے باوجود قابلِ حیرت تھا۔ سیّد حسن برنی کا بیان ہے۔

---

(۱) تمہید مثنوی قران السعدین، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، ص ۳

"ان کے شغف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکثر ایّام علالت میں بھی وہ بستر پر لیٹے لیٹے کچھ نہ کچھ خسرو کا کام کرتے رہتے تھے سلسلۂ خسروی میں اُنھوں نے اپنا قیمتی وقت بغیر کسی قسم کا معاوضہ قبول کیے صرف کیا۔ اور جب یہ خیال ہوتا ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسا استغنا دکھا سکتے ہیں تو مولانا کا ایثار خاص طور پر ہمارے دل میں ان کی وقعت پیدا کر دیتا ہے۔" (۱)

مولانا میرٹھی نے "قران السعدین" پر مکمل تنقید لکھی۔ اس کام میں ایک برس سے زیادہ صرف ہوا۔ قران السعدین تاریخی مثنوی ہے۔ اس لیے مولانا کی ذمہ داری تھی کہ تاریخی واقعات کا مطالعہ کریں اور اس کی صحت کے بعد متن کو مرکزِ توجہ بنائیں۔ یہ کام کافی محنت کا تھا۔ مگر مولانا نے اس کو دلسوزی کے ساتھ پورا کیا۔ اس کے بعد مثنوی کی خصوصیات اور اس کی خامیوں پر نظر ڈالی تھی دوسری مثنویوں کا تقابلی مطالعہ ہونا ضرور تھا تاکہ محاکمہ کرکے مثنوی زیر بحث کی صنفِ مثنوی میں اور معاصرین کی مثنویات میں اس کے مقام کا تعیّن کیا جا سکے۔

مولانا میرٹھی نے مثنوی کے قصّے کو پیش کیا ہے۔ اور اس کے متعلقات مثلاً اہم کرداروں کو واضح کیا ہے۔ اور "مثنوی قران السعدین" کے خصائص بیان کرتے ہوئے امیر خسرو کے کلام میں چند نئی خوبیاں تلاش کی ہیں۔ اور ان چند خصوصیات کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان خصوصیات سے شعرائے عجم کی مثنویات خالی ہیں۔ وہ ان کو لوازم مثنوی میں تو شمار نہیں کرتے لیکن اس سلسلے میں خسرو کی "جدّت آفرینی" کے ضرور معترف ہیں۔ پہلی بات جو قران السعدین کو دوسری مثنویات سے الگ اور برتر رکھتی ہے یہ ہے کہ مثنوی میں جتنے عنوانات قائم کیے گئے ہیں وہ سب منظوم ہیں۔ "مثنوی اور غزل" دو جداگانہ صنفِ سخن ہیں۔ دونوں کا مواد مختلف ہوتا ہے

(۱) تمہید مثنوی قران السعدین مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ص ۳

ہیئت جداگانہ ہوتی ہے عملِ تخلیق میں فرق ہے۔ لیکن خسرو نے اس مثنوی میں تضمین غزل کو شامل کر لیا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات کہ وصفِ اشیا کو بھی مثنوی کا جزو بنایا گیا ہے یعنی (۱) نظمِ عنوان (۲) تضمینِ غزل (۳) وصفِ اشیا۔ مثنوی قران السعدین کے امتیازی خصائص ہیں۔ ان خصائص کی نشاندہی مولانا میرٹھی نے بغور مطالعہ کرنے پر کی ہے اور اس دریافت کے بعد ان کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا ہے کہ امیر خُسرو نے یہ جدّت کیوں اختیار کی اور اس کی محرّک کیا شے تھی۔ مولانا نے اس کی تلاش کی ہے۔ پس منظر دیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ غالبًا مثنوی میں غزل اور قصیدے کا پیوند لگانا حضرت خسرو نے بھاشا کی شاعری سے اخذ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"حضرت کو بھاشا کی شاعری میں بھی ایسی ہی دستگاہ تھی جیسی کہ فارسی شاعری میں۔ بھاشا کا شاعر آغازِ داستان میں ایک دوہا یا چوپائی یا چھند لاتا ہے اور ختم داستان پر کبھی کبھی سورٹھا موزوں کرتا ہے اور اس رنگا رنگی سے اس کا مقصد تفننِ طبع ہے کہ ایک ہی مضمون پڑھتے پڑھتے جی اُکتا نہ جائے۔"(۱)

مولانا کی رائے ہے کہ امیر خسرو نے ہندی کا اثر قبول کر کے اردو مثنوی کو فارسی کی تقلید سے نجات دلائی۔ قصیدہ اور غزل کا مثنوی میں سمو دینا ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک نیا تجربہ کہا جائے گا۔ مولانا کو احساس ہے کہ اس تجربے کو اپنانا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"حضرت امیر خسرو نے آغاز داستان کے لیے قصیدہ شعر اور خاتمہ پر غزل کا التزام کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جدّت طرازی نہایت پُر لطف و بامزہ ہے مگر اس کی تقلید یک فنی شاعر کا کام نہیں ہے

---

(۱) مقدمہ مثنوی قران السعدین، ص ۷۹

جو شاعر مثنوی، قصیدہ، اور غزل ان ہر سہ اصناف میں ید طولیٰ رکھتا ہو وہی خسرو کی تنقید کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں حضرت خسرو کو اس مثنوی کا ممدوح بھی خوش قسمتی سے ایسا ہاتھ لگا ہے کہ ساقی و مغنّی و شاہد و بادہ و ساغر کا ذکر محتاج تکلف نہیں بلکہ اس کی بزم عیش کا ایک معمولی ہنگامہ ہے۔ انوری کی طرح خسرو کو یہ شکایت ہرگز نہ تھی کہ "نیست معشوقے سزاوار غزل۔" (۱)

وصف نگاری مولانا کے نزدیک وصف نگاری اشیا مثنوی قران السعدین کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ امیر خسرو نے مثنوی میں وصف اشیا کے سلسلہ میں اکیاون (۵۱) چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔ مولانا نے مثنوی میں ان کو تلاش کر کے تفصیل درج کی ہے۔ ان میں سے چند چیزوں کو یہاں دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً۔ کاغذ قلم، دوات، پھل، صراحی، پیالہ، صبح، جامع مسجد، آتش، موسم گرما، کشتی وغیرہ۔ مولانا نے وصفِ اشیا کو جہاں ایک خوبی قرار دیا ہے وہاں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ وصف نگاری کی وجہ سے یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ اصل قصے کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

مولانا نے وصفِ اشیا تلاش کر کے مثالوں میں اشعارِ مثنوی پیش کیے ہیں اور اشعار کا مطلب بھی درج کیا ہے۔ ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں تاکہ ایک طرف قاری کو یہ محسوس ہو سکے کہ مولانا کو عروض و بیان، صنائع و بدائع پر کتنا عبور حاصل تھا۔ دوسرے یہ کہ فارسی ادب پر ان کو کس قدر دسترس حاصل تھی شعر فہمی کے ساتھ اردو میں فارسی شعر کے مفہوم کو ادا کرنے کا کتنا سلیقہ تھا۔ مثلاً۔

صفتِ آتش

آتش از انجا کہ بدل جائے کرد   دود برآمد زنفس ہائے سرد

یعنی چونکہ آگ نے دل میں جگہ کر لی ہے اس لیے ٹھنڈی سانس سے دھواں

---

(۱) ص، ۸۰

نکلتا ہے۔ یہ حسنِ تعلیل ہے کہ سردی کے سبب سے جو منہ سے بھاپ نکلتی ہے اس کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ دل میں آگ نے جگہ پیدا کرلی اور دل میں جگہ کرنا یہ محبت والفت سے ہے۔

"قصرِ نو و شہرِ نو"

یہ وہ قصر اور شہر ہے جو کیقباد نے کیلوکھڑی میں جمنا کے کنارے تعمیر کرایا تھا

آئینہ گشتہ زگچ صاف خشت ۔۔۔ دیدہ در صورت خود را بہشت

ہرچند کہ در آئینہ بیند جواں ۔۔۔ پیر دراں خشت بہ بیند ہماں

یعنی اینٹوں پر ایسا چونا گچ کیا گیا تھا کہ بہشت اس میں اپنی صورت دیکھتا تھا اور جو کچھ جوان آئینہ میں دیکھتا ہے بوڑھا آدمی ان اینٹوں میں دیکھ لیتا ہے۔

یہ ایک عام مثل ہے جس کو اس قصر کی اینٹوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ مثل یہ ہے۔ "آنچہ پیر در خشت خام بیند جوان در آئینہ نہ بیند۔ اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ تجربہ تو جھٹ پٹ بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہے اور ناتجربہ کار غور کرنے سے بھی نہیں سمجھتا۔

فیل

قلعہ آہن تنِ برگستواں ۔۔۔ قلعہ بجا مانندہ ستونش رواں

ہاتھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا لوہے کے قلعہ پر پاکھر پڑی ہے۔ قلعہ قائم ہے اور ستون یعنی ہاتھی کے پانو چلتے ہیں۔

خلعت

تن دراں خلعت روشن گرفت ۔۔۔ خوں یواقیت بگردن گرفت

(بادشاہ نے جب یہ خلعت زیب تن کیا تو یاقوتوں کا خون اس کی گردن پر تھا۔ یعنی یاقوت اس رشک سے خون ہو گئے کہ خلعت شاہی میں ہم کو جگہ نہ ملی۔ یا یہ کہ یاقوت جو گریبان میں ٹکے ہوئے تھے بادشاہ کے گردن کی سرخی دیکھ کر شرمندہ ہو گئے۔)

وصف نگاری کے علاوہ مولانا نے متفرق مقامات کے تحت مثنوی کی دوسری

خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً جوش و اثر، سوز و گداز، ایجاز، تشبیہ و تمثیل، حکمت و اخلاق، اسالیب بیان کی تازگی، صوفیانہ خیالات وغیرہ۔

مولانا نے آخر میں "صنائع و بدائع"، کا ذکر کیا ہے۔ اہتمام یہ کیا ہے کہ صنائع و بدائع کی تعریف کے ساتھ مثال بھی پیش کی ہے۔ طوالت کے خیال سے ہم مثالیں پیش نہیں کرنا چاہتے۔

مثنوی کے متعلق مولانا نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"پھر مثنوی میں محض قصہ گوئی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہر موسم اور اور اس کے لوازم کی تفصیل ہے۔ ہندوستان کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر ہے۔ دلی اور اس کی عمارتوں کا بیان ہے۔ یہ مضامین اہلِ ہند کے لیے قدرتاً موجبِ انبساط خاطر ہیں۔"

اصل قصہ بھی ہندستان کا ایک تاریخی واقعہ ہے اور حضرت امیر خسرو نے اکثر چشمدید حالات کو نہایت وضاحت سے نظم کیا ہے۔ اس لیے تاریخی حیثیت سے بھی وہ حالات قدر و وقعت کے قابل ہیں۔ چنانچہ بعد کے مورخین نے کیقباد کی سلطنت کے ذکر میں اس مثنوی کے اشعار سے اکثر واقعات کا استناد کیا ہے۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ تشبیہ و تمثیل کی ندرت، اسالیب بیان کی تازگی نئے نئے الفاظ کی کثرت اور سب سے بالاتر خسرو کا حسنِ بیان ہے جس نے اس مثنوی کو قبول عام کا خلعت پہنایا تھا۔ (۱)

تعلیم غوثیہ

تذکرۂ غوثیہ کی طرح تعلیم غوثیہ بھی ایک اہم تالیف ہے۔ ہم نے ہندستان کے مختلف اداروں اور لائبریریوں میں اس کی تلاش کی مگر دستیاب نہ ہوسکی۔ اس وقت حیات و کلیات اسمٰعیل میں مندرج بیان کی روشنی میں چند سطور پیش کی جارہی ہیں۔

---

(۱) ص ۱۶۴

تعلیم غوثیہ کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی اور وہ مولانا سید گل حسن شاہ کے نام سے چھپی تھی۔ قاضی محتشم الدین احمد نے جے اینڈ سنز برقی پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کی تھی۔

تعلیم غوثیہ میں صفحہ چار پر حمد درج ہے۔ اس نثر کا انداز مولانا اسماعیل کے اس انداز نثر سے ملتا ہے جو تذکرۂ غوثیہ میں صفحہ دو سے پانچ تک نظر آتا ہے اس کے علاوہ تعلیم غوثیہ میں صفحہ پانچ پر اشعار طبع ہوئے ہیں وہ کلیات اسماعیل کے پہلے ایڈیشن میں صفحہ ۸۳، ۸۵ پر شائع ہو چکے ہیں۔ تعلیم غوثیہ میں صفحہ ۸ و ۱۱ پر ایک نظم بعنوان وصف پیر کامل شامل ہے۔ یہی نظم کلیاتِ اسماعیل میں صفحہ ۸۵، ۸۹ پر "یادِ حضرت شیخ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مولف حیات وکلیات نے بیان کیا ہے۔

"تعلیم غوثیہ کی عبارت صرف اوّل پچاس صفحے تک مولانا نے درست کی تھی۔ جیسا کہ اس کے مسودے سے پتا چلتا ہے جو مولانا کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے اور اس سے مطبوعہ حصہ مطابقت رکھتا ہے۔" (۱)

ہم نے یہ مسودہ میرٹھ میں مولانا اسماعیل کی ذاتی لائبریری میں خود بھی دیکھا ہے۔

غیر مطبوعہ

حیات امیر خسرو (نامکمل وغیر مطبوعہ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "کلیاتِ خسرو" کی اشاعت اور امیر کی حیات چھاپنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ نواب محمد اسحاق خاں اس وقت مدرسۃ العلوم کے آنریری سکریٹری تھے۔ اس کام کے لیے حالی شبلی اور اسماعیل پر نگاہیں مرکوز ہوئیں۔ سید حسن برنی نے مثنوی قران السعدین کی تمہید میں لکھا ہے۔

---

(۱) ص ۶۷

"ملک میں ابھی تک وہ بزرگ موجود تھے جو ماضی کو سمجھتے اور اسے حال و مستقبل سے روشناس کر سکتے تھے۔ حالی، شبلی اور اسماعیل اس کاروانِ قدیم کے سالار راہ تھے۔"

اس زمانے میں حالی پیرانہ سالی سے معذور اور رہا برکاب تھے مولانا شبلی کا قلم ابھی تک ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا لیکن سیافِ اجل کمیں لگائے بیٹھا تھا۔ مولانا اسماعیل بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح آفتاب لب بام تھے۔ لیکن کمر ہمت چست باندھ کر منزل مقصود کی رہ پیمائی کے لیے آمادہ ہو گئے۔" (۱)

مولانا میرٹھی نے قران السعدین کا مقدمہ لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں وہ قواعد اردو مرتب کر رہے تھے۔ اس مضمون سے انھیں بیحد شغف تھا۔ لیکن امیر کے کام کو انھوں نے اپنی خواہش پر ترجیح دی اور نہایت لگن کے ساتھ کام شروع کیا اصلاً مولانا کے سپرد پہلے "حیات امیر خسرو" کی ترتیب کا کام تھا۔ مقدمہ مثنوی قران السعدین کا کام اس کے بعد ان کے سپرد کیا گیا جیسا کہ حسن برنی کے بیان سے ظاہر ہے۔

مولانا کی عمر کے آخری ڈھائی برس اس علمی مشغلہ میں گزرے۔ اس مدت میں قران السعدین پر مکمل تنقید لکھی۔ حیات خسرو کے لیے سارا مواد جمع کیا اور سوانح عمری کے چند اجزا ترتیب دیے جن میں معزالدین کیقباد کے اخیر عہد (۶۸۹ ھجری) تک خسرو کے حالات درج ہیں۔

مولانا میرٹھی نے "حیاتِ خسروی" کا کام ۱۹۱۶ء میں ترتیب دیا تھا۔ اور اپنی رحلت تک تصنیف کے حالات مرتب کر لیے تھے۔ اُنھوں نے حالات کی ترتیب کے لیے جو خاکہ بنایا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

---

(۱) تمہید مثنوی قران السعدین مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۱۸ء ص ۱

(۱) خسرو کی ولادت ۶۵۲ھ ہجری تھی کہ مومن آباد پٹیالی میں پیدا ہوئے۔

(۲) خسرو کے والد سیف الدین محمود اصل و نسب کے لحاظ سے ترک لاچین تھے اور قبیلہ لاچین کی ریاست ان کے بزرگوں سے چلی آئی تھی۔ ان لوگوں کا وطن و مسکن ہزارہ بلخ تھا یا بقول بعض ترکستان کا شہر "کش"، غرض یہ مرد باخدا دنیا کا امیر اور عقبیٰ کا ولی تھا شہادت کی بڑی تمنا تھی۔ خدا نے یہ تمنا بھی پوری کردی۔(۱) ایک معرکہ میں کفار کے ہاتھ سے شہادت نصیب ہوئی۔ ۷۰، یا ۸۵ سال کی عمر پائی۔ اس وقت خسرو کی عمر سات سال کی تھی(۲)

(۳) خسرو کے نانا ان کا اصلی نام تو معلوم نہیں۔ مگر امیر عماد الملک ان کا شاہی خطاب تھا۔ ایک سو تیرہ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے

(۴) خسرو کی والدہ دلی کے ایک مقتدر خاندان کی بیٹی تھیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس خاتون کا نکاح امیر سیف الدین سے اس وقت ہوا جب کہ وہ دلی میں تھے یا اس وقت ہوا جب کہ امیر موصوف نے پٹیالی کی بود و باش اختیار کرلی تھی۔

(۵) خسرو کی والدہ کا انتقال ۶۹۸ھ ہجری میں جب کہ خسرو کی عمر چھیالیس برس کی ہوگئی تھی۔ ان کی پیاری والدہ نے رحلت فرمائی اور اسی سال ان کے منجھلے بھائی حسام الدین احمد کو سفر آخرت پیش آیا۔ ان دونوں

---

(۱) اثنائے تحریر میں ایک بلخی سے ملاقات ہوئی۔ ہزارہ کی نسبت اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ نواح بلخ میں ایک کوہستانی خطہ ہے جہاں اب ترک آباد ہیں اور ہم لوگ اس مقام کو ہزارستان کہتے ہیں۔

(۲) باپ کے ماتم میں شعر موزوں کیا: سینہ از سرم گزشت و دل من دو نیم شد
دریائے من رواں شد و درّ یتیم ماند
باپ اُمّی تھے ۔۔ تمہید مثنوی قران السعدین، ص ۲

کا ذکر خسرو نے مثنوی لیلیٰ مجنوں میں کیا ہے۔ اول والدہ کا مرثیہ لکھا ہے۔

مرثیہ:

امسال دو نور ز احترام رفت ؛ ہم مادر و ہم برادرم رفت

یک ہفتہ ریخت خفتہ من ؛ گم شد دو مہ دو ہفتہ من

ہجرت زد و موکشید کینہ ؛ دہرم بدو تیر دوخت سینہ

(۶) برادران خسرو اعزالدّین علی شاہ ۔ حسام الدّین احمد

اگرچہ خواجہ اعزالدّین شاہ کا ذکر شعرا کے زمرے میں نہیں آیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخن سنج و سخن فہم تھے اور امیر خسرو ابتدائے عمر میں اپنا کلام شائع نہیں کرتے تھے جب تک کہ بڑے بھائی کی نظر سے نہیں گزرتا تھا۔

حسام الدّین احمد کا مرثیہ

از اوج وفا کبوتر پاک ؛ ہم کابک من از برج افلاک

(۷) ملازمت ملک چھجّو

(۸) ملک چھجّو سے قطع تعلق

(۹) شہزادہ بغرا خاں کی ملازمت

(۱۰) بادشاہ کی لشکر کشی لکھنوتی پر

(۱۱) خسرو بغرا خاں کے ہم رکاب

(۱۲) طغرل کا قتل

(۱۳) بغرا خاں کی تاج پوشی

(۱۴) میر حسن دہلوی حسن بن علا سنجری۔ خسرو کے نہ صرف ہم عصر بلکہ دلی دوست تھے اور دوست بھی ایسے کہ گویا یک جان و دو قالب۔ ابتدائے حال میں نان بائی کی دکان کرتے تھے۔ جب خسرو سے رابطہ

الفت ہوا تو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ لیکن اس وقت تک مرید نہیں ہوئے تھے۔

(۱۵) خسرو کا بچپن خسرو جیسے ذکی الطبع اور طوطی گویا کا زمانہ تعلیم یقیناً فطری اور تعلیم وتربیت قابلیتوں کے ظہور کا عجیب وغریب منظر ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ اس پر عالم خاموشی طاری ہے۔ مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات قلمبند کرنے میں نہایت کوتاہی کی ہے وہ ایک شاعر کا محض بیرونی خاکہ کھینچتے ہیں۔ اس کی تصویر کے خط وخال ہرگز نمایاں نہیں کرتے۔

(۱۶) خسرو کی عربی عربی زبان کے بھی جیّد عالم تھے اور کامل ادیب بھی۔ وہ اپنی نثر میں جابجا قرآن مجید کی آیتیں حدیثیں اور عربی کے جملے نہایت خوبی سے تضمین کرتے ہیں۔

یا عاذل العشاق دعنی باکیا ؛ ان السکوت علی المحب محرم

(او ناصح۔ تو مجھے رونے دے، چپ رہنا عاشقوں پر حرام ہے)

(۱۷) خسرو کی ہندی

(۱۸) پہیلیاں

(۱۹) انمل

(۲۰) ڈھکوسلہ

(۲۱) دو سخنے اردو

(۲۲) دو سخنے فارسی

(۲۳) موسیقی

(۲۴) لطیفہ

(۲۵) نقل

(۲۶) خسرو کی سنسکرت

(۲۷) خسرو کی شاعری کا آغاز

(۲۸) بچپن میں شعر کا شوق

(۲۹) بچپن کی رباعائیاں

(۳۰) ترقی استعداد اور مشق سخن

(۳۱) خسرو کی سخن سرائی قیام ملتان میں

(۳۲) معاصرین خسرو

(۳۳) محمد پسر خسرو

(۳۴) فارسی زبان کے وہ تذکرے جن میں امیر کا حال پایا جاتا ہے۔

(۱) دیباچہ غرۃ الکمال جس میں امیر صاحب نے اپنے حالات تحریر فرمائے ہیں۔
(۲) " وسط الحیات ایضاً ایضاً
(۳) " تحفۃ الصغر ایضاً ایضاً
(۴) بہارستان سخن، غالباً کوئی تذکرہ شعرا ہے
(۵) تذکرہ والہ داغستانی
(۶) مثنوی نہ سپہر ۷۱۸ھ ھجری بر اسم قطب الدین مبارک بن علاؤالدین
(۷) تاریخ بدایونی، اس سے اگر تاریخ ملا عبدالقادر بدایونی مراد ہے تو وہ موجود ہے اور اگر کوئی دوسری کتاب مراد ہے تو وہ بھی ہونی چاہیے۔
(۸) قران السعدین
(۹) تلج الفتوح مشتمل بر جمیع فتوحات جلال الدین خلجی از حضرت امیر خسرد۔
(۱۰) خزائن الفتوح مشتمل بر جمیع فتوحات علاؤالدین خلجی۔
(۱۱) افضل الفوائد ملفوظات حضرت شیخ نظام الدین اولیا از حضرت امیر خسرو۔
(۱۲) طبقات الشعرا قدرت اللہ قدرت
(۱۳) تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ
(۱۴) تذکرۂ عرفات
(۱۵) اعجاز خسروی۔ از حضرت امیر خسرو مشتمل بر سہ جلد (۲۶)
متضمن قواعد اصول نثر نویسی
(۱۶) مآثر الامرا، مطبوعہ کلکتہ
(۱۷) دواوین۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ لکمال مع دیباچہ حیات
(۱۸) ریویو از ڈاکٹر ریو، آر۔ آئی۔ اِی۔ دی
(۱۹) بقیہ نقیہ۔ از امیر خسرو۔
کلام ہیرانہ سالگی صفحہ (۳۱)
(۲۰) اخبار الاخیار شاہ عبدالحق محدث دھلوی

(۲۱) نہایۃ الکمال امیر خسرو" غزلیات " مرتبہ قطب الدین مبارک خلجی
(۲۲) مطلع الانوار - جواب مخزن الاسرار بہ نام سلطان علاؤ الدین خلجی ۶۹۸ھ
میں ختم ہوئی - بیان خسرو (۳۶)
(۲۳) خسرو شیریں - رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی -
(۲۴) آئینہ سکندری - از امیر بجواب سکندر نامہ نظامی -
(۲۵) دول رانی و خضر خاں عشقیہ از حضرت امیر - حالات تعلق خضر خاں و
دول رانی دختر راجہ گجرات
(۲۶) تغلق نامہ - حالات و فتوحات غیاث الدین تغلق
(۲۷) مناقب ہند - تاریخ وغیرہ
(۲۸) جواہر الاسرار - (آزری)
(۲۹) قصائد
(۳۰) اے اشپرنگر ایم - ڈی
(۳۱) خمسہ امیر خسرو
(۳۲) قصہ خضر خاں و دول رانی
(۳۳) قران السعدین
(۳۴) نور العین شرح قران السعدین
(۳۵) نام نسب
(۳۶) ولادت اور تربیت
(۳۷) سلطان بلبن کی بیماری
(۳۸) سلطان بلبن کی آخری وصیت
(۳۹) سلطان کی وفات اور کیقباد کی تخت نشینی
(۴۰) خسرو کے قصیدے، سلطان بلبن کی مدح
(۴۱) کیقباد کے حالات و اطوار

(۴۷) غرۃ الکمال
(۴۸) خان شہید کا مرثیہ
(۴۹) مرثیہ ترکیب بند
(۵۰) خان شہید کا دوسرا مرثیہ
(۵۱) خسرو اور حسن کا قول
(۵۲) خان شہید کی بیاض
(۵۳) خسرو حاتم کے دربار میں
(۵۴) شیر خاں
(۵۵) خسرو کی خانہ نشینی
(۵۶) شہزادہ سلطان محمد قاآن ملک کی ملازمت
(۵۷) شہزادہ کی مراجعت بجانب ملتان
(۵۸) خسرو اور حسن کی خدمات
(۵۹) احباب ایام صغر سنی
(۶۰) محمد مغل اور شہزادہ محمد خان کی شہادت
(۶۱) خسرو اسیر مغل ہوئے
(۶۲) تحفتہ الصغر

خسرو کی ولادت ۔ ولادت ۶۵۲ھ ہجری تھی کہ خسرو مومن آباد پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ امیر سیف الدین بچہ کو کپڑے میں لپیٹ کر ایک درویش مجذوب کی خدمت میں جو اسی نواح میں رہتا تھا لے گئے ۔ وہ دور سے دیکھتے ہی بولا ۔" بابا ۔ تو ایسے شخص کو لایا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا۔" مولانا شبلی مرحوم نے اپنی کتاب شعر العجم میں اس روایت کو قدیم خوش اعتقادی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور مجذوب کی پیش گوئی پر یہ ابزاد کیا ہے کہ " خاقانی کو خسرو سے کیا نسبت " اس روایت کی صحت کا دعویٰ تو ہم بھی نہیں کرتے ۔ ممکن ہے کہ موضوع

ہو لیکن مجذوب کی بڑ حقیقت سے خالی نہیں۔ مانا کہ خاقانی اور خسرو کے انداز میں کوئی مناسبت نہیں دونوں کی راہ وروش جداگانہ ہے مگر پیش گوئی کے الفاظ سے محض سبقت مُراد لی جائے تو کیا قباحت ہے۔ فارسی نظم کے بھی تین بڑے میدان ہیں۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی سو شعرائے عجم میں خسرو کے سوا کون ہے جس نے ہر ایک میدان میں علم شہرت بلند کیا ہو۔

اسماعیل میرٹھی کو حیاتِ امیر خسرو کے مکمّل کرنے کا موقع نہیں مل سکا اُنھوں نے اس کا خاکہ مرتّب کر لیا تھا اور خاکے کی ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام کو بڑے سلیقے اور محنت سے انجام دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے بڑی تعداد میں فارسی کے تذکروں اور دیگر تصانیف کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا نیز تاریخی کتب اور صوفیہ کرام کے ارشادات سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیق کی روشنی میں خسرو کی ولادت کا باب لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس مختصر تحریر سے اسماعیل کی نثر نگاری میں جامعیت سادگی اور استدلال کی خوبی کا پتا چلتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کتاب کو مکمّل کر لیتے تو اردو ادب میں ایک گراں مایہ تصنیف کا اضافہ ہو جاتا۔

مکتوب نگاری

خط لکھنا بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک آرٹ ہے۔ مکتوب نگاری کی تاریخ دوسرے اصنافِ نثر کی مانند خاصی پرانی ہے۔ اس کی ابتدا اسلطنت روما میں ہوئی۔ خط لکھنے کے لیے محض کاغذ و قلم درکار نہیں یہ تو کاتب کے آخری اوزار ہیں جیسے مصوّر کے لیے برش اور کینوس۔

ایک کوپل کی نشوونما کے لیے متعدد سہارے درکار ہیں۔ اسی طرح مکتوب نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے اور شاداب بنانے کے لیے چند چیزیں ناگزیر ہیں مثلاً مستحکم حکومت، بہتر اور وسیع معاشرت، سوشل لائف، علمی زندگی، جس میں خیال و عمل کی آزادی ہو۔ ذہنی رشتے، نرم دل، اخلاقی قدروں کا چلن اور

ایک ایسی ادبی زبان جو قابلِ لحاظ علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔

مکتوب نگاری کی ابتدائی منزل میں فنِ کتابت کے اصول بھی آغازِ کار کا اعلان کرتے تھے۔ اس دور میں بلاغت کے قواعد کی پابندی زیادہ تھی اس لیے کہ خواص کا ذہن زندگی کے بندھے ٹکے قوانین کا پابند تھا۔

خطوط کی تقسیم مبارکباد، تعزیت، پند و نصیحت، زجر و ملامت، تسکین و تشفی، تنبیہ، تجربہ، معلومات وغیرہ کے اعتبار سے کی جاتی تھی۔ زمان اور تعلقات بھی اس میں شامل تھے۔ ان کے القاب و آداب جداگانہ مقرر تھے۔ بات کی ابتدا انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ یہ نقوش نکھرتے گئے۔ دوسرے ممالک میں ان کی نوک پلک درست کرنے کا خیال بھی کارفرما رہا۔

انگریزی زبان میں مکتوب نگاری کا آغاز پندرھویں صدی میں ہوا۔ لیکن دو صدیوں کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ ان میں واقعاتی رنگ غالب تھا۔ اس کے علاوہ الفاظ کی بھرمار بھی نظر آئے گی۔

نشاۃ الثانیہ کے شروع میں اس فن کے قابلِ ذکر اشخاص ملتے ہیں۔ مگر ان کے خطوط میں ایک ہی موضوع مرکزِ توجہ تھا یعنی وعظ۔ ان میں ابدی حقائق کا تذکرہ ہوتا تھا۔ لیکن خوف کا جذبہ طاری کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال یہ خطوط نمونے کے خطوط ہیں

سترھویں صدی میں خطوط کی اہمیت ذرا واضح ہوئی۔ خطوط کے قدیم سرمائے پر نظر کی گئی۔ اطالوی خطوط کے ترجمے ہوئے۔ لیکن اسلوب میں فرق پیدا نہیں ہوا۔ انگلستان میں جیمز ہاول کو مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خطوط میں بھی میناکاری اور ادبی نفاست کا اہتمام ملتا ہے۔ بلاغت کی روایت ہمیں جان ہیرنگ کے خطوط میں بدلی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے یہاں بلاغت کم ہے زندگی کی ہل چل زیادہ ہے۔ اسلوب میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ سترھویں صدی کے آخر میں مکتوب نگاری زندگی کے مشاغل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ولیم کوپر معروف ادیب اور مشہور شاعر

گرے کی اہمیت سے کوئی انکار ممکن نہیں۔ خصوصاً گرے کی خط نویسی نے ایک نئی اور صحت مند راہ دکھائی ہے۔ عملی طور پر اس کی زندگی خلوص کے اوضاع و آداب کا جزو لازم تھی۔ مگر وہ اصولی طور پر انسانیت پرست تھا عام انسانوں کی اس کے دل میں قدر تھی۔ اس کی نگاہ میں عوام اجنبی نہ تھے۔ ان خطوط میں طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت پھول کی پتی سے رنگ اور خوشبو کی مانند ظاہر ہے۔ ان فنکاروں کے ذریعے خطوط کا دائرہ وسیع ہوا۔ انسانیت کے دوسرے رشتے مکتوب میں سمٹ گئے۔ چنانچہ ایک مکتوب نگار خاتون میری ارنلے مانٹیگ نے ایک اور قدم بڑھایا۔ بچوں کی تربیت کو اپنا موضوع بنایا۔ اپنی بیٹی کے نام دلچسپ خطوط لکھے ہیں۔ ان خطوط میں "تربیت اطفال" سے متعلق بیش قیمت نکات درج ہیں۔ موضوع میں وسعت ہے اور انداز بیان میں تازگی ہے۔ خطوط سے قاری کے ذہن کو خوشی میسّر آتی ہے۔ اب خطوط لکھنا معمولی رسم نہیں بلکہ معاشرت کے گوشوں کو اُجاگر کرنے کی ایک آسان صنف قرار پا گئی۔

رومانی دور میں چند کامیاب مکتوب نگار پیدا ہوئے۔ مثلاً چارلس کے خطوط ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اسلوب میں دھیما پن ہے۔ مگر اس کی تہہ میں جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے۔ رومانیت کا رمز پرور جادو ہے۔ خطوط کی سادگی بائبل کے اوراق کی یاد دلاتی ہے۔ مکتوبات میں شہری زندگی، تنہائی کا عیش، جاوید محبت کی کہانیاں، لطائف، موت کا رنگین تذکرہ ملتا ہے۔ اور ہر موضوع پر اس انداز سے لکھا ہے کہ زندگی زیادہ حسین نظر آتی ہے۔ انسانیت کی قدر بڑھتی ہے تمام انسان ایک جمہوریت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ انسان سے محبت ایک فریضہ بن جاتی ہے۔

رومانی دور میں مکتوب نگاری کا فن زندگی کے مختلف شعبوں کے افراد کو اپیل کرتا ہے۔ سیاست داں، نقّاد، مذہبی پیشوا، سبھی خط کو زندگی کا محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حسنِ اسلوب ہمیں کیٹس، شیلی اور بائرن کے یہاں ملتا ہے۔ خصوصاً

کیٹس کی مکتوب نگاری میں نظر ندرت اور نیرنگ کا ایک جہاں لہراتا ہے۔ کیٹس کے خطوط میں مکتوب الیہ ایک دل آویز شخصیت ہے۔ دل اور دماغ کی تازگی سچائی، سپردگی اور کیف و تاخیر کو خطوط میں سمو دیا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ کو خطوط لکھے ہیں۔ جہاں حسن و عشق کی فضا مکتوبات میں جاگ اٹھتی ہے۔ علمی اور عملی زندگی کے نقوش اور اس دور میں نمایاں طور پر واضح ہیں۔ مکتوب نگاری اب ایک قابلِ قدر اور دل آویز آرٹ ہے اور یہاں دوسری زبانوں کو کسبِ ضیا کا موقع ملتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری

انگریزی زبان کے خطوط کا سرمایہ قاری کے سامنے رکھا جائے اور اردو مکاتیب بھی تو یقیناً اردو مکتوب نگاری میں مقدار و معیار کے لحاظ سے کمی کا احساس پیدا ہوگا۔ لیکن اس کے منطقی اسباب ہیں جن کا تفصیلی ذکر اس موقع پر ضروری نہیں، اتنا لکھنا کافی ہے کہ خواص کی توجہ فارسی زبان و ادب پر رہی۔ ۱۸۳۵ء تک فارسی کو درباری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ فارسی خطوط کا سرمایہ محفوظ ہے رقعاتِ عالمگیری اور دوسرے مکاتیب کے مجموعے تکلف کا مرقع ہیں۔ القاب و آداب پڑھ کر ذہن کو ایک تکان محسوس ہوتی ہے۔ غلام احمد شہید، غلام غوث بے خبر اور قتیل وغیرہ سب کے مکاتیب کا یہی عالم ہے۔ لیکن اردو خطوط کا سرمایہ اتنا مایوس کن بھی نہیں۔ ہمارے نزدیک سادہ اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ماسٹر رام چندر، غالب اور سرسید سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اردو نثر نگاری میں ایک صحت مند روش اختیار کی۔ سرسید کے بیشتر رفقا نے ان کی تقلید کی اور بعض ادیبوں نے بلا واسطہ طور پر غالب اور سرسید کی تحریروں سے متاثر ہو کر اپنی نثر کو کارآمد بنایا۔

مکاتیب غالب اردو زبان کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اس چراغ سے بیشتر ادیبوں کے چراغ روشن ہوئے۔ آزاد، حالی، شبلی، اکبر اور

مہدی وغیرہ سب نے اپنے مکتوبات میں مرزا غالب سے نور و سرور حاصل کیا ہے اس صف میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام بھی آنا چاہیے۔ اردو ادب میں نقد و نظر کی یہ کمزوری رہی ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کی شخصیت کے ایک پہلو کو اتنا اُجاگر کر دیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے دوسرے گوشوں پر توجہ کرنے کا پھر کسی کو موقع ہی نہیں ملتا۔ مولانا اسماعیل کی بعض صلاحیتیں بھی اس محدود نظر کی شکار ہوئی ہیں اُنھیں بچوں کا سعدی کہنے کے بعد ریڈرز کو سراہا گیا اور ان کے دوسرے اوصاف پر کسی نے کچھ لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ہمارے نزدیک ان کی مکتوب نگاری بھی قابلِ توجہ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل کی مکتوب نگاری

مولانا اسماعیل میرٹھی نے اپنی شاعری اور نثر نگاری دونوں اصناف میں سرسیّد کے ذہن اور اندازِ تحریر کا اثر قبول کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے خطوط کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اور نہ ہی وہ محفوظ رہ سکے۔ ہمیں خطوط کا وہ سرمایہ دستیاب ہو سکا ہے جو اُنھوں نے اپنے بیٹے خان بہادر محمد اسلم سیفی کو لکھے تھے۔ یہ خطوط ۱۹۰۴ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ جو انگلینڈ کو اُنھوں نے اپنے بیٹے کے نام بھیجے تھے۔ ہر چند یہ خطوط باپ نے بیٹے کے نام لکھے ہیں اور کاروباری ہیں مگر ان سے اسلوب کے علاوہ مولانا کے ذہن، کردار، نظر، تجربہ، دہلی کی زندگی اور مولانا کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا مطالعہ کر کے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو مکتوب نگاری میں ان کی بھی اہمیت ہے۔

مولانا اسماعیل میرٹھی نے یہ خطوط ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۶ء کے دوران لکھے ہیں مولانا کے خطوط میں بھی چار صورتیں "القاب" کے طور پر مستعمل ہیں۔

(۱) عزیز من ۲۔ عزیز من سلمہ، ۳۔ عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ ۴۔ عزیز من زاد لطفہ،

خط کے آخر میں رسمی دعائیہ الفاظ نہیں ملتے۔ مولانا اسماعیل نے اپنے معاصرین سے بھی زیادہ سادگی اور بے تکلفی کو برتا ہے۔ مولانا نے ہر خط کے آخر میں صرف اپنا نام محمد اسماعیل، لکھ کر خط کو ختم کر دیا ہے۔

مولانا اسماعیل کو بچوں کی شخصیت سے لگاؤ تھا۔ پیار تھا۔ انگلینڈ کو بھیجے ہوئے خطوط میں ننھے منے بچوں کے مشاغل کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ ان کی قدرتِ مشاہدہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ان تصویروں میں وہ خلوص اور رنگ ہے کہ وطن سے دور مکتوب الیہ ان کو دیکھ کر اپنے گھر کی فضا میں خود کو محسوس کرنے لگے گا اور اس میں بچوں کے لیے پیار پیدا ہوگا۔ چند خطوط کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) "چھمی اس وقت صحن میں کھیل رہی ہے۔ کالی ٹوپی سر پر ہے اور جھاڑو کی سینکیں بکھیر کر چن رہی ہے اور جب جی چاہتا ہے باہر کو بھاگی چلی جاتی ہے۔"

(۲) سلیمہ بہت دنگا کرنے لگی ہے۔ تمہاری تصویر دیکھتے ہی پہچان لی اور خوب پیار کیا۔ لندن کے کھلونے اب پہنچے۔ وہ سلیمہ نے ایک ہی دن میں توڑ ڈالے۔"

(۳) بھائی تمہاری اس نجارتی رام کہانی نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ لکھتے لکھتے تھکا جاتا ہوں "گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو" پچھلے منگل کو میرٹھ سے آیا تھا آج پورے آٹھ دن ہو گئے خدا نے چاہا تو کل چلا جاؤں گا۔ سلیمہ مجھ کو جابجا ڈھونڈتی پھرتی ہوگی۔ رحمت کی گود میں چڑھ کر منشی جی کے گھر پہنچا کرتی ہے کہ میرے ابا بتا دو کہاں ہیں۔"

مولانا اسماعیل کو فطری منظر سے لگاؤ تھا۔ اُنھوں نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ موسم کا ذکر کیا ہے۔

(۱) آج خوب گھٹا ہے۔ اور سارے دن مینہ برسا۔ موسم اچھا ہو گیا۔ ظاہرا برسات شروع ہو گئی ہے اور اطراف سے بھی بارش کی

کی خبریں آرہی ہیں۔

تم نے پچھلے دو خطوں میں اپنی روانگی کا مہینہ ستمبر لکھا ہے۔ غالباً وہاں کے تجربہ کاروں سے معلوم کر لیا ہوگا کہ اس مہینے میں سمندر کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔"

(۲) پچھلے دنوں مینہہ برس کر ٹھنڈک ہوگئی تھی اب پھر گرمی زیادہ ہے۔ تم نے موسم کی کیفیت اور عام حالات وہاں کے کچھ نہیں لکھے۔"

ایک خط میں موسم کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے۔

موسم۔ تم لکھتے ہو کہ وہاں کا موسم سرد ہے۔ اگست اور ستمبر میں تو بہت سرد ہو جائے گا۔ گرم کپڑے ضرور کافی طور پہننے چاہییں۔ سردی بہت مضر ہوتی ہے۔ مگر جب سمندر میں سفر کروگے تو اچھا موسم ملے گا وہاں ضرور تحقیق کر لینا کہ ستمبر میں سمندر کی حالت کیسی ہوتی ہے

موسم اچھا ہے۔ شہر کی تندرستی اچھی ہے۔ البتہ دلّی میں ایک تو بخار کا چرچا ہے اور پلیگ کی بھی شہرت ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ سچ ہے یا گپ۔

(۳) جولائی میں اور اگست میں تو خوب بارش ہے نہ زیادہ نہ کم، موقع بموقع ہوئی کھیتی کی حالت بھی اچھی تھی۔ لیکن آٹھ دس روز سے بالکل نہیں برسا۔ پانی خشک ہوگیا اور دھوپ تیز ہوگئی پنجاب اور ملک گجرات میں بالکل نہیں برسا۔ قحط ہوگیا ہے۔ راجپوتانہ میں بھی نہیں برسا۔ البتہ پورب اور اودھ میں بارش زیادہ ہوئی ہے۔

انسانی نفسیات اور تجربات

(۱) پرسوں مولوی حالی صاحب "مخدوم صاحب" کے عرس میں مل گئے تھے۔ وہ بھی تم کو پوچھتے تھے۔

(۲) پروفیسر ضیاء الاسلام مسٹر آرنلڈ وغیرہ سے بھی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں خرچ کی زیادتی کی نسبت جو تم نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن یہ خرچ بار آور ہو تو ایسے خرچ سے ڈرنا نہ چاہیے۔ نہ تم نے لکھا اور نہ خود میری سمجھ میں آیا کہ لندن پہنچکر اور کپڑے کیوں بنائے۔ وہ ہندوستانی کپڑے ابھی تمہارے کام نہ آئے ہوں گے۔

(۳) کسی ڈیوک وغیرہ سے ملاقات نہ کرنا۔ اس میں خرچ بہت ہوتا ہے تمھارے پاس ویسے ہی خرچ تھوڑا ہے۔

(۴) گھبراہٹ۔ تمھارے خطوط سے ایک جلدی اور گھبراہٹ سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات اچھی نہیں اطمینان سے کام کرو اور جو بات لکھا کرو پوری لکھا کرو۔

(۵) بہرکیف بہت ہوشیار اور چوکنّے رہو۔ کسی کی ایمانداری پر اعتماد نہ ہونا چاہیے۔ جب تک کہ معاملات اس کو ایماندار ثابت نہ کر دیں اور گو کیسا ہی اعتماد ہو کام ضابطے کے موافق ہو۔ یعنی کوئی ایماندار بے ایمان بننا چاہے تو بھی نہ بن سکے۔

(۶) دہلی کے نرخ۔ تمھارے نمونوں کے داموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مین چیسٹر والے بھی دلّی والوں کی طرح دام بہت بڑھا کر بولتے ہیں۔

(۷) مین چیسٹر والوں نے جو زیادہ دام بتائے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو امید نہ ہو گی کہ یہ نئے آدمی ہیں نیا کام شروع کیا ہے ہمارے فریب میں آجائیں گے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ جن داموں پر مین چیسٹر دیتے ہیں اس سے سستا یہاں کپڑے والے دیتے ہیں۔ آخر اس کا کوئی سبب تو ہونا چاہیے یہ اس لیے لکھتا ہوں کہ وہاں کے سوداگروں سے ہوشیار رہو۔ بیشک یہ تجارت جلد بازی کا کام نہیں۔ بہت صبر اور محنت درکار ہے۔ کپڑے کی پہچان اور اپنے ملک کا نرخ جاننا بنیادی

اینٹ سمجھو جس کے بغیر عمارت نہیں بن سکتی۔"

(۸) ہندی پریس۔ ہاں ایک بات خوب یاد آئی۔ تم اپنے یہاں کے دفتر کے لیے اسٹیشنری وہاں سے لیتے آنا۔ یہاں تو کم بختی ہے کہ پریس والوں نے خط اُلٹے چھاپ دیے ہیں۔ لفافوں کی چھپائی آٹھ آنے سیکڑہ مانگتا ہے۔ ہم کو معلوم نہیں تم نے کیا دی تھی

مولانا نے ۵ر دسمبر ۱۹۰۶ء روز چارشنبہ دلّی سے ایک خط لکھا تھا۔ اس میں ایک انمول تجربہ ہے۔

(۹) سرمایہ۔ اگر کولمبیا سے معاملہ ہو گیا تو میرے خیال سے سب سے اہم مسئلہ سرمایہ کا ہے وہ کہاں سے ملے گا۔ اس کی نسبت سانول داس نے کہا کہ کل بابو پرتاپ نرائن نے مجھ سے کہا ہے کہ ۷۵ ہزار یا لاکھ تک کے حصہ دار تو میں بہم پہنچا دوں گا۔

خیر یہ کہنا ان کا دل خوش کن بات تو ہے۔ مگر اصلی اطمینان اُس وقت تھا کہ تم پہلے سے اس کا انتظام کر کے جاتے کیوں کہ اشتہار جنگ دینا اُسی وقت زیب دیتا ہے جب کہ سامان جنگ تیار ہو۔

ایک خط سے مولانا کی کفایت شعاری کے متعلق علم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض کرّ و فرّ اور ظاہری نمایش کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ہر چیز کا مصرف زندگی کی بہتری کے لیے کرتے تھے۔ مثلاً درج ذیل اقتباس دیکھیے۔

"تمہاری نئی ٹوپی اور مخملی انگرکھا جو بنوا کر لے گئے تھے کس کام آیا موقع لگے تو وہاں فروخت کر دو۔

مولانا اسماعیل کی کفایت شعاری، مستحسن حدود میں تھی وہ سماجی برتاؤ میں پیسہ کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی سماجی تقریبات میں خرچ کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دیتے تھے۔ "بڑے دن" کے موقع پر ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں۔

"بڑا دن"، اگر تمھارا قیام آخر سرما تک وہاں ہو تو چند تحائف مثل زر دوزی جوتی وغیرہ یا دلّی کا سوہن حلوہ، یا کوئی چیز سمجھ میں آئے ابھی سے لکھ دو۔ ان لوگوں کو دینا جن سے خصوصیت ہو۔"

اب ہم چند خطوط کی نقلیں پیش کر رہے ہیں تاکہ ان نمونوں سے مولانا اسماعیل کی مکتوب نگاری کا فن سامنے آسکے اور مکتوب نگاری میں ان کا درجہ متعیّن کیا جاسکے۔

خط (۱) ۲۶ر اپریل ۱۹۰۴ء بروز سہ شنبہ

تم لندن میں اپنے کالج کے طالب علموں سے اور مسٹر آرنلڈ سے تو ضرور ملے ہو گے۔ ان کے کتب خانہ کی بھی سیر کرنا۔ جو چیز دیکھو اور جہاں جاؤ اس کی کچھ کیفیت ضرور لکھنا۔ سمندر کا سفر سنا تو کرتے تھے کہ تندرستی کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ تم نے جو کیفیت لکھی تو میرا بھی جی چاہا کہ تمھارے ساتھ چلا جاتا۔ مگر خرچہ بہت پڑتا۔"

آج ایک خط سید مظفر الدّین سب لیفٹیننٹ پلٹن قلعہ گولکنڈہ حیدر آباد دکن کا آیا۔ اُنھوں نے تیسری چوتھی پانچویں کتاب میں اور توزک میں جو نظمیں دیکھیں تو بہت ہی پسند کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ کل کلام کا مجموعہ چھپا ہو تو بھیجدو نہ چھپا ہو تو چھپواؤ اور میرا نام بھی خریداروں میں لکھ لو۔"

خط (۲)

۲۷ر فروری ۱۹۰۶ء دلّی

عزیز من سلمہ، لکھنؤ سے نہ کل کوئی خط آیا تھا نہ آج آیا۔ البتہ آج نو بجے ایک تار تمہارا پہنچا تھا جو کل بجے وہاں سے روانہ ہوا تھا۔

خط لکھنا تو تمھارے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ تار اس لیے بھی بھیجنا چاہیے کہ روپیہ آٹھ آنہ روز بیہودہ طور پر جب تک خرچ نہ ہو تو عزت کیا ہو گی۔ تم کو اتنی سمجھ نہیں کہ ۱۲ بجے کا خط بھی لکھنؤ سے روانہ ہوتا تو اسی وقت پہنچتا جس وقت تار پہنچا اور بالفرض تار شام تک پہنچ بھی جاتا تو

ابتک اسوقت بلٹی مزور دیدیتا۔ تم ناحق لکھنؤ ٹھہرے مناسب تو یہ تھا کہ مینیجر کے ساتھ پھر کلکتہ چلے جاتے۔ تاکہ دلّی کی کوئی بات تمہارے کان تک نہ پہنچنے پاتی۔ آدمی کوئی کام اپنے ذمّہ لے تو اس کو پوری طرح سے کرے ورنہ محض ہوس اور حماقت ہے۔

مجھ کو خوب یاد ہے کہ ۲۳ ر کے خط میں تم کو یہ اطلاع دی تھی کہ کلکتہ سے ریکارڈ تھوڑے آئے ہیں نوچندی قریب ہے۔ اب تو نوچندی تک شاید ہی پھر آسکیں۔ لیکن تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا نہ یہ لکھا کہ کیا انتظام کیا یا، تجویز کلکتہ کے مینیجر سے کی بلکہ کیا تو یہ کیا کہ چپکے سے لکھنؤ میں بیٹھ رہے۔ اتوار کی شام کو تمھارا تار تھا کہ ایک ہفتے کے واسطے اور ٹھہرا ہوں تو کم سے کم یہ ہفتہ اگر آگے کو نہ بڑھاؤ تو ۹ ر مارچ کو ختم ہوگا۔ اس وقت نوچندی میں مال روانہ کرنے کے ۱۱، ۱۲، روز باقی رہ جائیں گے۔ اب ہم کو بھی دیکھنا ہے کہ اس ۱۱، ۱۲ روز میں تم کلکتہ سے ریکارڈ منگالوگے۔ خدا جانے تم کس خواب خرگوش میں رہتے ہو۔ یہ ریکارڈ جو بالفعل آئے ہیں نوچندی جانے تک یہیں دلّی میں ختم ہو جائیں گے۔ رہی مشینیں ان میں بھی چھوٹی قریب ختم کے ہیں۔ بس ۱۱۲ والی مشین نوچندی میں لیجا کر رکھدینا خوب بکری ہوگی۔

اسوقت کلکتہ سے تار آیا ہے۔ جس میں لکھا ہے (وکٹر ہس لینڈ ہاؤ میسی یور ریکوائرز) اب اس کی نقل احسان بذریعہ تار کے تمھارے پاس بھیج رہا ہے۔ اب وہاں سے پھر تار یہاں کو دینا کہ لتنے کا آرڈر بھیجو یا یہ جواب کہ یہ نہایت عمدہ انتظام ہے۔

کل میں نے لکھدیا تھا کہ حبیب میریا بیرسن کے ہاں ریکارڈ آئے ہیں۔ آج پھر معلوم ہوا کہ یہ ریکارڈ علی گڑھ سے آئے ہیں۔ اور یہ خبر قریب یقین ہے کہ علی گڑھ سے آئے۔ یکا مدار جوتے بن کر آنے والے ہیں

پہلے جوتے گئے تھے اُن کا نتیجہ کچھ معلوم نہ ہوا۔ اب یہ اور کھیپ بھیجے جا دیں یا نہیں۔

یہ نہ معلوم ہوا کہ قالین جو لکھنؤ گئے تھے وہ بکے یا نہ بکے۔ نہ بکے ہوں تو ایک کو ضرور اپنے ساتھ لیتے آنا۔ نوچندی کے موقع پر ضرورت ہوگی۔ اور ایک بڑا سا خاصدان جسکے واسطے پہلے بھی لکھ دیا ہے اب تک یہ بھید نہیں کھُلا کہ تم لکھنو میں کس غرض سے ٹھہرے ہو۔

"ایک غیر مطبوعہ تحریر

مولانا محمد اسماعیل کو علی گڑھ یونیورسٹی اور سر سیّد کی ذات سے بڑی وابستگی تھی۔ اسی کے ساتھ علی گڑھ میں مولانا کے علم و فن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا شعبۂ علمیہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یعنی انجمن ترقی اردو کے قواعد و ضوابط میں ایک شق یہ تھی۔

"وہ نامور اربابِ قلم و صاحبانِ علم و فن انجمن کے ارکان شوریٰ قرار دیے جائیں گے۔ جن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے کوئی کتاب بغرض اظہار رائے یا دیگر امور متعلقہ انجمن مشورتاً پیش کیے جائیں اور وہ اس پر اظہارِ رائے اور مفید مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔" (۱)

فہرست ارکان شوریٰ انجمن ترقی اردو میں حسب ذیل نام درج ہیں۔

مولوی ابو الکلام آزاد ایڈیٹر الہلال کلکتہ۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پی۔ ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا، پروفیسر فلاسفی گورنمنٹ کالج لاہور، مولوی فضل الحسن صاحب، سابق ایڈیٹر اردوے معلّی علی گڑھ۔ مسٹر محمد علی ایم اے آکسن ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد دہلی۔ جناب دیا نرائن نگم، اڈیٹر رسالہ زمانہ و اخبار آزاد کانپور۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی، اڈیٹر دلگداز لکھنؤ۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اے (علیگ) ایڈیٹر

---

(۱) رپورٹ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۶ء ص ۳، اورنگ آباد، دکن

زمیندار لکھنو ۔ خان صاحب مولوی محمد اسماعیل صاحب بالائے
کوٹ مشائخان میرٹھ ۔" (۲)

مولانا اسماعیل انجمن کی مجلسِ شوریٰ کے رُکن تھے ۔ اس کے علاوہ انہیں سرسیّد کے رفقا سے لگاؤ تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بھی ان کی دلچسپی رہتی تھی علی گڑھ میں سرسیّد کے بیٹے مسٹر محمود کو محمڈن کالج کا سکریٹری منتخب کرنے کے سلسلے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ اس معاملے پر اخباروں میں بھی اظہارِ خیال ہونے لگا تھا۔ مولانا اسماعیل نے نہایت صداقت کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کو مسوّدہ قانون ٹرسٹیاں مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قلم بند کیا ہے ۔ مولانا کی اس تحریر میں قوتِ استدلال کے ساتھ معیاری نثر کا نمونہ ملتا ہے ۔ ہمیں یہ غیر مطبوعہ تحریر مولانا کے کاغذات میں میرٹھ سے دستیاب ہوئی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

مسوّدہ قانون ٹرسٹیاں مدرستہ العلوم علی گڑھ

آج اودھ اخبار کی تار برقی خبریں پڑھ کر جو ورق اُلٹا تو عنوان بالا نظر پڑا ۔ ہم کو تو آج کل اس عنوان کی چاٹ لگی ہوئی ہے ۔ کسی اخبار میں ہو حرفاً حرفاً پڑھ لینا ضروری ہے ۔ اسی لیے ہم نے نہایت شوق سے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ نفسِ مطلب کے میدان میں آنے سے پیشتر مضمون نگار نے بیان کیا ہے کہ " نہ ہم ایسے نہ ہم ایسے وغیرہ ۔"

اس خبر نے ہم کو متوقع کیا تھا کہ غالباً وہ مولوی حالی کی تحریر پر ریویو کرنے والے یا صورتِ واقعات کو زیادہ وضاحت سے سمجھانے والے اور بہترین نتائج کی طرف قوم کی رہنمائی کرنے والے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کڑکتا گرجتا ہوا طوفان اوپر ہی اوپر گزر گیا ۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ برسی ۔

جب مضمون نگار کو ایسی شرم اور اتنی جھجک ہے کہ وہ صاف بات

---

(۲) ص ۲۸

زبان پر نہیں لا سکتا تو کیوں اُس نے اپنی بزدلی اور زنانہ پن کو ظاہر کرنے کے لیے اودھ اخبار کے سات کالموں کا مُنہ کالا کیا بہتر تھا کہ وہ اپنی زبان بند رکھتا۔

انصاف یہ ہے کہ مولوی حالی نے جو کچھ لکھا ہے نہایت صاف دلی اور دلیرانہ طور پر کہا ہے۔ اس میں لاگ لپیٹ کی بو نہیں۔ جو حقیقت معاملات اور جو ذخیرہ معاملات ان کے دل میں تھا وہ ان کے لفظوں میں جوش مار رہا ہے۔ اسی طرح مولوی نذیر احمد صاحب نے بھی جو ان کے دل میں تھی بے کھٹکے کہہ دی۔ ان کی عبارت سے مطلب جھلک رہے ہیں اور ہم نہایت ممنون ہیں کہ ان حضرات کی صاف و سنجیدہ تحریرات نے کیفیت واقعات کے سمجھانے میں قوم کے دلوں پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے۔

چونکہ یہ ایک قومی معاملہ ہے۔ اس لیے ہر فردِ قوم کا حق ہے کہ وہ اس پر غور کرے اور جو کچھ اس کے نزدیک حق ہو صاف صاف کہے چناں چنیں سے کیا حاصل۔ نہ ہم ان کے طرفدار نہ ان کے جانبدار نہ اُن سے واسطہ نہ ان سے رشتہ کچھ کم ہے کہ وہ لوگ ہماری قوم کے بزرگ ہیں۔ قوم کی پشت پناہ ہیں قوم کے مہر و ماہ ہیں موجب افتخار اور باعث اعتبار ہیں اگر سر سیّد اور مولوی میں کچھ رنجش ہے تو ہونے دو۔ آدمیوں ہی میں رنجش ہو جاتی ہے۔ تم اصل معاملے کو سوچو اور اس پر رائے دو۔ اگر تم کو خاص اس امر کی نسبت جو زیر بحث ہے کوئی عیب سیّد کی بات میں معلوم ہو تو علانیہ کہو۔ اگر مولوی کی بات نامناسب معلوم ہو تو بے خوف و بے دھڑک بول اُٹھو۔ مگر جو کچھ کہو آدمیّت سے محبّت سے، نیک نیتی سے، صفائیِ قلب سے صدق دلی سے کہو۔ اگر ایسا دل رکھتے ہو تو خدا اور رسول کی نسبت بھی کہہ سکتے ہو کوئی گناہ نہیں

ہے۔ جب تم سچے دل سے اپنا شبہ رفع کرنا چاہو اور یہ سوال پیش کرو کہ رسول خدا نے یہ بات کیوں کی ؟ خدا نے آسمان کیوں بنایا ؟ زمین کیوں پیدا کی ؟ ۔ ہاں یہی باتیں تم کو ڈبو دیں گی اگر نفاق سے بدطینتی سے، دو دلی سے کہو گے۔ ہم کو آج تک نہ معلوم ہوا کہ جو لوگ مسٹر محمود کے سکریٹری ہونے سے مخالفت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کیا ناقابلیت اس کام کے لیے ان میں دریافت کی ہے۔ ہم کو کچھ سروکار نہیں کہ مسٹر محمود جب پلنگ پر سوتے ہیں تو سرہانہ شمال کو ہوتا ہے یا جنوب کو ہم کو کچھ غرض نہیں کہ جب وہ کھانا کھاتے ہیں تو ہر نوالہ پر بسم اللہ بھی پڑھ لیتے ہیں یا نہیں۔ ہم بزاز سے کپڑا اور بنیے سے غلہ خریدتے ہیں تو کپڑے اور غلے کو دیکھتے ہیں اس کی نسبت سے معاملہ کرتے ہیں نہ یہ کہ بزاز کی ناک کیسی ہے اور بنیے کی آنکھ کیسی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کے پیچھے پڑیں تو خدا حافظ ہے۔ ہم کو چاہیے کہ اپنا بندھنا بوریا باندھ کر اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔

صاحبو! تم ان سے ایک انسٹی ٹیوشن کا کام انتظام کرانا چاہتے ہو یا خانقاہ کا۔ اگر دوسرا امر مقصود ہے تو بیشک تم سچے اور پھر سچے بلا لو کسی حافظ یا مُلّا کو وہ نہایت عمدہ متولی تمھاری خانقاہ کا ہوگا۔ ہاں اگر محمڈن کالج کی کشتی کا ناخدا ڈھونڈتے ہو تو رات میں ڈھونڈو خواہ دن میں شمع جلا کر تلاش کرو خواہ گیس یا برقی لیمپ کی روشنی میں جستجو کرو۔ ہندستان میں مسٹر محمود سے بہتر کوئی شخص اس کام کے لیے نظر نہیں آتا۔

مولوی سمیع اللہ خاں، نواب محسن الملک، نواب انتصار جنگ، یہ سب بزرگوار قوم کے افتخار ہیں عالم ہیں، مدبر ہیں، خیرخواہ قوم ہیں، روشن دماغ ہیں۔ عالی خیال ہیں ان کو ایک صوبہ کا گورنر

کردو، ایک وسیع ملک کی حکمرانی سونپ دو۔ یہ ان کی لیاقت و قابلیت کا ادنیٰ پایہ ہوگا۔ مگر کلام اسی میں ہے کہ وہ ایک اعلیٰ کالج کی رہنمائی کے لیے کیسے ہیں۔ ہاں ایسے ہیں جیسے باورچی خانہ کا داروغہ، ایک انجینیر یا عمارت کا مہتمم، ایک درزی یا دکلا کا افسر ایک سپاہی۔ کچھ شک نہیں کہ سب بزرگوں نے کالج کی خدمات کی ہیں اور خوب کی ہیں۔ قوم کی گردن ان کے بارِ احسان سے ہمیشہ جھکی ہوئی رہنی چاہیے مگر سکریٹری کا عہدہ ان خدمات کا صلہ نہیں ہو سکتا نہ وہ خدمات سکریٹری کے کاموں کی تمثیل و نظیر ہو سکتے ہیں۔

سکریٹری فی الحقیقت کالج کے یورپین اسٹاف کا ملجا وماوا، ملاذ و معاذ آقا و خداوند ہوگا تو خود انصاف کرو کہ وہ کیسا ہونا چاہیے۔ ایک مولوی ایک رئیس جاٹ کے گھر پڑھاتا ہے۔ جاٹ کوئی گنوار آدمی نہیں ہے معاملہ فہم ہے۔ کارو بارِ عدالت سے واقف ہے چند گانوؤں کا مالک ہے۔ لوکل بورڈ کا ممبر ہے۔ سرکار دربار میں اس کی عزّت ہے۔ مگر اس مولوی کے کام سے محض نابلد ہے۔ ہم تو اس مولوی سے یہی جھینکنا سُنتے ہیں کہ کسی قدر دان کی نوکری ملے تو کم تنخواہ پر بھی منظور ہے تاکہ وہ میرے کام کو بھی دیکھے اور سمجھے کہ میں نے لڑکوں کو کیا پڑھایا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب کی یہ خواہش انوکھی نہیں بلکہ طبعی ہے۔ ہر پرنسپل اور ٹیچر کی یہی خواہش چاہیے۔ یہ عجیب فقرہ بھی اکثر کہا گیا ہے کہ مسٹر محمود نے کون سی قومی خدمات کی ہیں۔ کون سے کارِ نمایاں کیے ہیں کہ وہ سکریٹری بنائے جاتے ہیں۔ سکریٹری شپ کے لیے کچھ ضرورت نہیں ہے کہ قومی خدمات کا امتحان پاس کیا ہوا شخص مطلوب ہو۔ اور اگر یہی ضرورت ہے تو بھی مسٹر محمود کچھ ہی پیچھے

ان لوگوں سے ملیں گے جن کا نام لیا جاتا ہے۔ کیا مسٹر محمود نے کبھی قومی فائدے کے لیے اوروں کی طرح اپنی کمائی کا پیسہ صرف نہیں کیا مسٹر محمود نے اوروں کی طرح کالج کی کچھ خدمت نہیں کی۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ مسٹر محمود کو اگر موقع اور لوگوں کی طرح ملتا تو اوروں سے زیادہ اوروں سے بہت عمدہ طور پر قوم کی بھلائی کا کام کرتے ابھی ان باتوں کی نوبت کہاں آئی ہے اور جس بات کا موقع ملا ہے تو دیکھ لو کہ کس لیاقت اور خوبی سے قومی کام کیا ہے۔ اگر آج شریعت اسلامیہ کے ائمہ اور مجتہدین میں سے کوئی زندہ ہوتا تو ان حقائق کی داد دیتا جو اس علامۂ عصر کے دماغ نے شرع محمدی کی بحث میں ظاہر کیے ہیں۔

متفرقات

کلامِ شیفتہ پر سرسری نظر

کلیاتِ شیفتہ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا نواب محمد اسحاق خاں سکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ کی فرمایش پر اس کو مرتب کیا گیا تھا۔ کلیات میں ایک مقالہ شامل ہے جس کا عنوان ہے "کلامِ ریختہ پر ایک نظر" مؤلف "حیات و کلیات اسماعیل" کا بیان ہے کہ مقالہ مولانا اسماعیل کے قلم کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اظہار شکایت کے انداز میں کیا ہے۔

"کلیات شیفتہ ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا ہے۔ اس پر صفحہ ۵۹ سے صفحہ ۹۰ تک جو مقالہ "کلامِ ریختہ پر ایک نظر" کے عنوان سے چھپا ہے یہ مولانا کے قلم کا نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کلیاتِ شیفتہ میں اس امر کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مسوّدات کے دیکھنے سے اس بات

کا پتا چلتا ہے کہ یہ مسوّدات بھی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کے تحریر شدہ ہیں" (۱)
ہم نے کلیات شیفتہ کا مطالعہ کیا۔ نظامی بدایونی مذکورہ مقالہ کو اپنا ریویو بتاتے ہیں اور انھوں نے دو مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔

"ہم نے اس سوانح عمری کے آخر میں ان کے اردو اور فارسی کلام پر جو مختصر ریویو اور دیگر شعرا کے کلام سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ خود ناظرین کو اس کے مطالعہ سے حسرتی کے کلام کا پایہ معلوم ہو جائیگا۔" (۲)

نظامی بدایونی نے اس کے بعد صفحہ ۴۳ پر درج کیا ہے۔

"اس مختصر سوانح عمری کے ذیل میں شیفتہ کے کلام پر ریویو کی گنجایش نہیں نکل سکتی۔ اس لیے ہم اس سوانح عمری کے آخر میں ان کے کلام پر ایک نظر ڈال کر تصوّف، پند و حکمت، حُسنِ معنی، شوخی ظرافت وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ مثالیں ناظرین کے سامنے پیش کریں گے جس سے وہ خود شیفتہ کی قادر الکلامی کا اندازہ کر سکیں گے۔" (۳)

نظامی بدایونی نے صفحہ ۵۸ تک شیفتہ کے حالات اور کلام کے بارے میں لکھا ہے۔ آخر میں ان کا نام اور تاریخ ۲۲ر نومبر ۱۹۱۵ء درج ہے۔ اس موقع پر نظامی نے (صفحہ ۴۰ تا ۴۳) کلام ریختہ عنوان قائم کر کے شیفتہ کے محاسنِ شاعری بھی بیان کیے ہیں۔ میر کے اندازِ بیان اور تراکیبِ مومن و غالب کی شیفتہ کے کلام میں نشاندہی کی ہے اور مثال میں اشعار پیش کیے ہیں۔ اس مقام پر یہ چیز چونکا دینے والی ہے کہ نظامی بدایونی نے جداگانہ طور پر دوبارہ کلام ریختہ پر ایک نظر پیش کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ اگر تفصیل مطلوب تھی تو نظامی

---

(۱) حیات و کلیات اسماعیل، صفحہ ۱۰۸ (۲) کلیات شیفتہ و حسرتی نظامی بدایونی ۱۹۱۶ء صفحہ ۴۰ (۳) کلیات شیفتہ و حسرتی۔ صفحہ ۴۰

بدایونی کا نام اور تاریخ بھی آخر میں یعنی صفحہ ۹۰ پر ثبت ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اصولاً قابلِ غور ہے کہ نظامی بدایونی نے کلامِ ریختہ کے تحت صفحہ ۴۰ تا ۴۳ آٹھ جگہ لفظِ شیفتہ استعمال کیا ہے۔ مگر کہیں کوئی کلمۂ تکریم اس سے پہلے نہیں لگایا گیا۔ اس کے برخلاف کلامِ ریختہ پر ایک نظر" کے ضمن میں چار جگہ لفظِ شیفتہ کا اعادہ ہوا ہے اور ہر مرتبہ حضرت شیفتہ لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ سُراغ ملتا ہے کہ ان سطور کو رقم کرنے میں کسی دوسرے ذہن نے کام کیا ہے۔ قطع نظر اس کے نواب محمد اسحاق خان نے مقدمہ مثنوی قران السعدین اور حیات امیر خسرو لکھنے کا کام مولانا اسماعیل کے سپرد کیا تھا۔ لہٰذا یہ بات قرین قیاس ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے کلام پر اظہارِ خیال کے لیے مولانا اسمٰعیل سے رجوع کیا ہوگا۔

اس ریویو کا ڈھنگ پرانے انداز کا ہے۔ شیفتہ کی غزل میں قطعہ بند اشعار کی تلاش کی گئی ہے۔ اس کے بعد چند عنوانات قائم کر کے کلامِ شیفتہ کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے اور مثال میں بڑی تعداد میں اشعار درج کیے ہیں۔ عنوانات میں طرزِ مومن خانی، تصوّف، پند و حکمت، حُسنِ معانی، شوخی و ظرافت اور محاورہ بندی شامل ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کلامِ شیفتہ میں تصوّف کے رموز و نکات کی نشان دہی کی گئی ہے اور صوفیۂ کرام کی اصطلاحات کو واضح کیا ہے مثلاً :-

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے | مینا اُٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

اس شعر میں محض شاعرانہ شوخی ہی نہیں بلکہ ایک پہلو تصوّف کا بھی ہے یعنی مینا سے وہ اذکار و اشغال مُراد ہیں جو سالکان طریقت کے ذوق و شوق و وجدان کو بڑھاتے ہیں اور ان اشغال کا وقت قبل از نماز صبح ہے ۔

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی | کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز

(برق سے تجلیاتِ جلال و جمال مُراد ہیں اور خار و خس سے تعلقات کونی)

جو بات میکدے میں ہے یک یک زبان پر | افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

میکدہ یا میخانہ سے حلقہ مردانِ خدا مُراد ہوتا ہے اور میکش سے سالک اور مے دبادہ سے کیفیاتِ قلبی)

غرض اس مختصر ریویو سے مولانا اسمٰعیل کی فکر و نظر کا پتا چلتا ہے۔ مولانا اسماعیل نے ۱۸۸۶ء میں منشی ذکاءاللہ کی کتاب "مبادی الانشا" پر حسب ذیل ریویو لکھا ہے۔

"جناب منشی صاحب موصوف ہمارے زمانہ کے امام المصنفین اور رئیس المترجمین ہیں۔ ان کی تالیف و تصنیف اور ترجمہ نے جو فائدہ اس ملک کو پہنچایا وہ بلا مبالغہ بے نظیر و بے مثال ہے۔ نئی ناتی ہیں کون ایسا طالب علم ہے جو ان کی لاجواب تصنیفات سے بہرہ مند نہ ہوا ہو۔ کیا مبتدی اور کیا منتہی علما کے کتب خانہ دونوں کو ان کی تصانیف افادت آیات سے افتخار اور اعزاز حاصل ہے۔ اس ذی کمال مصنّف کے طبع وقار نے اردو زبان کو سیراب و مالامال کرنے میں وہی کام کیا ہے جو دریائے گنگ شمالی میدان ہند کی سرسبزی کے لیے کرتا ہے۔ اصول فروع ریاضیہ کا ایک وسیع سلسلہ فزیکل سائنس کا ایک جامع صحیفہ تاریخ وجغرافیہ کے مجلد، یہ ایسا عجیب اور بیش بہا ذخیرہ کارآمد علوم وفنون کا ہماری مفلس زبان کو ان کی بدولت حاصل ہوا کہ یہ زبان بھی دُنیا کی مہذب زبانوں کو مُنہ دکھانے کے قابل ہو گئی۔ ہمارے فنون ادبیہ بھی اس بات کے محتاج ہیں کہ کوئی ایسا حکیمانہ طبیعت کا عالم وفاضل ان میں از سرِ نو جان ڈالے۔ خدا کا شکر ہے کہ جناب منشی صاحب نے اس علم کی تہذیب وتکمیل کے لیے قدم اُٹھایا۔ غالباً پہلی تصنیف یہی "مبادی الانشا" ہے جو اس وقت میرے ہاتھ میں موجود ہے۔ فی الحال حصّہ اوّل ۲۰×۲۶ کا کاغذ کے ۱۵۶ صفحہ میں

طبع ہوا ہے۔ جس کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ باقی تین حصّوں کا وعدہ
کیا ہے۔ اس نادر کتاب کی غرض تالیف یہ ہے کہ مڈل اسکول کے
طلبہ کو زبان دانی کی علمی استعداد (خصوصاً فنِ انشاپردازی) کا
ملکہ حاصل ہو۔ جس میں وہ اب تک نہایت ناقص ہیں۔ اگرچہ
عموماً اس نقص کا الزام سرکاری مدارس کے معلّموں اور طالبعلموں
کی گردن پر رکھا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس معاملے میں شاگرد
اور اُستاد دونوں معذور تھے۔ لیکن ہنوز اس فن کے آداب و
قواعد اور ضوابط آئین جس سے باقاعدہ تعلیم اس انشاپردازی
کی ہو سکے۔ جس کی حاجت موجودہ زمانہ میں ہے۔ ہماری زبان میں
مثل اور مہذّب زبانوں کے موجود نہ تھے۔ اب ہم اپنے ملک کے
طلبہ اور معلّموں کو بلند آواز سے مبارکباد دے سکتے ہیں کہ ایک
نامور عالم کے زورِ قلم اور مخزن العلوم طبیعت نے عین وقت
پر یہ احسان کیا کہ ایک ایسی مفید کتاب تالیف فرمائی جو معلّم اور
طلبہ دونوں کی راہ بری کرے گی۔ انشاپردازی اور مضمون نگاری
کے باب میں ہمارے طلبہ کا حال اب تک بالکل ایسا تھا جیسے قطب
نما کے ایجاد سے پیشتر جہاز رانی کی کیفیت تھی۔ اب ان کو اس کتاب
کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ایسے اسباب و وسائل موجود ہیں
جن کی بدولت وہ انواع انشا کے وسیع و عمیق سمندروں کو طے
کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ آغاز کتاب میں وہ ہدایات اور طریقے
بیان کیے گئے ہیں جن کی رعایت طالب علم کو ہر جواب میں
ضروری اور لابدی ہے۔ پھر سات فصلوں میں یہ رسالہ تقسیم کیا
گیا ہے۔ فصل اوّل میں علم ادب کی تعریف اور اس کا موضوع
اور اس کے اصول و فروع کا ذکر ہے۔ علم لغت کا تذکرہ سرسری

طور پر کیا گیا ہے اور اس کے مبادی و اصول اور اس کے اصطلاحات کا بیان شاید اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ اس فن میں جداگانہ کتابوں کی تالیف کا وعدہ جناب مؤلف نے فرمایا ہے۔ فصلِ دوم میں صرف و نحو کی تعلیم کا انداز اور جملوں کی تالیف یعنی کمپوزیشن کی عمدہ مشقیں طالب علموں کو حل کرنے کے واسطے دی گئی ہیں جن سے فنِ صرف و نحو میں بڑی بصیرت حاصل ہوگی۔ بشرطیکہ معلم اپنے اوپر محنت گوارا کریں اور اس کی تمثیل توجہ کیا تھا کہ ایک اس موقع پر جناب منشی صاحب نے صرف و نحو کے موجودہ رسائل میں سے دو کے پڑھانے کی سفارش کی ہے۔ ایک تو جناب محمد احسن صاحب کی قواعد اردو اور دوسرے پنجاب کا رسالہ صرف و نحو مجھ کو اس انتخاب سے چنداں اختلاف نہیں۔ لیکن موقع ملا تو بالضرور یہ التماس کروں گا کہ کتاب لغت کے ساتھ صرف و نحو کو بھی وعدہ تالیف میں شامل فرمائیے۔ کیوں کہ میری ناقص رائے میں اس کی حالت بہ نسبت لغت کے زیادہ تر ردّی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ایک عالی کالج کے معزز پروفیسر کو ان دقتوں سے آگاہی نہ ہو جو ادنیٰ اور متوسط درجہ کے مدرسین کو ان کتابوں کے پڑھانے میں پیش آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسوقت تک صرف و نحو کی جو کتابیں اردو زبان کے لیے تالیف و تصنیف ہوئی ہیں۔ اُن کے دو ماخذ ہیں۔ عربی کے عالم فاضلوں نے تو بالکل عربی صرف و نحو کا ترجمہ کیا ہے اور انگریزی دانوں نے انگریزی گریمر کا۔ لیکن دونوں پر یہ مصرع صادق آتا ہے۔ ایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است۔ دونوں میں سے ایک کا رُخ بھی ٹھیک اس طرف نہیں ہے۔ جس سمت کو خود اردو زبان کی رفتار۔ ان مؤلفوں نے فہم و درایت کو کام نہیں فرمایا

بلکہ تقلید محض کی ہے۔ عربی کا عالم تو اُسی تقسیم و تعریف اور تقدیم و تاخیر کو واجب سمجھا ہے، جو کلمات عربی کے اشتقاق و اعراب سے مخصوص ہیں وہ لفظ واسطے کو حرفِ جار اور یعنی کو حرفِ تفسیر اس بنا پر کہتا ہے کہ عربی کے حرف کا ترجمہ وہ اُنھیں الفاظ میں کر سکتا ہے۔ ایک انگریزی داں مؤلف "لفظ ایک" اور "رفتہ رفتہ"، "شدہ شدہ" اور "آہستہ آہستہ" کو حرفوں کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے انگریزی آرٹیکل وغیرہ کا ترجمہ ایسا ہی پڑھا ہے۔ غرض دونوں نے اردو کو دوسری زبانوں کا ماتحت بنانا چاہا اور اس پر ایسا جبر کیا ہے جیسا کہ بردہ فروش انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مبادی الانشا کی تیسری فصل میں وہ قاعدے بتلائے گئے ہیں جن کے مطابق ایک مضمون مختلف عبارتوں میں بیان ہو سکتا ہے اور یہ بات امتحان کی جان ہے۔ چوتھی فصل میں علم بیان کا ایک مفید خلاصہ لکھا گیا ہے جس میں تشبیہہ و استعارہ کی تفصیل مندرج ہے۔ ہر چند کہ معانی و بیان و بدیع میں فاضل اجل جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی کی تذکرۃ البلاغت ایک عمدہ اور مبسوط کتاب ہے۔ مگر اس سے ذی استعداد آدمی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ نہ کہ مڈل اسکول کے طلبہ ان کے واسطے تو اتنا بھی بہت ہے جتنا کہ مبادی الانشا میں لکھا گیا ہے۔ صنائع بدائع کا ذکر بالکل نہیں کیا گیا اور بیشک اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص مبتدیوں کو اس سے احتراز ہی اولیٰ ہے۔ اس سے عبارت بظاہر چٹ پٹی ہو جاتی ہے۔ مگر اصل مضمون کو لقوے اور فالج کا عارضہ بھی اکثر لاحق ہو جاتا ہے۔ فصل پنجم میں ان مضامین کا طرز تحریر بتلایا ہے جو حواسِ خمسہ کی مدد سے معرض بیان میں آتے ہیں۔ فصل ششم میں تاریخی واقعات کی ترتیب و تالیف و روایت و حکایت کی ترمیم کا طور سکھایا ہے۔ فصل ہفتم میں ان مضامین کا بیان ہے جن میں منطقی دلائل و براہین اور استخراج

نتائج کا کام پڑتا ہے۔ اگر ان فصلوں میں ایک فصل ایسی بھی ہوتی جس میں کسی کلام یا عبارت کی شرح کرنے کے قواعد وضوابط لکھے جاتے تو مناسب ہوتا۔ شاید کسی آئندہ حصہ میں اس کا موقع تجویز کیا گیا ہو۔

اب آخر میں مڈل کلاس کے طلبہ سے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ایسے ہی عالم فاضل مصنفوں کی تصنیفات سے اپنی ترقی استعداد کر سکتے ہیں جیسا کہ اس کتاب کا باکمال مصنف ہے ورنہ امتحان مڈل کے واسطے آج کل اس کثرت سے کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جیسے برسات میں حشرات الارض کی پیدائش ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے اشتہاروں کی دُم ہوگی۔ جب کتابوں پر نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو صرف یہی افسوس نہیں ہوتا کہ طلبہ کے دام مفت ضائع گئے۔ بلکہ ا ُ ن سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے اور مصنفوں کا فرقہ بھی دغا باز دکانداروں کی طرح بدنامی کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔"

(محمد اسماعیل میرٹھی، ہیڈ ماسٹر)

(نارمل اسکول میرٹھ)

۳۰ رمئی ۱۸۸۶ء

مولانا اسماعیل کی ایک معرکہ آرا تقریر

مولف حیات وکلیات اسماعیل نے جنگ روم وروس پر لیکچر ۱۸۷۷ء کے تحت بیان کیا ہے۔

"زمانہ جنگ میں ترک مجروحین کی مالی امداد کے لیے مسلمانان میرٹھ نے ایک عام جلسہ منعقد کیا تھا۔ مولانا نے اس جلسہ میں تقریر فرمائی تھی وہ نجم الاخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی فصاحت کا سرسید علیہ الرحمتہ اللہ نے تہذیب الاخلاق میں ذکر کیا تھا۔" (۱)

(۱) ص ۵۲،

اس تقریر کی تلاش میں ہمیں کافی محنت کرنی پڑی۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے سرسیّد روم میں تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی تمام جلدیں کھنگالیں۔ آخر کار کامیابی ہوئی۔ سرسیّد نے نجم الاخبار میرٹھ کے حوالے سے یہ تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کی تھی۔ اس میں مقرر کا نام مولانا اسمٰعیل کی جگہ مولوی عبدالحکیم درج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرسیّد نے تقریر کی خوبی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ تقریر مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی تھی اور اُنھوں نے اپنے بھائی مولوی عبدالحکیم جوش سے پڑھوا دی تھی۔ مولانا نے مثنوی فکر حکیم اور دوسری درسی کتابیں بھی اپنے بھائی کے نام سے شائع کرا دی تھیں۔ مولانا کی یہ معروف روش تھی۔ شاعری کے ضمن میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترکی سے مولانا کو دوسرے مسلم اکابرین کی طرح بے حد جذباتی لگاؤ تھا۔ کلیاتِ اسمٰعیل میں صفحہ ۲۴۴ پر فتح عظیم کے عنوان سے ایک قطعہ درج ہے۔ پہلا شعر ہے۔

ہاں کیوں نہ ہو دوچند ہمیں عید کی خوشی   فتح عظیم پائی ہے سلطانِ روم نے

اس کے علاوہ مولوی عبدالحکیم کے قلم کا کوئی دوسرا نمونہ بھی اس انداز کا نہیں ملتا۔ اہم بات یہ ہے کہ مولانا اسماعیل گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ اس دور میں سرکاری ملازمین کو اظہارِ خیال کی آزادی نہ تھی۔ سب سے بڑی شہادت یہی ہے کہ اس تقریر میں سموئی ہوئی وسیع معلومات نیز اس کے اسٹائل سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تقریر مولانا اسماعیل کے قلم کا نتیجہ ہے۔ سرسیّد کا نوٹ اور تقریر مندرجہ ذیل ہے۔

انسانی ہمدردی (۱)

مولوی عبدالحکیم صاحب کی تقریر جو انھوں نے جلسہ تائیدِ یتیمان و مجروحان لشکر ترکی میں بمقام میرٹھ کی۔ نجم الاخبار میرٹھ سے بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ وہ تقریر جسے بلحاظ مضامین اور عالی

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۰ر اپریل ۱۸۷۷ء جلد نمبر ۱۲

خیالات کے عمدہ ہے ویسی ہی فصاحت و بلاغت میں بھی بے نظیر ہے ہم کو اس تقریر سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کے لٹریچر کو نہایت ترقی ہوئی ہے اور طرز بیان اور عمدگیِ خیالات سے روز بروز ترقی پر ہیں۔ درحقیقت یہ تقریر جناب مولوی صاحب کی اردو زبان و انشا کے لیے نہایت اعلیٰ ترقی کا ثبوت ہے اور اس قابل ہے کہ تعلیم میں داخل کی جاوے۔"

"لے حضرات حاضرین جلسہ۔ آج ہم سب اس مقصد سے جمع ہوئے ہیں کہ ترکی کے یتیموں اور مجروحین اور بیوہ عورتوں اور درماندوں کے واسطے جو کہ درحقیقت ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ایک چندہ جمع کریں اور ہم لوگ اس نیکی اور رحمدلی میں شریک ہوں جو قدرتی اخلاق کے لحاظ سے ہر ایک انسان پر فرض ہے اس خیال کی تحریک لوگوں کے دلوں میں ان واقعات پر غور کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ جو گزشتہ دو برس سے روم کی سلطنت میں پیش آئے اور جن کے سلسلے کا سب سے پچھلا حصہ ابھی تک نمودار نہیں ہوا ہے اگرچہ جنگ کریمیا کے زمانے میں بھی (جس کا خاتمہ ۱۸۵۶ء میں ہوا) اس سلطنت کو مصائب پیش آنے تھے لیکن اس وقت لوگوں کے خیالات حالات روم کی جانب ایسے رجوع نہ تھے۔ جیسے کہ اب ہیں اور معلومات میں بھی ایسی صفائی نہ تھی جیسی کہ اب ہے اور سفر و خبر کے وسائل بھی ایسے تیز و قوی نہ تھے جیسے کہ اب ہیں اس واسطے اس زمانے میں ایک صحیح رائے قائم کرنا اور کسی موثر خیال کا پیدا ہونا ایسا ہی دشوار تھا جیسا کہ جھوٹی سچی خبروں کا امتیاز مشکل تھا اور جیسی کہ علمی لیاقتیں تنگ و محدود تھیں ویسے ہی خیالات بھی تیرہ و تاریک تھے۔ جب سے اب تک دنیا کی موجودہ حالت میں بڑا تغیر ہوا ہے۔ خصوصاً

ہندوستان کی حالت میں جو تبدیلی واقع ہوئی اور جو برکتیں اس ملک کو حاصل ہوئیں وہ ایسی ظاہر و باہر ہیں جیسے کہ ہمارے احباب اس وقت ہماری نظر کے سامنے موجود ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں ہمارے ملک پر جہالت کا ابر چھایا ہوا تھا اور دماغی اور عقلی قواء کے میدان میں ایک گہرے کہرے سے دھندلے ہو رہے تھے۔ اس وقت جو باتیں ٹٹولنے سے بھی دریافت نہ ہو سکتی تھیں وہ اب نہایت روشن اور صاف صورتوں میں نمایاں ہیں گزشتہ زمانہ میں اصل اور مصنوعی خبریں ایک ہی قیمت پر فروخت ہوتی تھیں اور وہ کانوں تک پہنچتے پہنچتے مردہ بھی ضرور ہو جاتی تھیں پس ان کا اثر طبیعتوں پر ایک خیالی افسانہ کے رنج و خوشی سے زیادہ نہ تھا اور لاعلمی کی وجہہ سے سلطنتوں کی اصلی طاقت و عظمت اور ان کی حدود اور ان کے باہمی تعلق سمجھنے میں بھی بہت بڑی غلطی ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ زمانہ گزر گیا اور وہ خیالات بھی دور ہو گئے۔ اب سلطان روم کو تمام روئے زمین کا شہنشاہ کوئی نہیں جانتا اب تو دنیا کی تاریخ لوگوں کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہے اور روئے زمین کا نقشہ نظروں میں سمایا ہوا ہے اس لیے جو واقعات فی الحال آبنائے باسفورس کے کنارے پر پیش آئے گویا کہ وہ سب کے سامنے ہوئے ہیں اور جو توپ سرویہ کے میدانوں اور مانٹیگرو کی گھاٹیوں میں داغی گئیں اور جو کچھ روس کی کارسازیوں کی گھڑگھڑاہٹ ہوئی اس کی صدا بہت ہی جلد دنیا کے دور دراز حصوں میں پھیل گئی اور جو موج بحیرۂ مارمورا کے ساحل سے اٹھی اس کی تصویر چوبیس گھنٹے کے اندر ہندوستان کے اخباروں میں کھنچ گئی۔

پس اس زمانہ کی عام واقفیت اور حالات دنیا کی تفصیل نے سلطنت عثمانیہ کے واقعات سے لوگوں کو ایسا خبردار کر دیا کہ اس پر غور کرنے کا عمدہ موقع حاصل ہوا۔ ایشیا کے مغربی ملکوں کے باشندے اور یوروپ کے مشرقی خطوں کے رہنے والے اور افریقہ کی شمالی مشرقی اقوام سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ خاص ملکی تعلق رکھتی ہیں کیوں کہ انہیں ممالک سے وہ سلطنت مرکب ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ وہ سلطنت مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات یعنی مکہ معظمہ و مدینہ منوّرہ اور کربلائے معلّی و نجف اشرف بغداد شریف و کاظمین شریفین وغیرہ کی محافظ و خادم ہے۔ تمام روئے زمین کے مسلمان اس کی عظمت اور سلامتی کے خواستگار ہیں اور اس قسم کا تعلق صرف مسلمانوں ہی سے اس کو نہیں ہے بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کا قبلہ اور زمینِ مقدس بھی اس سلطنت کے حفظ و امان میں ہے اور اس لحاظ سے کہ اس سلطنت کا یورپین حصّہ روس و آسٹریا اور اٹلی سے ملحق الحدود ہے اور اس لحاظ سے کہ انگلستان و ہندوستان اور فرانس وغیرہ کی تجارت بحر روم کی راہ سے جاری ہے یوروپ کی تمام سلطنتوں سے اس کو واسطہ اور تعلق ہے اور عہد نامۂ پیرس کی ساتویں شرط کے بموجب (جو جنگ کریمیا کے خاتمہ پر مرتب ہوا تھا) یورپ کے عام قانون اور نظم میں یہ سلطنت بھی داخل ہے، اور انگلستان، آسٹریا، فرانس، پروشیا، روس اور سارڈینیا کے شاہوں، شہنشاہوں نے اس بات کا اقرار کر لیا ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی آزادی اور ملکی سلامتی کا لحاظ

رکھیں گے اور اس عہد کی بڑی پابندی کریں گے اور یہ سلطنت چونکہ مختلف قوموں اور مختلف مذہب کے فرقوں پر حکمران ہے اور اس کے یورپین ممالک میں بہ نسبت مسلمانوں کے اور قوموں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اس لحاظ سے بمقابلہ دیگر سلطنتہائے یورپ اس کو انتظام کی دشواریاں بھی بہت زیادہ ہیں اور ہمیشہ سخت مشکلوں کا مقابلہ کرتی ہے اور جب کہ اس کے ایک ہمسایہ سلطنت کی عداوت اور خفیہ کارسازی اضافہ کی جاوے تو اس کی ملکی مشکلات بہت ہی بڑے درجہ کی ثابت ہوتی ہیں۔

چنانچہ وہ خفیف غدر جو ۱۸۷۵ء کے موسم گرما میں ہرزیگوینا اور بوسینیا کی سرحدی قسمتوں میں شروع ہوا ایک چنگاری کی مثال تھا جس کو روسی ہوا کے جھونکوں نے ۱۸۷۶ء تک مشتعل رکھا اور اس وقت یادداشت آسٹریا کے بموجب گو سلطانی فرمان رعایت آمیز جاری ہوئے مگر اصل بغاوت کی گرماگرمی کم نہ ہوئی کیونکہ ان کو ایک بڑے طوفان کی اُمید لگ رہی تھی۔ چنانچہ وہ آندھی جو آنے والی تھی آئی اور جو بجلی چمکنے والی تھی چمکنے لگی۔ یعنی سرویا اور مانٹینگرو کی ریاستیں بھی جو عثمانیہ جھنڈے کی مطیع تھیں یک لخت باغی ہوگئیں اور حدود سلطانی پر فوج کشی کی۔ یہ جرأت ان کی اپنی ہی قوت بھروسہ پر نہ تھی کیونکہ روس نے ہتھیاروں سے روپیہ سے اور آدمیوں سے اہل بغاوت کو برابر اس زمانہ تک مدد دی جب تک کہ ٹرکی افواج نے اپنی باقاعدہ جنگ اور ذاتی شجاعت سے ان کو متواتر شکستیں دیں اور جب تک کہ الکسیناج کے زبردست قلعہ پر عبدالکریم پاشا کا فتحمندانہ جھنڈا قائم ہوا اور

جب تک کہ بلگریڈ کی سڑک (جو سردیہ کا دارالامارت ہے) ترکوں کے قبضے میں آئی۔ اور جب تک کہ رئیس سرویا کو اپنی کامل تباہی کا یقین ہوا۔ یہ وہی جنگ تھی جس کی خبریں گزشتہ اکتوبر تک ہم لوگ سنتے رہے اور یہ جنگ اس طرح پر روکی گئی کہ روس سے مضطرب ہو کر قطع تعلق کی دھمکی دی اور ۴۸ گھنٹہ کے اندر سلطان سے مہلتِ جنگ کی درخواست کی اور اس طرح پر ترکی لشکر کے سیلاب سے سرویا کی ڈوبتی کشتی کو بچالیا۔ ایک ترکی وزیر کا قول ہے کہ ہم ایک ہفتہ میں باغیوں کا فیصلہ کر دیتے۔ لیکن درحقیقت ہم کو ایک زبردست سلطنت سے یہ جنگ کرنی پڑی ہے روس نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ خفیہ طور پر باغی ریاستوں کو مدد دے اور ظاہری رسم سلطنت عثمانیہ سے قائم رکھے اور ان کا سفیر خاص قسطنطنیہ کے اندر بیٹھا ہوا اپنا کام کرتا رہا۔ بلکہ آخر میں خود روس نے میدانِ جنگ میں آنے کا ارادہ کیا اور عہد نامہ کے توڑنے پر مستعد ہوا اور یہ ارادہ اس کا تیزی کے ساتھ اس لیے ظاہر نہیں ہوا کہ انگلستان کے مصالحت آمیز تدبر اور منصفانہ طریقہ نے اس ارادہ کو جائز نہیں رکھا اور اس کے روکنے پر عہد نامہ کی ذمہ داری کے لحاظ سے استقلال ظاہر کیا اور نیز دیگر سلاطین یوروپ بھی روس کی تدبیروں کے مویّد نہیں ہوئے۔

روس نے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اگرچہ مسلح ہو کر برسرِ میدان کوئی جنگ نہیں لڑی۔ لیکن اس نے اس سلطنت پر مصائب ڈالنے اور تباہی کے سامان پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس باوجود عہد نامہ کے

ہر پہلو سے در پردہ کینہ روی اور عداوت کا برتاؤ کیا جو میدانی جنگ سے بدرجہا زیادہ مضر تھا۔ اس نے عمدہ انتظام کی تدبیروں کو اس طرح سرسبز نہ ہونے دیا کہ بغاوت کو بھڑکایا اور بغاوت کو اس طرح قائم رکھا کہ ترکوں کی فتوحات کو روک دیا۔ کبھی بدنظمی کا الزام لگایا۔ کبھی ہنگامہ بلگیریا کی مبالغہ کے ساتھ تشہیر کرائی کبھی دھمکی دی اور کبھی زور آزمائی کے لیے مستعد ہوا۔ غرض طرح طرح سے سلطنت عثمانیہ کو ہر قدم پر سخت مزاحمت پیش آئی جس کے برداشت کرنے میں ترکوں نے بہت سے رائے دینے والوں کا گمان غلط کر دیا۔

اگر سلطنت کو تنہا دقتیں پیش آتیں جن کا ذکر ہوا اور ...... وہ کامیاب ہو جاتیں جن کی .... دقتوں کا وزن ایسا گراں .... کے سبب ہو گیا۔ اس کو بڑے بڑے سخت صدمے عین تردد اور تشویش کی حالت میں یعنی جب کہ اس کے سپاہی میدان میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے ایسے اٹھانے پڑے جو ایشیا کی تاریخ میں بربادی کا سبب خیال کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ متواتر تین سلطنتوں کا عزل و نصب ہوا۔ پے درپے وزراء اعظم کی تبدیلی ہوئی اور کئی وزیر مارے گئے۔ جن میں حسن عونی پاشا بڑا کار آزمودہ جنگی وزیر سلطنت کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ ان تمام اندرونی و بیرونی دشواریوں کے علاوہ ایک ایسی پُرخطر دشواری پہلے ہی سے موجود تھی۔ جو ہر قسم کی دشواری کے حق میں آب حیات اور تمام تدبیروں کے واسطے طوفان نوح بن سکتی تھی۔ وہ گورنمنٹ کے خزانے کی ابتر حالت اور قرض کا جو بوجھ تھا کیوں کہ خزانہ

کی نہی دستی ساری دشواریوں کی مربی اور تمام ملکی دشواریاں خزانہ کی دشمن ہوتی ہیں۔ غرض ایسے پیچ در پیچ پھندے پڑے ہوئے تھے کہ جن کا سلجھانا غیر ممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور تھا۔ پس یہ بات اس زندہ تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سلطنت نہ تو غصّہ کے جنون میں مبتلا ہوئی اور نہ اس نے بے عزّتی کا دھبّہ اپنے دامن میں لگنے دیا۔ ہر موقع پر اس کے ہوش و حواس بجا رہے۔ صلح کی درخواست پر اس نے نرم دلی کو نہیں چھوڑا۔ جنگ کے میدان میں اس کا وار خالی نہیں گیا۔ اس نے خواہ مخواہ کسی سے جنگ بھی نہیں کی کسی غیر ملک پر حملہ نہیں کیا۔ کسی ہمسایہ پر چڑھائی نہیں کی۔ اس نے اپنی ہی قلمرو کے فساد مٹانے اور امن و امان قائم کرنے کے لیے شمشیر برہنہ کی۔ اس نے صرف اپنی فوجی طاقت سے کام لیا اور بڑی دانائی کے ساتھ مذہبی جنگ سے اپنے تئیں بچائے رکھا اور اپنی عام رعایا کا مذہبی جوش فرد کیا۔ حالانکہ اس کے مخالف نے اپنی خواہش پورا کرنے کو اپنے ملک میں علانیہ، مذہبی جنگ کا دعنڈ کرایا اور تعصب بڑھایا اور خونریزی کے بڑے سامان پیدا کیے۔ پس ان تمام باتوں پر ثابت قدم رہنے اور مصائب برداشت کرنے کے لیے اس سلطنت کے اقتدار میں کیا چیز تھی؟ صرف اس کے جانبازوں کا بہادر دل اور غیرت مند طبیعت تھی جنھوں نے اپنی سلطنت کی وفاداری اور ملک کی محبت اور اپنی قومی عزت کے برقرار رکھنے میں اپنی عزیز جانیں بڑی دلیری سے نثار کر دیں اور اپنے خون کے قطرے بہا کر اپنی قوم اور اپنے ملک کو خونریزی سے بچالیا جیسا کہ

ان لوگوں کا یہ مردانہ کام اور ان کی مضبوط ہمت اور جفاکش عادت قدر کے لائق ہے۔ ایسے ہی ان کے غمزدہ بچوں کی مظلومی اور ان کی سوگوار عورتوں کی بیکسی اور ان کے ساتھی زخمیوں کی دردمندی بھی نہایت قابل رحم ہے۔ ان مظلوموں کا حال ایسا نہیں ہے کہ طبیعت میں خدا ترسی اور رحمدلی کی تحریک نہ کرے خصوصاً ایسے وقت میں ان کا ملکی خزانہ ان کی دستگیری سے مجبور ہو کر اور ان کا وطن بہ سبب حادثوں کے ان کی مدد سے معذور رہے اور ان کے ملک کو ابھی تک سرسبزی کی فرصت اور بیرونی مخالفت سے مہلت نہیں ملی ہے۔ ان لوگوں کی آسایش میں جو خلل واقع ہوا تھا۔ وہ ان کے دشمن کی ناواجب زیادتی کا نتیجہ ہے۔ ان کے شجاع عزیز ان سے جدا ہو گئے ان کے روزی کے وسائل منقطع ہو گئے۔ ان پر یہ ایسی تکلیفیں واقع ہوئیں کہ جن سے نجات حاصل کرنا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ جب ہم مظلوموں کی مصیبت اور اپنے ہم جنسوں کی پریشان حالت پر غور کرتے ہیں تو ایک غمگینی بھرے دل سے ہم اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارے دل میں یہ ہی خیال ہوتا ہے کہ بار خدایا تو نے ہم کو اچھا بند و بست اور عمدہ امن و امان اور دلی اطمینان نصیب کیا ہے۔ ہمارے وہ ہم جنس جو خوف و خطر کی حالت میں ہیں۔ کیسے ان بے بہا نعمتوں سے محروم ہوں گے۔ اے آسمان تو ہمارے لیے استراحت کا سامان ہے۔ اے ہماری زمین تو ہمارے لیے آسودگی کا ٹھکانا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے وہ ہم جنس جن کے عزیز توپوں کے دھوئیں اور میدان

کے غبار میں فنا ہو گئے۔ بیشک بے چینی سے تڑپتے ہوں گے۔

اے آسمان کی خوبصورتی! اے ہوائے تازگی! اے زمین کی سرسبزی! تو ہمارے لیے عیش زندگی ہے۔ لیکن ہم کو ان لوگوں کی یاد دلاتی ہے جو اپنی مصیبت و پریشانی میں تیرا لطف اُٹھا سکیں۔ اے زمین کی حرارت! اے سردی کی ٹھنڈک تو ہمارے لیے کیسی خوشگوار ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں کو بھول نہیں گئے جو دھوپ کی تپش اور برف کی لہر سے بچنے کا سامان نہیں رکھتے۔

اے دن کی روشنی اور شب کی تاریکی! تو ہمارے واسطے موجب رحمت ہے مگر ان آدمیوں کا کیا حال ہوگا جن کو ظالم تلواروں نے مجروح کیا ہے اور جن کے آرام میں ناحق خلل ڈالا گیا۔ کیا ہم اپنی شادماں حالت اور اپنے کاروبار کے شغل میں ان لوگوں کو فراموش کر دیں گے۔ اگر ہم ان کو بھول جاویں یا ان کے ساتھ حسن سلوک سے باز رہیں تو بیشک ان نعمتوں کی ناشکری ہوگی جو خدا نے ہم کو عطا فرمائی ہیں۔ جو نرم دل اور نیک صفت انسان ہوگا وہ ان باتوں کے تصور سے ضرور اپنے عیش و آرام کا شکریہ اس طرح ادا کرے گا کہ جسقدر ممکن ہو ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ ہم جنسوں کو آرام پہنچاوے۔

اسی نیک خیال کی تاثیر نے انگلستان کے رحمدل اور کریم الطبع آدمیوں کو ٹرکی کے اہل مصیبت کی ہمدردی پر آمادہ کیا اور فراہمی چندہ کے واسطے کمیٹی قائم ہوئی چنانچہ علاوہ اور لوگوں کے صرف ایک فیاض امیر نے ایک لاکھ روپیہ دیا ہے۔ عراق اور عرب اور مصر اور ٹونس کے ملکوں سے بھی

اہل ہمت نے روپیہ بھیجا ہے۔ خاص ترکی عورتوں نے بھی اپنی محنت و دستکاری سے ہزارہا پیراہن دیے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر شہروں نے بھی اس ضروری موقع پر اپنی فیاضی کو کام فرمایا ہے اور اپنے حوصلے اور توفیق کے موافق یتیموں اور مجروحوں کی امداد کے لیے روپیہ دیا ہے اور ہمارے مہربان یورپین افسروں نے بھی اور ہمارے عزیز ہم وطنوں تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی انسانی محبت اور عام ہمدردی کے لحاظ سے اپنی مہربانی اور فیاضی کو محدود نہیں کیا۔ فی الحقیقت رحمدلی ایک ایسا اعلیٰ اور وسیع خیال ہے کہ کسی خاندان یا وطن یا قوم یا ملک کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک نسل اور ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے سبب سے ہمدردی کی صفت بہت ضروری چیز ہے اور انسانیت و آدمیت کا ضروری لازمہ ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی خاصیت ہے جو ایک دوسرے پر رحم کرنے اور درد و مصیبت میں شریک ہونے کی ہدایت کرتی ہے اور عاجزی و بیچارگی میں خود ایسا جاذبہ موجود ہے جو ان کے دل کو بیتاب کر دیتا ہے اور جہاں تک آدمی نیکی اور صاف دلی اختیار کرتا ہے اسی قدر یہ صفت عام اور بلاقید ہو سکتی ہے۔

اے صاحبو! اسوقت جو لوگ مبتلائے مصیبت ہیں اور انسانیت کے لحاظ سے ہمارے بھائی بند ہیں اور مظلومیت کے لحاظ سے ہمدردی کے مستحق ہیں اور اپنے ملک سے مدد حاصل کرنے میں مجبور ہیں اور ان کے حالات سے ہم کو بخوبی واقفیت بھی حاصل ہے اور دنیا کے اکثر رحمدل آدمیوں نے ان پر رحم کیا ہے تو ان کی ہمدردی اور مدد ہم پر واجب ہے

اگر اپنے مال کا ایک ادنیٰ حصہ ہم ان کی آسایش میں صرف کرنے کو دیں تو اعلیٰ درجہ کی نیکی اور منشا قدرت کی پیروی ہوگی اور اور یہ ایسا متفق مسئلہ ہے کہ جس کی ہدایت .... ہر قوم و ہر... نیکنامی حاصل کرنے کا موقع ہے اور جو مہذّب انسان ہیں وہ اپنا اخلاقی برتاؤ تمام نوع انسان کے ساتھ یکساں رکھتے ہیں۔ ہاں اے اہلِ ہمّت یہ فیاضی اور نیک دلی کے امتحان کا موقع ہے۔ اس میدان میں جو لوگ مردانہ وار ہمّت سے اپنے ذاتی اغراض پر اپنے ابنائے جنس کی ہمدردی کو مقدم سمجھیں گے وہی اس معرکہ میں فتح مندی حاصل کریں گے جو دل کی فیّاضی سے معمور اور سخاوت سے لبریز ہے وہی اپنی خواہشوں کو زیر کر سکتا ہے اور اپنی آسائیش کے سرمایہ کا ایک حصہ اپنے مستحق ہم جنسوں کے آرام میں لگا سکتا ہے۔ پس جس طرح جنگی معرکوں کی کامیابی ایک امر عظیم سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح رحمدلی اور ہمدردی کی مہماتِ کو سر کرنا بھی بڑے مردانِ خدا کا کام ہے۔ واللہ ولی التوفیق

صاحبو! اب میں اس بات پر تقریر ختم کرتا ہوں کہ جس طرح اس عمدہ عہدِ سلطنت کی بدولت ہم کو حالاتِ دنیا کے دریافت کے روشن طریقے میسر ہیں ایسے ہی نہایت آسان اور معتبر ذریعے ہر نیک کام کے انجام کے لیے موجود ہیں۔ چنانچہ جو روپیہ ہم لوگ دیں گے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ انگلستان کی راہ سے پہنچ سکتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ صدہا ایسی بے نظیر خوبیاں انتظام برٹش گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو میسّر ہیں۔

۱۵ راپریل ۱۸۷۷ء العبد عبدالحکیم

سدرشن کا میلہ حصہ اوّل

پنڈت چھید الال نے تصوّف پر یہ کتاب مرتّب کی تھی۔ مولانا اسمٰعیل نے اس کی عبارت کو درست کیا تھا۔ کلیاتِ اسماعیل میں صفحہ ۶۲ پر مولانا کی تحریر کا عکس چھپا ہے۔ یہ کتاب نولکشور پریس میں شائع ہوئی تھی۔

جنگل کی دوسری کتاب

عنایت اللہ بی اے علیگ نے کپلنگ کی کتاب جنگل کا ترجمہ کیا تھا پہلی کتاب میں محاورات کی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اس لیے دوسری کتاب کا مسوّدہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے بڑے خلوص اور محنت سے اس مسوّدے کی درستی کی کتاب کے دیباچہ میں مترجّم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا اسماعیل کی تبصرہ نگاری

تبصرہ نگاری دراصل ایک احتسابی عمل ہے جس میں تبصرہ نگار کو مصنّف کے کمال اور اس کے ابدی امکانات کو تولنا پڑتا ہے۔ یہ بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ہمارے زمانے میں تبصرہ نگاری کا حق بہت کم تبصرہ نگار ادا کر پاتے ہیں۔ بعض کے یہاں تعارف کا نام ہی تبصرہ رکھ دیا گیا ہے کچھ تبصرہ نگار ایسے ہیں جو تنقید اور تبصرے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔

مولانا اسماعیل کے تبصروں کا مطالعہ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنِ تبصرہ نگاری کا پورا احساس رکھتے تھے۔

---

(۱) حیات وکلیات اسماعیل، ص ۵۴

باب ششم

اردو ادب میں اسماعیل میرٹھی کا مقام

اسماعیل میرٹھی غالب کے شاگرد تھے اور شاگرد بھی ایسے جس پر اردو ادب فخر کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"غالب کے شاگرد بے شمار ہیں۔ میرٹھ نے بھی ان سے فیض اٹھایا۔ اور ان کی صحبت اور تربیت نے اس سرزمین کے جن جوہروں کو چمکایا۔ اس میں سے تین قابلِ ذکر ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا اسماعیل اور حکیم فصیح الدین رنج۔" (۱)

مولانا اسماعیل نے اپنے علم و فضل اور تدریسی تجربوں کی روشنی میں نصابی کتابوں کا ایسا سلسلہ مرتب کیا جس کی نظیر اردو میں نہیں ملتی۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کو نصابی کتابیں مرتب کرنے میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ مگر ان کا دائرہ اثر پنجاب تک محدود رہا نیز ان کی تحریروں میں وہ بات پیدا نہیں ہوئی جو تعلیمی نقطۂ نظر اور بچوں کی نفسیات کو سمجھ لینے سے آتی ہے اور جو اسماعیل کے ریڈروں کا طرۂ امتیاز ہے ڈاکٹر عبدالوحید نے جدید شعرائے اردو میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے

---

(۱) غالب، فکر و فن، ۱۹۶۱ء، کراچی، ص ۲۳۳ لاہور، ص ۶۸

لکھا ہے

"مولوی اسماعیل نے جس انہماک اور بچوں کے نفسیاتی مطالعہ کے بعد یہ کتابیں لکھی تھیں وہ مولانا آزاد کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔" (۱)

اسماعیل کے ریڈروں میں ابتدائی اور ثانوی منزل کے طلبہ کی استعداد ذہن، نفسیات اور فرہنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی شامل کیا گیا ہے۔ وہ نہایت غور وخوص اور سوچ بچار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بچوں کے لیے اسماعیل نے جو نظمیں کہی ہیں وہ مفید ہونے کے علاوہ لطف و انبساط کی کیفیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ مہتم بالشان اور تاریخ ادب میں ایک ناقابلِ فراموش یادگار رہے گا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کی اہم رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"ایک کام ان کا ایسا ہے جو اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ اُن کی وہ نظمیں ہیں جو اُنھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ ہماری زبان میں ان کی نظیر نہیں نہ تو پہلے کبھی ایسی نظمیں لکھی گئی تھیں اور نہ ان کے بعد اب تک لکھی گیئں۔ مرحوم کو اردو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور ان کا کلام۔ فصیح اور صحیح زبان کے لیے سند ہے۔" (۲)

......اسماعیل نے بچوں کی شخصیت کو بنانے، نکھارنے اور چمکانے ..... میں بیحد دلچسپی لی۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی علمی بصیرت اور اخلاقی قدروں کا وُرثہ آنے والی نسلوں کو منتقل کر دیا۔ اس تعلق سے پروفیسر احتشام حسین نے ان کو "سعدی ہند" اور "بچوں کے اسمٰعیل" کہہ کر یاد کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

"تعلیمی نقطۂ نظر سے باضابطہ معیاری کوشش مولوی محمد اسماعیل کا حصہ تھا۔ "سعدی ہند" اور بچوں کے اسماعیل"

---

(۱) لاہور، ص ۶۴، (۲) اردو دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۲۲

دونوں لقب ان کے لیے مناسب تھے۔" (۱)

اُن کا ایک اور امتیازی اور انفرادی کارنامہ اردو قواعد کی تدوین ہے اردو قواعد پر ان سے پہلے بھی کام ہوا تھا۔ مگر ان کتابوں میں عربی، فارسی کا تتبّع کیا گیا تھا۔ ان کے بعد بھی مختلف تعلیمی منزلوں کا لحاظ رکھتے ہوتے اردو قواعد کی تالیف کے سلسلے میں کوئی مستحسن کوشش نظر نہیں آتی۔ سب سے پہلے اسماعیل ہی نے انگریزی گرامر کے انداز پر اردو قواعد کو مرتّب کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد الحق کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"مولانا کی تصنیف سے قواعد اردو کے بھی دو رسالے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں کم و بیش عربی صرف و نحو کا تتبّع کیا گیا ہے مولانا اسماعیل پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس تقلید سے الگ ہو کر جدّت سے کام لیا اور زبان کی فطرت پر غور کر کے یہ رسالے تالیف کیے۔" (۲)

لیکن یہ ریڈر یا قواعد ان کی ادبی خدمات کا ایک پہلو ہیں ان کی ادبی شخصیت کا اتنا ہی بھرپور انعکاس ہمیں ان کی دوسری ادبی تصانیف میں بھی نظر آتا ہے۔

اردو تنقید کی یہ ستم ظریفی رہی ہے کہ اس نے مولانا اسماعیل کو محض بچوں کا شاعر سمجھ کر پیش کیا۔ حالانکہ وہ جامع صفات انسان تھے اور ان کی ادبی شخصیت خاصی پہلو دار ہے۔ ان کی کئی حیثیتیں ہیں اور اردو ادب میں ان کی خدمات سے پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ ان کی ایک حیثیت اعلیٰ پایہ

---

(۱) اردو کی کہانی، مئی ۱۹۶۲ء ناشر سید انصار حسین لکھنؤ ص ۴۳، ۴۴

(۲) اردو، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۲۴۱

کے نثر نویس کی بھی ہے ان کی نثر کا خاص انداز و معیار تھا۔ تذکرۂ غوثیہ اور حیاتِ امیر خسرو میں اُن کی نثر نگاری اپنی معراج پر دیکھی جا سکتی ہے۔ سنجیدہ علمی مضامین، متصوفانہ اصطلاحات اور تاریخی واقعات کو اُنھوں نے اپنی انشا پردازی کے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے ان کا تنقیدی شعور بھی حالی اور شبلی سے کچھ کم نہ تھا اور جہاں تک علم عروض و بیان کا تعلق ہے ان کے معاصرین میں سوائے شبلی کے کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ جس طرح حالی نے مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی نے شعر العجم تصنیف کر کے اپنی ناقدانہ صلاحیت کا اعتراف کرا لیا تھا اسی طرح مولانا اسماعیل نے "مقدمہ مثنوی قران السعدین" رقم کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ کی مبادی الانشا، پر ریویو اور "کلیات شیفتہ میں کلام ریختہ پر ایک نظر" کے مطالعہ سے اسماعیل کی تنقیدی بصیرت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

اسماعیل کا ایک غیر مطبوعہ مضمون "مسوّدہ قانون ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور میرٹھ کی تقریر" انسانی ہمدردی"، جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ ان تحریروں میں سلاست زبان، رچاؤ، قوت استدلال اور جدید اسلوب نثر کے جو نمونے ملتے ہیں وہ اسماعیل کو ایک ممتاز نثر نویس ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کو اردو ادب کی کم نصیبی کہیے کہ اسماعیل کے خطوط کا مجموعہ ابھی تک مرتّب نہیں ہو سکا۔ اور ان کے مکاتیب منظر عام پر نہیں آئے ہم کو ان کے غیر مطبوعہ خطوط کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہے ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو اُنھوں نے اپنے صاحبزادے محمد اسلم سیفی کو لکھے ہیں۔ ان میں زندگی کے مسائل، عقائد کی کشمکش، انسانی نفسیات، سماجی تعلقات وغیرہ پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں سرسیّد اور غالب کے نقوش کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسماعیل کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیجیے تو ان کا ادبی مرتبہ اور بھی بلند معلوم ہوتا ہے۔ مولانا کی توجہ زیادہ تر نظم نگاری پر مرکوز رہی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی۔ ان کی غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن غزلوں میں عشق و تصوّف کا امتزاج اور بلیغ مجازیت ان کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ حسرت موہانی نے ان کی غزلوں پر رائے دیتے ہوئے کہا ہے۔

"کلیات میں جتنی غزلیں درج ہیں ان سب میں متانتِ بیان و پختگیٔ الفاظ کی وہی شان موجود ہے جو میر، مصحفی یا غالب و مومن کے کلام کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔" (۱)

غزلوں کے علاوہ اسماعیل کے یہاں قصیدے، قطعے اور رباعیاں بھی ہیں۔ قصیدے میں بھی انھوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی ہے اور اس میں روایتی اجزائے ترکیبی کی پابندی نہیں کی۔

اگرچہ وسیع موضوعات اور اصلیت کے عناصر قصیدے میں سمو کر انھوں نے سودا کی روایت کو زندہ کیا۔ مگر تشبیب کا عنصر قصیدے سے خارج کر کے روایت سے انحراف بھی کیا۔ قصیدے کا دعائیہ جز مولانا کے یہاں تمام قصیدہ نگاروں سے مختلف ہے۔ اسماعیل کے یہاں بڑی تعداد میں قطعات ملتے ہیں۔ موضوع کے علاوہ ہیئت کے لحاظ سے بھی ان کے قطعات میں تنوّع ہے اسماعیل نے کافی تعداد میں رباعیاں بھی کہی ہیں۔ یہ ہیئت کے اعتبار سے تین طرح کی ہیں۔ مردّف، چہار قوافی اور سہ قوافی۔ ان کی سب سے اہم رباعیاں تصوّف سے متعلق ہیں۔

ہمارے نزدیک ہیئت کے لحاظ سے جدید نظم نگاری کے قائد مولانا

---

(۱) اردوئے معلی علی گڑھ، فروری ۱۹۱۱ء جلد ۱۲، نمبر ۲

...... اسماعیل ہی ہیں محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی نے مثنوی اور مسدس کی ہیئت سے ضرور نیا کام لیا اور موضوعات کا تعین کر کے نیچرل نظمیں کہی تھیں۔ مگر اسماعیل میرٹھی نے ہیئت کے نئے تجربے کیے اپنی نظموں میں اُنھوں نے قدیم عروض کو نئے سانچوں میں ڈھال دیا۔ اردو میں بلینک ورس کو رائج کرنے میں ان کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کی طبع زاد نظموں میں دیہی موضوعات اور مقامی رنگ خاص طور پر نمایاں ہیں پروفیسر عبدالقادر سروری نے صحیح لکھا ہے۔

"آزاد اور حالی کے پاس بھی مقامی رنگ ایک حد تک موجود ہے۔ لیکن ایسا صاف، حقیقی اور راست نہیں جیسا کہ اسماعیل کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے آزاد اور حالی کے کلام میں یہ خصوصیت اس طرح نمودار ہوئی ہے گویا کوئی شخص سُنی سنائی باتوں کو امور خانہ داری انداز میں پیش کر رہا ہے حالی کے پاس یہ چیز آزاد سے زیادہ ہلکی اور رسمی ہے اسماعیل کی شاعری کی یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس سے لوگوں کی آنکھیں بالکل مانوس ہیں۔ اس لیے اسماعیل کی شاعری یکایک چمک اُٹھی۔" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو نظم نگاری میں اسماعیل کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے نیز جیسا کہ پہلے کہا گیا محاسن کلام کے اعتبار سے بھی ان کا مقام بلند ہے۔ ان کے بارے میں مولوی عبدالباری کی رائے ملاحظہ ہو

"ایک زبردست شاعر تھے۔ حالی مرحوم اور مولانائے مذکور کا ایک رنگ ہے۔ بلکہ بعض باتوں میں آپ حالی مرحوم سے بیش پیش ہیں۔" (۲)

---

(۱) جدید اردو شاعری، ۱۹۴۵ء امرتسر، ص ۱۴۸
(۲) خندۂ گل، با اہتمام نیاز فتحپوری، ص ۳۲

پروفیسر حامد حسن قادری بھی ان سے متفق نظر آتے ہیں۔

"حالی و آزاد کے ہم عصر، اُنیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ہیں جن کی نظمیں محاسنِ شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔" (۱)

حضرت جگر بریلوی نے اپنے مضمون "مولانا اسماعیل میرٹھی میری نظر میں" میں واضح طور پر لکھا ہے۔

"در حقیقت یہ ہے کہ روانی میں مولانا کی بعض نظمیں سحرالبیان سے بھی آگے نظر آتی ہیں اور جس سہل ممتنع کو غالب سے خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے مولانا اس کے بادشاہ تھے۔" (۲)

اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ اسماعیل نے فارسی ادب پر بھی توجہ کی۔ ان کی فارسی نظم و نثر کا سرمایہ لائق قدر ہے۔ اس میں کہانیاں اور مثنویاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

"حیات و کلیات اسماعیل" پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز فتحپوری نے لکھا تھا۔

"آخر میں ان کا فارسی کلام بھی درج ہے جو بالکل پہلی بار میری نظر سے گزرا اور میں ان کی فارسیت دیکھ کر حیران رہ گیا" (۳)

حسرت موہانی نے فروری مارچ ۱۹۳۰ء کے اردوئے معلّٰی کانپور میں انتخاب کلیات اسماعیل صفحہ ۱۶۱ سے ۱۷۰ تک درج کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں الیاس برنی نے معارفِ ملّت، جذباتِ فطرت، مناظرِ قدرت وغیرہ کتابیں مرتب کی

---

(۱) داستان تاریخ اردو (مختصر تاریخ) طبع ۱۹۵۷ء ص ۳۸۸

(۲) روہیل کھنڈ اخبار، بریلی، ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء

(۳) نگار، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۳۹ء

بچوں، جو مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوئی بچوں۔ ان میں اردو ادب کے ممتاز شعرا کا انتخاب شامل تھا۔ ان کتابوں میں اسماعیل کی نظمیں بڑی تعداد میں منتخب کی گئی ہیں۔ رسالہ مخزن لاہور ستمبر ۱۹۱۰ء میں شیخ عبدالقادر نے مولانا کے بارے میں ذیل کا نوٹ لکھا تھا۔

"یہ قطعہ جناب مولانا اسماعیل صاحب میرٹھی پنشنر مدرس گورنمنٹ سینٹرل نارمل اسکول آگرہ نے علی گڑھ کے ایک شاندار جلسہ میں جو تعلیمی کانفرنس کے متعلق ہوا تھا، پڑھا تھا۔ نظم سہلِ ممتنع انداز میں لکھی گئی ہے جو قابلِ داد ہے مولانا ممدوح ان چند حضرات میں سے ہیں جن کا وجود اس وقت مغتنم ہے اور جنھوں نے اردو علم و ادب کی بیحد خدمت کی ہے"

اس کے دو برس بعد اسی رسالے میں "نوید مقدم شاہی" کی اشاعت کے موقع پر ایک ادارتی نوٹ شائع ہوا تھا۔

"مندرجہ ذیل نظم اور ایک قصیدۂ تہنیت جو اس کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ جناب مولوی محمد اسماعیل صاحب رئیس میرٹھی کا عطیہ ہے مولانا کی شہرت اور حسنِ قبول محتاج توصیف نہیں۔ ہم مولانا کی توجہ کے ممنون ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی توجہ فرماتے رہیں گے۔ (۱)

مولانا اسمٰعیل ہمارے ادب کے اُس دور میں سامنے آئے جب معاشرے اور تہذیب ہی کی نہیں بلکہ ادب اور آگہی، جذبے اور شعور کی سمت و رفتار بدل رہی تھی۔ مغربی ادب کا اثر اتنا ہمہ گیر ہو گیا تھا کہ اسے اپنائے بغیر چارہ نہ تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اپنے کلاسکی اثرات میں اُنھیں کس طرح سمویا جائے

---

(۱) مخزن لاہور، جنوری ۱۹۱۲ء جلد ۲۳ نمبر ۴

تاکہ یہ پیوند بے رنگ نہ معلوم ہو اور ہماری زبان کے مزاج اور کردار سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو اسماعیل میرٹھی نے اردو ادب کو نئے نہج پر لانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ نظموں میں ہیئت کے تجربے شاعری میں معنوی تسلسل اور اخلاقی مضامین پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قدیم کے رمز شناس اور جدید کے مزاج داں تھے۔ شعوری طور پر انھوں نے ہماری شاعری کا دائرہ حسن و عشق کے مضامین سے بلند کیا اور اس میں ایسی وسعت اور رنگا رنگی پیدا کی کہ ان کی کوششیں ۱۸۷۴ء کی نظم گوئی کی تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہر خیال، جذبہ اور اخلاق نکتہ شعر کی تہ میں ڈھالا جا سکتا ہے اور اسے دلچسپ و دل نشین پیرایہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کی قوت مشاہدہ اور معمولی واقعات اور اشیا سے اہم نتائج نکال لینے کا ان کا ملکہ حیرت انگیز ہے

مولانا اسماعیل نے نصاب کی تدوین و ترتیب کے مقدس کام کو تاریخ کے ایسے اہم موڑ پر انجام دیا جب فارسی کا اثر و رسوخ اٹھ چکا تھا اور انگریزی کا چلن عام ہو رہا تھا۔ اردو نصابی کتابوں اور ادبی ہمہ گیری کے اعتبار سے تہی مایہ تھی اور خود ایک معیاری زبان کے اعتبار سے اس کے اثر و رسوخ کو نئے تعلیم یافتہ طبقے اور خصوصاً بچوں میں استوار کرنا ضروری تھا۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے یہ کام ایک زبان داں کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اہل زبان اور ادیب کی حیثیت سے کیا۔ وہ اپنی نصابی کتابوں میں سیدھی سادی زبان کے ذریعے نئی ادبی اور سماجی آگاہی کی ترسیل کرتے ہیں اور خوبصورت طریقے پر اسے ہمارے نونہالوں کے شعور کا جز بنا دیتے ہیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی نصابی کتابوں کے سائے میں کئی نسلیں پل کر جوان ہوئی ہیں اس بات کا اندازہ کرنا آسان نہیں کہ مولوی اسماعیل میرٹھی کی ان کتابوں نے پڑھنے والوں کی کئی نسلوں کے ادبی مذاق کی کس طرح آبیاری کی اور ان کے معیار و اقدار پر کس حد تک اثر انداز

ہوئیں۔

غرض مولانا اسماعیل میرٹھی ہمارے مایۂ ناز مشاہیر میں ہیں جن کی ادبی خدمات نے اپنے دور کے مذاق اور مزاج کو تبدیل کرنے میں ایک تاریخی خدمت انجام دی۔ ان کی شاعرانہ اور نثری خدمات کا اعتراف ہماری ادبی تاریخ کا ایک ناگزیر فریضہ ہے۔

○

ضمیمہ

(غیر مطبوعہ خطوط)

اسماعیل میرٹھی کی قواعد اردو کے سلسلہ میں ہمیں بعض غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی اپنے مکتوب مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۴ء میں فرماتے ہیں۔

"آپ کی قابلیت مسلّم، آپ کی محنت قابلِ داد ہے۔ مدّت سے میرا خیال تھا اور ہے کہ اردو کو قواعد فارسی و عربی کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ البتہ ان زبانوں کی بعض ترکیبیں حُسن یا اختصار کی غرض سے ہم کو لینی چاہییں۔ آپ نے جو اصطلاحیں مقرر کی ہیں سب اچھی ہیں۔"

ڈاکٹر اقبال نے اپنی رائے کا اظہار ۲۵ر جنوری ۱۹۱۵ء کے ایک مکتوب میں اس طرح کیا ہے۔

"قواعد اردو حصہ اوّل و دوئم نہایت عمدہ ہے۔ اردو زبان میں یہ کتاب اپنی طرز کی پہلی گرامر ہے اور مجھے یقین ہے کہ بچوں کے لیے اس سے بہتر کتاب شاید آج تک نہیں لکھی گئی۔"

خواجہ غلام الحسنین نے ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھا ہے۔

"میرے خیال میں جو جدید شاہراہ قواعد اردو کے لیے آپ نے تجویز فرمائی ہے۔ وہ ہر طرح سے درست اور بجا ہے۔"

سیّد کرامت حسین نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۱۵ء میں اپنے خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

"جناب والا نے مدّتوں کی غور اور تحقیق کے بعد اردو

کی قواعد مرتب فرمائی ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ جناب کی تصنیف اور تحقیق سے ملک بہرہ ور ہو۔ ،،

○

کتابیات

۱۔ آزاد	محمد حسین	نیرنگ خیال، لاہور، ۱۹۰۷ء
۲۔ آسی	عبدالباری	تذکرہ خندۂ گل، لکھنؤ۔
۳۔ برنی	الیاس	معارفِ ملّت، جذباتِ فطرت، مناظرِ قدرت علی گڑھ ۱۹۳۲ء
۴۔		بستان حکمت (انوار سہیلی) دہلی ۱۸۹۱ء
۵۔		ایضاً ایضاً لاہور ۱۹۳۶ء
۶۔ حالی	الطاف حسین	مسدّس حالی لکھنؤ، ۱۹۱۹ء
۷۔ حالی	الطاف حسین	مدّوجزرِ اسلام، ۱۳۰۳ ہجری ۱۸۸۶ء
۸۔ حالی	الطاف حسین	مقدمہ دیوان حالی دہلی ۱۸۹۳ء
۹۔ حالی	الطاف حسین	دیباچہ مجموعہ نظم حالی علی گڑھ ۱۹۱۸ء
۱۰ خان	یوسف حسین	اردو غزل، دہلی، ۱۹۵۲ء
۱۱۔ سبزواری	شوکت	غالب فکر و فن، کراچی ۱۹۶۱ء
۱۲۔ سکسینہ	رام بابو	تاریخ ادب اردو، لکھنؤ
۱۳۔ سید	اعجاز حسین	نئے ادبی رجحانات، الہ آباد، ۱۹۴۲ء
۱۴۔ سید	احتشام حسین	اردو کی کہانی، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء
۱۵۔ سیدؔ	علی احسن مارہروی	تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات) علی گڑھ، ۱۹۳۰ء
۱۶۔ سروری	عبدالقادر	جدید اردو شاعری، دہلی ۱۹۴۵ء
۱۷۔ شبلی	نعمانی	شعر العجم حصہ دوم
۱۸۔ صدیقی	محمد عتیق	گل کرسٹ اور اس کا عہد، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

۱۹۔	عبدالحق		مقدمۂ قواعد اردو، ۱۹۱۴ء
۲۰۔	علی	عبداللہ یوسف	انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، الہ آباد، ۱۹۳۶ء
۲۱۔	عبدالوحید		جدید شعراء اردو پاکستان۔ لاہور
۲۲۔	فانی گورگانی	میرزا نصیر الدین	ترجمہ تزک بابری اردو (بابرنامہ) دہلی ۱۹۲۴ء
۲۳۔	فرخی	اسلم	محمد حسین آزاد، حیات، تصانیف، کراچی ۱۹۶۵ء
۲۴۔	فرخی	اسلم	اردو کی پہلی کتاب ۱۹۶۳ء
۲۵۔	فاروقی	خواجہ احمد	ذوق و جستجو، لکھنؤ ۱۹۶۷ء
۲۶۔	قادری	حامد حسن	داستان تاریخ اردو، آگرہ
۲۷۔	قادری	حامد حسن	داستان تاریخ اردو، طبع ثانی آگرہ ۱۹۵۷ء
۲۸۔	قلق	غلام مولیٰ	جواہر منظوم، ۱۸۶۷ء
۲۹۔	مالک رام و مختار الدین آرزو		کربل کتھا، پٹنہ ۱۹۶۵ء
۳۰۔	مالک رام		تلامذۂ غالب، نکودر ۱۹۵۷ء
۳۱۔	مرزا	محمد سجاد بیگ	الفہرست، حیدرآباد
۳۲۔	نارنگ	گوپی چند	ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں، دہلی، ۱۹۶۲ء
۳۳۔			
۳۳	نظامی بدایونی	نظام الدین	کلیات شیفتہ و حسرتی ۱۹۱۶ء

رسائل

۱۔ اردو، دہلی	جنوری	۱۹۴۰ء
۲۔ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ	فروری	۱۹۱۱ء
۳۔ اردوئے معلیٰ دہلی	جلد ۵، نمبر ۹،	۱۹۲۷ء
۴۔ اردوئے معلیٰ، کانپور	جنوری فروری	۱۹۲۵ء
۵۔ اردوئے معلیٰ، کانپور	فروری مارچ	۱۹۳۰ء
۶۔ اردوئے معلیٰ (قدیم اردو نمبر) شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی		۱۹۶۸ء
۷۔ برہان، دہلی	فروری،	۱۹۴۰ء
۸۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد		۱۹۱۴ء
۹۔ معارف، علی گڑھ	اکتوبر	۱۸۹۹ء
۱۰۔ معارف، پانی پت	مئی	۱۹۰۱ء
۱۱۔ مخزن، لاہور	جنوری	۱۹۱۲ء
۱۲۔ مخزن، لاہور	مئی اور ستمبر	۱۹۱۰ء
۱۳۔ نگار، لکھنؤ	ستمبر	۱۹۳۹ء
۱۴۔ نگار، لکھنؤ		۱۹۴۶ء
۱۵۔ نگار، کراچی	اپریل،	۱۹۶۲ء

اخبارات

۱۔ اودھ پنچ، لکھنؤ ۶ر فروری ۱۹۱۱ء

۲۔ تہذیب الاخلاق جلد نمبر ۳، نمبر ۱، ۱۲۸۹ ہجری

۳۔ ذوالقرنین بدایوں ۱۴ر فروری، ۱۹۱۱ء

۴۔ روہیل کھنڈ بریلی ۵ر ستمبر، ۱۹۶۶ء

۵۔ علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۲۲ر نومبر ۱۸۷۷ء

۶۔ علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۷ء

۷۔ علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۱۵ر اپریل و ۲۰ر اپریل ۱۸۷۷ء

۸۔ علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۲۱ر جون ۱۹۱۱ء

۹۔ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ تحریک نمبر) ۵۴، ۱۹۵۳ء

BIBLIOGRAPHY

1. Dr. Tara Chand: History of the Freedom Movement In India, Vol.2, 1967.
2. Francis Palgrave: The Golden Treasury, London, 1926.
3. K Marx and F. Angels: The First Indian War of Independence, 1857-1869.
4. Mohd. Nauman Muslim India.
5. S. Abdul Latif: The Influence of English Literature on Urdu Literature, 1924.
6. Travelyan, C.A.: On the Education of the People of India, London, 1838.